(انڈیا ونس فریڈم کا اُردو ترجمہ)

مکمل متن — ۳۰ برس بعد کی اشاعت

آزادیٔ ہند

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

www.KitaboSunnat.com



بسم اللہ الرحمن الرحیم

❀❀❀ توجہ فرمائیں! ❀❀❀

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب............

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اَپ لوڈ (UPLOAD) کی جاتی ہیں۔
- متعلقہ ناشرین کی اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

❀❀❀ تنبیہ ❀❀❀

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں



آزادیٔ ہند

(انڈیا ونس فریڈم کا اردو ترجمہ)

مکمل متن — ۳۰ برس بعد کی اشاعت

مولانا ابو الکلام آزاد

مرتبہ

ہمایوں کبیرؒ

مکتبۂ جمال
تیسری منزل
حسن مارکیٹ، اُردو بازار
لاہور
E-mail:makaba_jamal@email.com Ph: 7232731

آ-۱ز

نام کتاب : آزادیِ ہند

مصنف : مولانا ابوالکلام آزاد

تعداد : ۵۰۰

ناشر : مکتبہ جمال، لاہور

مطبع : گنج شکر پرنٹرز

سن اشاعت : ۲۰۰۳ء

قیمت : ۲۰۰/- روپے

www.KitaboSunnat.com

ملنے کا پتہ:

مکتبہ جمال

تھرڈ فلور، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون ۷۲۳۲۷۳۱

Email: maktabajamal@yahoo.com

maktaba_jamal@email.com

www.KitaboSunnat.com

دوست اور ساتھی

جواہر لال نہرو

کے لیے

فہرست مضامین

دیباچہ

اشاعت ۱۹۵۹ء

جب آج سے کچھ اوپر دو سال پہلے، مَیں مولانا کی خدمت میں یہ درخواست لے کر گیا کہ انھیں اپنی آپ بیتی لکھنی چاہیے، تو میں نے ایک لمحے کے لیے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کتاب کا دیباچہ لکھنے کی غم آمیز ذمّے داری مجھے ہی انجام دینی ہوگی۔ مولانا اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں باتیں کرنا پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ ابتدائً اس کام کو ہاتھ میں لینے سے وہ جھجکے تھے۔ بڑی مشکل سے انھیں یہ ماننے پر آمادہ کیا گیا کہ انگریزوں سے ہندستانیوں کو اقتدار کی منتقلی کے عمل میں بہ حیثیت ایک اہم کردار کے، اُن پر یہ ذمّے داری عاید ہوتی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے وہ اس یادگار زمانے کے بارے میں اپنے تاثرات محفوظ کردیں۔ ان کی جھجک کا کچھ سبب ان کی خرابیٔ صحت بھی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ناگزیر سیاسی اور انتظامی امور کا جو بوجھ اُن پر ہے، اس سے نمٹنے کے لیے انھیں اپنی ساری توانائیوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔ بالآخر، میری اس یقین دہانی پر کہ لکھنے کے اصل بار سے حتی الوسع مَیں انھیں بچائے رکھوں گا، وہ راضی ہوگئے۔ اس میں یہ قباحت تو بیشک ہے کہ ہندستانی عوام اُن کے اپنے لفظوں میں اُن کی سوانح عمری پڑھنے سے محروم رہیں گے۔ اور اس طرح ہندستانی ادبیات میں بالعموم اور اردو میں بالخصوص ایک کمی رہ جائے گی، لیکن کچھ نہ ہونے سے یہ بہتر ہوگا کہ اُن کی ہدایت میں ایک انگریزی کی کتاب تیار ہوجائے۔

مَیں قدرے تفصیل کے ساتھ یہ بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ موجودہ کتاب کس طرح

ترتیب دی گئی۔ پچھلے لگ بھگ دو برسوں میں، سوائے اُن مواقع کے جب مجھے دہلی سے باہر جانا پڑا، میں نے ہر شام کا اوسطاً ایک گھنٹہ مولانا آزاد کے ساتھ گزارا۔ وہ ایک حیرت انگیز باتیں کرنے والے شخص تھے لفظوں میں اپنے تجربات کی تصویر اتار دیتے تھے۔ میں خاصے تفصیلی نوٹ لیتا جاتا تھا اور کسی نکتے کی وضاحت یا کسی سلسلے میں مزید معلومات کی خاطر اُن سے سوالات بھی کرتا جاتا تھا۔ وہ ذاتی معاملات پر گفتگو سے تو مستقلاً انکار کرتے رہتے، لیکن ایسے تمام سوالات پر جن کا تعلق عام مسئلوں سے ہو وہ انتہائی بے باکی اور خلوص کے ساتھ بات کرتے تھے۔ جب ایک باب کے لیے میں کافی مواد جمع کر لیتا تو انگریزی میں ایک ڈرافٹ تیار کر کے جلد سے جلد اُن کے حوالے کر دیتا تھا۔ ہر باب پہلے وہ خود پڑھتے تھے، پھر ہم دونوں مل کر اُسے دیکھتے تھے۔ اس منزل پر وہ اضافے اور تحریف یا ردّ و بدل کے ذریعے بہت سی ترمیمیں کرتے تھے۔ ہم نے اس سلسلے کو اسی طرح جاری رکھا، یہاں تک کہ ستمبر، ۱۹۵۶ء میں، میں نے مکمل کتاب کا پہلا ڈرافٹ انھیں دے دیا۔

جب کتاب کا پورا متن مولانا کے ہاتھ میں آگیا تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ لگ بھگ تیس صفحے، جن کا تعلق خاص طور پر ذاتی نوعیت کے واقعات اور تاثرات سے ہے، فی الحال شایع نہیں کیے جانے چاہئیں۔ انھوں نے ہدایت دی کہ مکمل متن کی ایک مہر بند نقل نیشنل لائبریری، کلکتہ میں اور ایک نیشنل آرکائیوز، دہلی میں جمع کرا دی جائے۔ یہ فکر انھیں بہر حال تھی کہ ان صفحات کی علاحدگی سے نہ تو واقعات کا خاکہ بگڑنے پائے نہ اُن کے عام نتائج میں فرق آئے۔ ان کی ہدایات کے مطابق میں نے تبدیلیاں کیں اور نومبر، ۱۹۵۶ء کے اواخر میں، نظر ثانی اور کاٹ چھانٹ کے بعد تیار ہونے والا مسودہ، مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا۔

انھوں نے ایک بار پھر، اُس زمانے میں جب میں آسٹریلیا گیا ہوا تھا، مسودے کا جائزہ لیا۔ میری واپسی پر، یکے بعد دیگرے تمام ابواب ہی نہیں، ایک ایک جملے پر ہم دونوں نے پھر سے نظر ڈالی۔ انھوں نے کچھ معمولی ترمیمیں کیں، کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس طرح بعض معاملات سے متعلق ابواب تین یا چار بار دیکھے گئے۔ اگلے برس یوم جمہوریہ کے موقع پر، مولانا آزاد نے فرمایا کہ اب وہ مسودے کی طرف سے مطمئن ہیں اور اسے طابعین کو بھیجا جا سکتا ہے۔ سو یہ کتاب جس شکل میں سامنے آئی ہے، اُن کی حتمی منظوری کے مطابق مسودے پر مشتمل ہے۔

مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ یہ کتاب نومبر ۱۹۵۸ء میں شایع ہو جب ان کی سترویں سال گرہ پڑنے والی تھی۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور اب یہ کتاب سامنے آئے گی تو اسے دیکھنے کے لیے مولانا ہم میں موجود نہ ہوں گے۔

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں، شروع شروع میں مولانا آزاد اس کتاب کی تیاری کا کام ہاتھ میں لینے پر کچھ زیادہ آمادہ نہیں تھے۔ جیسے جیسے کتاب بڑھتی گئی، مولانا کی دل چسپی میں اضافہ ہوتا گیا۔ پچھلے تقریباً چھ مہینوں میں بہت کم ایسا ہوا کہ مولانا نے اس مسودے کی تیاری کے کام میں کسی شام ناغہ کیا ہو ——— اپنی نجی زندگی کے بارے میں وہ انتہائی کم گو تھے، لیکن آخیر میں انھوں نے خود ہی یہ پیشکش کی کہ (سوانح کی) پہلی جلد وہ لکھ دیں گے، جو اُن کی زندگی کے ابتدائی ادوار کا احاطہ کرے گی اور ان کے ۱۹۳۷ء تک کے حالات پر مشتمل ہوگی۔ انھوں نے واقعتاً ایک خاکہ منظور بھی فرمایا، جو اُن کی اپنی خواہش کے مطابق، موجودہ کتاب کے پہلے باب کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ ارادہ بھی کیا تھا کہ ۱۹۴۸ء تک کے واقعات سے متعلق ایک تیسری جلد بھی وہ لکھیں گے۔ ہم سب کی بدبختی ہے کہ یہ جلدیں اب کبھی نہ لکھی جا سکیں گی۔

اس کتاب کے سلسلے میں کام کرنا میرے لیے ایک کاروبارِ شوق رہا ہے اور میں خوش ہوں گا اگر اس (کام) کے واسطے سے اس مقصد کی ترویج میں، جو مولانا آزاد کو دل سے عزیز تھا، مدد مل سکے۔ یہ مقصد عبارت ہے ہندستان کے مختلف فرقوں میں بہتر ہم آہنگی کے فروغ سے جسے دُنیا بھر کے انسانوں میں بہتر ہم آہنگی کی جانب ایک اوّلین اقدام کہنا چاہیے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندستان اور پاکستان کے عوام ایک دوسرے کو ہمسایوں اور دوستوں کی طرح دیکھیں۔ انڈین کونسل فور کلچرل ریلیشنز کو وہ اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور کونسل کے خطبۂ صدارت میں، جو ان کی آخری تیار کی ہوئی اور چھپی ہوئی تقریر تھی، انھوں نے ان دونوں ریاستوں کے افراد میں جو صرف دس برس پہلے تک ایک غیر منقسم ملک کے باشندے تھے، مفاہمت اور ہمدردی کے رشتوں کو مستحکم کرنے کے لیے ایک پُرزور اپیل کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب سے حاصل ہونے والی آمدنی کا، اس سے بہتر اور کوئی استعمال نہیں ہو سکتا کہ

ایسے ہندستان اور پاکستان میں بسنے والے مختلف فرقوں کے درمیان بہتر ہم آہنگی کے فروغ کی خاطر، کونسل کو دے دیا جائے۔ اس لیے ایک حصے کو چھوڑ کر جو مولانا کے سب سے قریبی ورثا کو دیا جائے، اس کتاب کی بقیہ رائلٹی کونسل کو جائے گی جو (اس رقم سے) ہر سال دو انعامات دے سکے، ایک ایسے غیر مسلم کو اسلام پر اور دوسرا ایک ایسے مسلمان کو، جو ہندو مت پر بہترین مضمون لکھ سکے اور یہ دونوں چاہے ہندستان کے شہری ہوں یا پاکستان کے ـــ نوجوانوں کے لیے مولانا کے دل میں جو قدر اور محبت تھی، اس کے پیشِ نظر، یہ مقابلہ ہر سال کی ۲۲ فروری تک تیس برس یا اس سے کم عمر کے اشخاص تک ہی محدود رہے گا۔

اختتام سے پہلے ایک اور بات میں پوری طرح صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ اس کتاب میں ایسی رائیں اور فیصلے بھی ہیں جن سے میں اتفاق نہیں کرتا، لیکن چونکہ میرا کام مولانا کے نتائج کو قلم بند کرنا تھا، اس لیے یہ بہت نامناسب بات ہوتی اگر اس بیانیے پر میں اپنے خیالات کا رنگ چڑھ جانے دیتا۔ جب وہ زندہ تھے، کئی بار میں نے ان سے اپنے اختلافات کا اظہار کیا، اور اس کشادہ طبعی کے ساتھ جو مولانا کے مزاج کا ایک مضبوط عنصر تھی، کبھی کبھار میری تنقید کی روشنی میں انھوں نے اپنے خیالات میں ترمیم بھی کی ہے۔ دوسرے موقعوں پر، اپنے مخصوص انداز میں وہ مسکراتے اور کہتے: 'یہ میرے خیالات ہیں اور یقیناً مجھے اس کا حق ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق انھیں ظاہر کروں'۔ اب جبکہ وہ نہیں ہیں تو اُن کے خیالات کو اسی شکل میں آنا چاہیے جس شکل میں مولانا نے انھیں چھوڑا تھا۔

کسی بھی شخص کے لیے دوسرے کی رایوں اور خیالوں کو تمام تر صحت کے ساتھ پیش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دونوں ایک ہی زبان کا استعمال کریں، جب بھی، ایک نقطے کی تبدیلی سے معنی کا دباؤ کم ہو سکتا ہے اور مفہوم کے رنگ میں خفیف سا فرق لایا جا سکتا ہے۔ اردو اور انگریزی کی روح میں جو فرق ہے وہ مولانا آزاد کے خیالات کی تعبیر کے مرحلے کو دشوار تر بناتا ہے۔ ہندستان کی دوسری تمام زبانوں کی طرح، اردو زبان بھی مایہ دار ہے، رنگا رنگ ہے اور طاقت ور ہے۔ اس کے برعکس، انگریزی بنیادی طور پر ایک ایسی زبان ہے جس میں بیان کی لے دھیمی رہتی ہے۔ اور جب بات کہنے والا مولانا آزاد جیسا اردو کا ماہر ہو، تو اس

شخص کی حالت کا قیاس آسانی سے کیا جا سکتا ہے، جو مولانا کے خیالات کو انگریزی میں بیان کرنے کا جویا ہو۔ ان دقتوں کے باوجود، میں نے مولانا آزاد کے خیالات کو اپنے بس بھر، دیانت داری کے ساتھ منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ واقعہ میرے لیے بہت بڑا انعام ہے کہ اس متن کو مولانا نے پسند فرمایا تھا۔

ــــــ ھمایوں کبیر

نئی دہلی
۱۵ رمارچ ۱۹۵۸ء

کیفیتِ نُما

میرے آباواجداد بابر کے زمانے میں ہرات سے ہندستان آئے۔ پہلے وہ آگرے میں قیام پذیر ہوئے، اس کے بعد دہلی منتقل ہو گئے۔ یہ ایک علمی خاندان تھا، اکبر کے زمانے میں مولانا جمال الدین نے ایک عالمِ دین کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اُن کے بعد، یہ گھرانہ دنیوی معاملات کی طرف زیادہ مائل ہو گیا اور اس کے کئی افراد نے اہم انتظامی عہدے حاصل کیے۔ عہدِ شاہ جہانی میں محمّد ہادی قلعۂ آگرہ کے گورنر مقرر کیے گئے۔

میرے والد کے نانا مولانا منورالدین تھے۔ وہ مغلیہ دَور کے رکُن المدرسین کا خطاب پانے والے آخری لوگوں میں سے تھے۔ یہ منصب شاہ جہاں کے زمانے میں وضع کیا گیا تھا اور اس کا مقصد علم وفضل کی ترقی کے لیے ریاستی سرگرمیوں کی نگرانی کرنا تھا۔ رکن المدرسین پر یہ ذمّے داری عاید ہوتی تھی کہ وہ علما اور اساتذہ کو وظائف، آراضی اور مراعات دیے جانے کا انتظام کرے۔ اس عہدے کا موازنہ آج کے زمانے میں ڈائرکٹر تعلیمات کے عہدے سے کیا جاسکتا ہے —— اس وقت تک مغلیہ اقتدار کمزور پڑچکا تھا، لیکن اہم عہدے ابھی برقرار تھے۔

میرے دادا کا انتقال جب ہوا تو میرے والد مولانا خیرالدین بہت کم عمر تھے۔ اسی

لیے میرے والد کی پرورش ان کے نانا نے کی۔ غدر سے دو برس پہلے، ہندستان کی صورتحال سے دل برداشتہ ہو کر مولانا منورالدین نے مکہ معظمہ کو ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بھوپال پہنچے تو نواب سکندر جہاں بیگم نے انھیں روک لیا۔ وہ ابھی بھوپال ہی میں تھے کہ غدر کا ہنگامہ شروع ہو گیا، پھر وہ دو برس تک وہاں سے نکل نہیں سکے۔ اس کے بعد وہ بمبئی گئے لیکن مکہ معظمہ نہیں پہنچ سکے کیونکہ بمبئی ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

اس وقت میرے والد کی عمر تقریباً پچیس برس کی تھی۔ وہ مکہ معظمہ گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اپنے لیے انھوں نے ایک مکان بنوایا اور شیخ محمد ظاہر وتری کی بیٹی سے شادی کر لی۔ شیخ محمد ظاہر مدینہ منورہ کے ایک عظیم عالم تھے جن کی شہرت عرب کے باہر تک جا چکی تھی۔ میرے والد کی ایک عربی کتاب دس جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی تو وہ بھی پورے عالمِ اسلام میں معروف ہو گئے۔ وہ کئی بار بمبئی آئے، ایک بار کلکتہ۔ دونوں جگہوں پر بہت سے لوگ ان کے مداح اور مُرید بن گئے —— انھوں نے عراق، شام اور ترکی میں بھی دُور دور تک سفر کیے تھے۔

مکہ معظمہ میں لوگوں کے لیے نہر زبیدہ پانی کا خاص ذریعہ تھی۔ اس کی تعمیر خلیفہ ہارون الرشید کی اہلیہ، بیگم زبیدہ نے کروائی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نہر کی حالت خراب ہو چلی تھی اور شہر میں پانی کی بہت قلت تھی۔ حج کے زمانے میں یہ قلت سب سے زیادہ شدت اختیار کر لیتی تھی اور حاجیوں کو سخت تکلیف اُٹھانی پڑتی تھی۔ میرے والد نے اس نہر کی مرمت کروائی —— ہندستان، مصر، شام اور ترکی میں انھوں نے بیس لاکھ کا چندہ جمع کیا اور نہر کی حالت اتنی بہتر کروا دی کہ بدو اسے دوبارہ خراب نہ کر سکیں۔ اس وقت سلطان عبدالمجید ترکی کے حکمراں تھے۔ میرے والد کی خدمات کے اعتراف میں سلطان نے انھیں درجۂ اوّل کا مجیدی تمغہ عطا فرمایا۔

مَیں ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں، میرے والد پورے کنبے کے ساتھ کلکتے آئے۔ کچھ عرصہ پہلے جدّہ میں وہ گر پڑے تھے اور ان کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اُسے بٹھا تو دیا گیا تھا، مگر اچھی طرح نہیں اور انھیں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اسے کلکتے کے سرجن

ٹھیک کر سکتے ہیں۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ صرف مختصر مدت تک یہاں قیام کریں گے، لیکن ان کے مداح اور مرید انھیں جانے ہی نہیں دیتے تھے۔ ہمارے کلکتہ آنے کے ایک سال بعد میری والدہ انتقال فرما گئیں اور وہیں دفن کی گئیں۔

میرے والد ایک ایسے شخص تھے جس کا ایقان زندگی کے قدیمی آداب میں تھا۔ انھیں مغربی تعلیم پر بالکل اعتماد نہیں تھا اور انھوں نے کبھی بھی مجھے جدید قسم کی تعلیم دینے کا ارادہ نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ جدید تعلیم مذہبی عقیدے کو تہس نہس کر دے گی چنانچہ انھوں نے پرانی وضع کے مطابق میری تعلیم کا بندوبست کیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا پرانا نظام یہ تھا کہ پہلے انھیں فارسی پڑھائی جاتی تھی، پھر عربی۔ زبان میں کچھ درک حاصل کر لینے کے بعد انھیں فلسفے، اقلیدس، ریاضی اور الجبرا کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اسلامی دینیات کا ایک نصاب بھی اس تعلیم کا لازمی حصہ ہوتا تھا۔ میرے والد چونکہ مجھے مدرسے میں نہیں بھیجنا چاہتے تھے، اس لیے گھر پر ہی انھوں نے میری پڑھائی کا انتظام کیا۔ ہر چند کہ وہاں کلکتہ میں مدرسہ بھی تھا، لیکن اس کے بارے میں میرے والد کی رائے بہت اچھی نہیں تھی۔ پہلے تو انھوں نے خود ہی مجھے پڑھایا۔ اس کے بعد مختلف مضامین کے لیے مختلف اساتذہ مقرر کر دیے وہ یہ چاہتے تھے کہ ہر میدان کے سب سے معروف عالم مجھے تعلیم دیں۔

ایسے طلبا جو تعلیم کے قدیمی نظام کی پیروی کرتے تھے، بیس اور پچیس برس کی عمر کے درمیان اپنے نصابات ختم کر لیتے تھے۔ اس میں وہ مدت بھی شامل تھی جب نوجوان عالم سے مبتدیوں کو پڑھوایا بھی جاتا تھا تاکہ وہ ثابت کر سکے کہ جو کچھ اسے سکھایا گیا تھا، اس پر اس نے مہارت حاصل کر لی ہے۔ میں نے سولہ برس کی عمر میں اپنا نصاب مکمل کر لیا اور میرے والد نے تقریباً پندرہ طالب علم یکجا کیے جنھیں میں نے اعلاتر سطح کے فلسفے، ریاضی اور منطق کی تعلیم دی۔

اس کے فوراً بعد ہی مجھے پہلے پہل سر سید احمد خاں کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جدید تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات سے میں بہت متاثر ہوا۔ یہ حقیقت مجھ پر روشن

ہوگئی کہ جدید دنیا میں، سائنس، فلسفہ اور ادب پڑھے بغیر، کوئی شخص صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے طے کیا کہ انگریزی ضرور سیکھوں گا۔ میں نے مولوی محمد یوسف جعفری سے گفتگو کی جو اس وقت مشرقی نصابِ تعلیم کے صدر ممتحن تھے۔ انھوں نے مجھے انگریزی حروف تہجی سکھائے اور پیارے چرن سرکار کی FIRST BOOK (پہلی کتاب) مجھے دی۔ جیسے ہی مجھے اس زبان میں کچھ شد بد حاصل ہوئی میں نے انجیل پڑھنا شروع کیا۔ میں نے اس کتاب کے انگریزی، فارسی اور اردو نسخے جمع کیے اور انھیں ساتھ ساتھ پڑھتا رہا۔ اس سے مجھے متن کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ ایک لغت کی مدد سے میں انگریزی اخبارات بھی پڑھنے لگا۔ اس طرح، جلد ہی میں نے اتنا کچھ سیکھ لیا کہ انگریزی کتابیں پڑھ سکوں اور پھر خود کو، بالخصوص تاریخ اور فلسفے کے مطالعے کے لیے وقف کر دیا۔

میرے لیے یہ شدید ذہنی بحران کا دور تھا۔ میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا تھا، جس پر مذہبی روایتوں کا رنگ بہت گہرا تھا۔ روایتی زندگی کے آداب بے چون و چرا تسلیم کیے جاتے تھے اور راسخ طریقوں سے ذرا سا انحراف بھی اس خاندان کو گوارا نہیں تھا۔ میں اپنے آپ کو مروّجہ رسوم اور ایقانات سے ہم آہنگ نہیں کر سکا اور میرا دل بغاوت کے ایک نئے احساس سے بھر گیا۔ وہ خیالات جو میں نے اپنے خاندان اور اپنی ابتدائی تربیت کے توسط سے حاصل کیے تھے، اب مجھے مطمئن رکھنے سے قاصر تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ سچائی کی دریافت مجھے اپنے آپ ہی کرنی ہوگی۔ تقریباً جبلّی طور پر، میں نے اپنے خاندان کے دائرے سے باہر نکلنا اور اپنی راہ آپ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

پہلی بات جس نے مجھے پریشان کیا، مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں اختلافات کا مظاہرہ تھا۔ میں سمجھ نہیں پاتا تھا کہ یہ ایک دوسرے کے اتنے خلاف کیوں ہیں جب کہ سبھی یہ دعوا کرتے ہیں کہ ان کے فیضان کا سرچشمہ ایک ہے۔ نہ ہی میں اپنے آپ کو اس ادعائی تیقن سے ہم آہنگ کر سکتا تھا جس کے ساتھ ہر فرقہ دوسرے کو گمراہ اور بدعتی قرار دیتا تھا۔ راسخ العقیدہ مکاتب کے ان اختلافات نے مذہب کے بارے میں ہی میرے ذہن کو شک کی راہ دکھائی۔ اگر مذہب آفاقی صداقت کا اظہار کرتا ہے تو پھر الگ الگ

مذہب کے ماننے والوں میں ایسا اختلاف اور تصادم کیوں ہے؟ ہر مذہب کیونکر اس بات کا دعوے دار ہو سکتا ہے کہ صرف وہی صداقت کا مخزن ہے اور باقی تمام مذاہب جھوٹے ہیں؟

دو تین برس تک یہ اضطراب جاری رہا اور میں اپنے شکوک کا کوئی حل پانے کی آرزو میں مبتلا رہا۔ ایک مرحلے سے گزر کر میں دوسرے مرحلے تک گیا اور پھر وہ منزل بھی آ گئی جب میرے ذہن پر خاندان اور تربیت کی عاید کی ہوئی تمام بندشیں پارہ پارہ ہو گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے تمام رسمی بندشوں سے چھٹکارا مل چکا ہے اور میں نے یہ طے کر لیا کہ اپنا راستہ میں آپ بناؤں گا۔ اسی دور کے آس پاس میں نے آزاد کا قلمی نام اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ مجھ پر اب موروثی اعتقادات کی کوئی گرفت نہیں ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ان تبدیلیوں کا تذکرہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنی آپ بیتی کی پہلی جلد میں کروں گا۔

یہی دور تھا جب میرے سیاسی خیالات میں بھی تبدیلی شروع ہوئی۔ لارڈ کرزن اس وقت ہندستان کے وائسرائے تھے۔ ان کے آمرانہ رویّے اور انتظامی اقدامات نے ہندستان کے سیاسی اضطراب کو نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اس اتھل پتھل کا سراغ سب سے زیادہ بنگال میں ملتا تھا کیونکہ لارڈ کرزن اس صوبے کی طرف خصوصی توجہ کرتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے یہ ہندستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقہ تھا، اور بنگال کے ہندوؤں نے ہندستان کی سیاسی بیداری میں نمایاں ترین حصّہ لیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے اس صوبے کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا، یہ سوچ کر کہ اس طرح ہندو کمزور پڑ جائیں گے اور بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ایک مستقل بٹوارہ قائم ہو جائے گا۔

بنگال نے اس اقدام کو چپ چاپ تسلیم نہیں کیا۔ سیاسی اور انقلابی جوش و خروش کا ایک طوفان پھٹ پڑا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سری اربندو گھوش بڑودہ چھوڑ کر کلکتے آ گئے تاکہ اسے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا سکیں۔ ان کا اخبار کرم یوگن قومی بیداری اور احتجاج کی ایک علامت بن گیا۔

یہی زمانہ تھا جب شری شیام سندر چکرورتی سے میرا رابطہ قائم ہوا، جو اس دور کے اہم انقلابی کارکنوں میں سے تھے۔ ان کے توسط سے میں دوسرے انقلابیوں سے بھی ملا۔ مجھے

یاد ہے کہ دو یا تین موقعوں پر سری اربندو گھوش سے بھی ملاقات ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انقلابی سیاست کی طرف مَیں کھنچنے لگا اور انقلابیوں کے ایک گروپ میں شامل ہو گیا۔

اُن دنوں انقلابی گروپ صرف ہندوؤں کے متوسط طبقے سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ در اصل تمام انقلابی گروپ اس زمانے میں سرگرم طور پر مسلم مخالف تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ برطانوی حکومت مسلمانوں کو ہندستان کی سیاسی جدوجہد کے خلاف استعمال کر رہی ہے اور مسلمان حکومت کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ مشرقی بنگال ایک علاحدہ صوبہ بن گیا تھا اور بیم فیلڈ فُلر، جو اس وقت لیفٹیننٹ گورنر تھا، کھل کر کہتا تھا کہ حکومت کی نظر میں مسلمانوں کی حیثیت چہیتی بیوی کی ہے۔ انقلابی یہ محسوس کرتے تھے کہ ہندستانی آزادی کے حصول میں مسلمان ایک رکاوٹ ہیں اور دوسری رکاوٹوں کی طرح، انھیں بھی راستے سے ہٹا دینا چاہیے۔

مسلمانوں کے لیے انقلابیوں کی ناپسندیدگی کا ایک اور سبب بھی تھا۔ حکومت سمجھتی تھی کہ بنگال کے ہندوؤں میں سیاسی بیداری اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ان انقلابی سرگرمیوں سے نمٹنے کے لیے کسی ہندو افسر پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ پولیس کی خفیہ شاخ میں صوبہ جات متحدہ سے متعدد مسلمان افسر بلا کر رکھے گئے۔ اس کے نتیجے میں بنگال کے ہندوؤں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ مسلمان سیاسی آزادی کے خلاف بھی ہیں اور ہندو فرقے کے بھی۔

جب شیام سندر چکرورتی نے دوسرے انقلابیوں سے میرا تعارف کروایا اور میرے نئے دوستوں نے یہ دیکھا کہ مَیں ان کے ساتھ شامل ہونے کا طلب گار ہوں تو وہ بہت حیران ہوئے۔ شروع شروع میں انھوں نے پوری طرح مجھ پر بھروسہ نہیں کیا اور کوشش کی مجھے اپنے اندرونی حلقے سے باہر رکھیں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مَیں نے اُن کا اعتماد حاصل کر لیا۔ مَیں (اس مسئلے پر) ان سے بحث کرنے لگا کہ مسلمانوں کو بہ طور ایک فرقے کے اپنا دشمن سمجھ لینا اُن کی غلطی ہے۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ بنگال میں اکّا دکّا مسلمان افسروں کی طرف سے اپنے تجربوں کی بنیاد پر انھیں عام رائے قائم کر لینی چاہیے۔ مصر، ایران اور ترکی میں جمہوریت اور آزادی کے حصول کی خاطر مسلمان انقلابی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ ہندستان کے مسلمان بھی، اگر ہم ان میں رہ کر کام کریں اور انھیں اپنا دوست بنا لیں، تو ہماری سیاسی جدوجہد

میں شریک ہو جائیں گے۔ میں نے یہ نشاندہی بھی کی کہ مسلمانوں کی سرگرم جارحیت، حتیٰ کہ ان کی لاتعلقی بھی، سیاسی آزادی کی جدّوجہد کو بہت دشوار بنا دے گی۔ اس لیے ہمیں اس فرقے کی دوستی اور حمایت حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

پہلے پہل تو میں اپنے انقلابی دوستوں کو اپنی اس تشخیص کی صحت کا یقین نہیں دلا سکا۔ لیکن، رفتہ رفتہ، ان میں سے کچھ نے میرے نقطۂ نظر کو قبول کر لیا۔ اسی دوران میں، میں نے مسلمانوں کے درمیان اپنا کام بھی شروع کر دیا تھا اور میں نے دیکھا کہ نوجوانوں کا ایک گروپ نئے سیاسی مرحلوں کو ہاتھ میں لینے پر تیار ہے۔

جب میں انقلابیوں کے ساتھ شروع میں شامل ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ ان کی سیاسی سرگرمیاں بنگال اور بہار تک محدود ہیں۔ یہاں یہ واضح کر دوں کہ بہار اس وقت صوبۂ بنگال کا ایک حصہ تھا۔ میں نے اپنے دوستوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ ہمیں ہندستان کے دوسرے حصوں تک اپنی سرگرمیوں کو پھیلانا چاہیے۔ پہلے تو وہ بھی جھجکے اور یہ کہا کہ اُن کی سرگرمیوں کی نوعیت خفیہ ہے۔ اپنے رابطوں کو وسیع کرنے میں اندیشے ہیں اور اگر دوسرے صوبوں میں شاخیں قائم کی جائیں تو ہو سکتا ہے کہ اپنی سرگرمیوں کو راز میں رکھنا، جو کامیابی کے لیے ضروری ہے، مشکل ہو جائے۔ میں بہرحال، انھیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ان کے ساتھ شامل ہونے کے دو برس کے اندر ہی شمالی ہندستان اور بمبئی کے کئی اہم مقامات پر خفیہ انجمنیں قائم ہو گئیں۔ یہ تنظیمیں کس طرح ترتیب دی گئیں، اس کے بارے میں کئی دلچسپ اور پُر لطف کہانیاں میں سنا سکتا ہوں، لیکن اس کے لیے قارئین کو میری آپ بیتی کی پہلی جلد کے تیار ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا جس میں یہ روداد اور زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کی جائے گی۔

یہی زمانہ تھا جب مجھے ہندستان سے باہر جانے اور عراق، مصر، شام اور ترکی کا ایک دورہ کرنے کا موقعہ ملا۔ ان تمام ملکوں میں فرانسیسی زبان سے میں نے گہرا شغف دیکھا۔ میرے اندر بھی اس زبان کا ذوق پیدا ہوا اور میں نے اسے سیکھنا شروع کر دیا۔ لیکن اندازہ یہ ہوا کہ انگریزی بہت تیزی کے ساتھ وسیع ترین بین الاقوامی زبان بنتی جا رہی ہے اور میری بیشتر ضرورتوں کی کفالت کر سکتی ہے۔

اس موقعے پر میں ایک غلطی کو درست کرنا چاہوں گا جسے مہادیو ڈیسائی نے عام کیا تھا۔ انھوں نے جب میری سوانح عمری لکھی تو بہت سے سوال ترتیب دیے اور مجھ سے ان کے جواب کی فرمائش کی۔ ایک سوال کے جواب میں، میں نے کہا کہ جب میری عمر بیس برس کے قریب تھی میں نے مشرقِ وسطیٰ کا ایک دورہ کیا اور خاصا وقت مصر میں گزارا۔ ایک اور سوال کے جواب میں، میں نے یہ کہا تھا کہ روایتی تعلیم صرف ہندستان میں ہی غیر تسلی بخش اور غیر مؤثر نہیں تھی، قاہرہ کی مشہور جامعہ الازہر کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ مہادیو ڈیسائی نے (ان جوابات سے) کسی طرح یہ نتیجہ نکال لیا کہ میں مصر الازہر میں پڑھائی کی غرض سے گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں وہاں ایک روز کے لیے بھی طالب علم نہیں رہا۔ شاید یہ غلطی ان کے اس گمان سے پیدا ہوئی کہ اگر کسی شخص نے کچھ علم حاصل کیا ہے تو وہ لازماً کسی یونیورسٹی میں گیا ہوگا۔ مہادیو ڈیسائی کو جب یہ پتہ چلا کہ میں کسی ہندستانی یونیورسٹی کا طالب علم نہیں رہا تو انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ میں نے الازہر سے ضرور کوئی سند حاصل کی ہوگی۔

۱۹۰۸ء میں جب میں نے قاہرہ کا سفر کیا، اس وقت الازہر کا نظام اتنا ناقص تھا کہ اس سے نہ تو ذہن کو تربیت ملتی تھی نہ قدیم اسلامی علوم اور فلسفے کا کچھ زیادہ علم حاصل ہو سکتا تھا۔ شیخ محمد عبدہؒ نے اس نظام کو سدھارنے کی کوشش کی تھی، لیکن پرانے قدامت پسند علما نے ان کی تمام کوششیں ناکام کر دیں۔ جب الازہر کو بہتر بنانے کی اُن کی تمام اُمیدیں ختم ہو گئیں تو انھوں نے قاہرہ میں ایک نئے کالج، دارالعلوم کی شروعات کی جو اب تک قائم ہے۔ جب الازہر کی صورتِ حال یہ کچھ تھی، تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ تعلیم کے لیے میں وہاں جاتا۔

مصر سے میں ترکی اور فرانس گیا اور وہاں سے میرا ارادہ لندن جانے کا تھا۔ مجھ سے یہ ہو نہیں سکا کیونکہ مجھے یہ خبر موصول ہوئی کہ میرے والد بیمار ہیں۔ میں پیرس سے واپس آ گیا اور بعد کے بہت برسوں تک لندن نہیں دیکھ سکا۔

یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ۱۹۰۸ء میں کلکتہ چھوڑنے سے پہلے میرے سیاسی خیالات انقلابی سرگرمیوں کی جانب مائل ہو چکے تھے۔ جب میں عراق آیا تو کچھ ایرانی انقلابیوں سے ملاقات ہوئی۔ مصر میں میرا رابطہ مصطفےٰ کمال پاشا کے پیروؤں سے قائم ہوا۔ میں نوجوان ترکوں کے ایک گروپ سے بھی ملا جنھوں نے قاہرہ میں ایک مرکز کی داغ بیل ڈالی تھی اور وہاں سے ایک ہفتہ وار نکال رہے تھے۔

مَیں ترکی گیا تو نوجوان ترک تحریک (YOUNG TURK MOVEMENT) کے کچھ لیڈروں سے میری دوستی ہو گئی —— اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ میں نے ہندستان واپس آنے کے بعد کئی برسوں تک جاری رکھا۔

ان عرب اور ترک انقلابیوں سے رابطے نے میرے سیاسی ایقانات کو پختہ کر دیا۔ انھوں نے اس بات پر حیرت ظاہر کی کہ ہندستانی مسلمان یا تو لاتعلق ہیں یا پھر قومی مطالبات کے خلاف ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہندستانی مسلمانوں کو آزادی کی قومی جدوجہد کی قیادت کرنی چاہیے تھی، اور وہ یہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ہندستانی مسلمان بھلا انگریزوں کے پیرو محض بن کر کیوں رہ گئے ہیں۔ اس امر میں میرا یقین اب ہمیشہ سے زیادہ ہو گیا کہ ملک کی سیاسی آزادی کے کام میں ہندستانی مسلمانوں کو تعاون کرنا چاہیے۔ ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جن سے یہ بات یقینی ہو جائے کہ برطانوی حکومت اُن کا استحصال نہیں کر سکے گی۔ مَیں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ہندستانی مسلمانوں میں ایک نئی تحریک شروع کی جائے اور یہ فیصلہ کیا کہ ہندستان واپس آ کر، مَیں پہلے سے زیادہ انہماک کے ساتھ سیاسی کام ہاتھ میں لوں گا۔

واپسی پر، مَیں اپنے مستقبل کے لائحہ عمل پر غور کرتا رہا۔ مَیں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمیں رائے عامہ ہموار کرنی چاہیے اور اس کے لیے ایک جریدے کی ضرورت ہے۔ پنجاب اور یو، پی سے متعدد روزنامے، ہفتہ وار اور ماہنامے شایع ہوتے تھے، لیکن ان کا معیار بہت بلند نہیں تھا۔ ان کا گٹ اپ اور چھپائی اتنی ہی معمولی ہوتی تھی جتنا کہ اُن کا مواد —— چونکہ یہ لیتھو میں چھاپے جاتے تھے اس لیے جدید صحافت کا کوئی بھی وصف اپنے اندر پیدا کرنے سے قاصر تھے۔ نہ ہی ان میں ہاف ٹون تصویریں چھاپنے کی اہلیت تھی۔ مَیں نے طے کیا کہ میرا جرنل گٹ اپ کے لحاظ سے دیدہ زیب اور اپنی اپیل کے اعتبار سے طاقت ور ہو گا۔ اسے ٹائپ میں ترتیب دیا جائے اور پھر لیتھو گرافک عمل کے ذریعے چھاپا جائے۔ چنانچہ میں نے الہلال پریس قائم کیا اور جون ۱۹۱۲ء میں الہلال کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔

الہلال کی اشاعت اردو صحافت کی تاریخ میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے بہت کم مدت میں بے مثال مقبولیت حاصل کی۔ عوام اس کی طرف صرف بہتر

طبیعت اور گٹ اپ کی وجہ سے ہی مائل نہیں ہوئے، اس سے زیادہ پُرکشش، ان کے لیے مستحکم قومیت کا وہ نیا آہنگ تھا جس کی ترویج اخبار سے ہوتی تھی۔ 'الہلال' نے عوام میں ایک انقلابی ہلچل پیدا کر دی۔ پہلے تین مہینوں میں 'الہلال' کی مانگ ایسی زبردست تھی کہ تمام پرانے شمارے دوبارہ چھاپنے پڑے کیونکہ ہر نیا خریدار مکمل سٹ (SET) رکھنا چاہتا تھا۔

اس دور میں مسلم سیاست کی باگ ڈور علی گڑھ پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے اراکین خود کو سر سید احمد کی پالیسیوں کا امین سمجھتے تھے۔ ان کا بنیادی تصور یہ تھا کہ مسلمانوں کو تاج برطانیہ کا وفادار اور تحریک آزادی سے لاتعلق ہونا چاہیے۔ جب 'الہلال' نے ایک نیا نعرہ بلند کیا اور اس کی مقبولیت و اشاعت تیزی سے بڑھی تو ان لوگوں نے محسوس کیا کہ اُن کی لیڈری خطرے میں ہے۔ چنانچہ انھوں نے 'الہلال' کی مخالفت شروع کر دی اور اس حد تک گئے کہ ایڈیٹر کو جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی۔ پرانی لیڈر شپ جتنی مخالفت کرتی جاتی تھی، قوم میں 'الہلال' کی مقبولیت اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔ دو برس کے اندر 'الہلال' کی ہفتہ وار اشاعت ۲۶،۰۰۰ کاپیوں تک پہنچ گئی، ایک ایسی تعداد جو اُردو صحافت کی تاریخ میں اُس وقت تک سُنی بھی نہیں گئی تھی۔

'الہلال' کی اس کامیابی سے حکومت بھی پریشان ہو گئی۔ پریس ایکٹ کے تحت اُس نے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی اور سوچا کہ اس سے 'الہلال' کا لب ولہجہ دبایا جا سکے گا۔ اس طرح کی چھیڑ خانیوں سے مَیں نے اپنے حوصلے پست نہیں ہونے دیے۔ جلد ہی حکومت نے زرِ ضمانت ضبط کر لیا اور دس ہزار روپیوں کی ایک نئی ضمانت طلب کی۔ یہ اقدام بھی جلد ہی بے اثر ثابت ہوا ـــــ اسی دوران میں ۱۹۱۴ء کی جنگ بھڑک اٹھی تھی اور ۱۹۱۵ء میں 'الہلال' پریس ضبط کر لیا گیا۔ پانچ مہینے بعد مَیں نے 'البلاغ' کے نام سے ایک نیا پریس شروع کیا اور اسی نام کا اخبار نکالا۔ حکومت اب یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ صرف پریس ایکٹ کے ذریعے وہ میری سرگرمیوں کو نہیں روک سکتی۔ چنانچہ اب اس نے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز کا سہارا لیا اور اپریل ۱۹۱۶ء میں مجھے کلکتے سے شہر بدر کر دیا۔ پنجاب، دہلی، یو پی اور بمبئی

کی حکومتیں اسی ریگولیشن کے تحت اپنے صوبوں میں میرے داخلے پر پابندی لگا چکی تھیں۔ صرف ایک جگہ، جہاں میں جا سکتا تھا۔ بہار تھی۔ سو میں رانچی چلا گیا۔ مزید چھ مہینوں بعد مجھے رانچی میں نظربند کر دیا گیا اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء تک حراست میں رہا۔ پہلی جنوری ۱۹۲۰ء کو، مجھے بعض دوسرے نظربندوں اور قیدیوں کے ساتھ شاہ انگلستان کے اعلانیے کے تحت رہائی دے دی گئی۔

اُس وقت تک گاندھی جی کا ظہور ہندستان کے سیاسی منظرنامے پر ہو چکا تھا۔ میں جن دنوں رانچی میں نظربند تھا۔ چمپارن کے کسانوں میں اپنے کام کے سلسلے میں، گاندھی جی وہاں (رانچی) آئے۔ انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن بہار کی حکومت نے مطلوبہ اجازت نہیں دی۔ اس لیے جنوری ۱۹۲۰ء میں میری رہائی کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ میں نے دہلی میں ان سے پہلی بار ملاقات کی ------ ایک تجویز یہ تھی کہ وائسرائے تک ایک وفد بھیجا جائے تاکہ خلافت اور ترکی کے مستقبل کی بابت ہندستانی مسلمانوں کے جذبات سے انھیں روشناس کرایا جا سکے۔ گاندھی جی نے مذاکرات میں شرکت کی اور اس تجویز سے اپنی مکمل ہمدردی اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس مسئلے میں انھوں نے خود کو مسلمانوں سے مربوط رکھنے پر اپنی آمادگی کا اعلان کر دیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ایک میٹنگ ہوئی۔ گاندھی جی کے علاوہ، لوک مانیہ تلک اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے بھی خلافت کے سوال پر ہندستانی مسلمانوں کے موقف کی حمایت کی۔

وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ مَیں نے عرضداشت پر دستخط تو کیے تھے، لیکن مَیں وفد کے ساتھ نہیں گیا کیونکہ میرا خیال یہ تھا کہ اب معاملات عرض داشتوں اور وفود کی منزل سے آگے جا چکے ہیں۔ اپنے جواب میں، وائسرائے نے کہا کہ حکومت ضروری سہولتیں مہیا کر دے گی اگر ایک وفد لندن بھیجا جائے تاکہ برطانوی حکومت کے سامنے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا جا سکے انھوں نے اپنے طور پر کوئی بھی کارروائی انجام دینے سے معذرت کر لی۔

اب سوال یہ تھا کہ اگلا قدم کیا ہو۔ ایک میٹنگ کی گئی جس میں مسٹر محمد علی جناح، مسٹر شوکت علی، حکیم اجمل خاں اور فرنگی محل، لکھنؤ کے مولوی عبدالباری بھی موجود تھے۔ گاندھی جی

نے اپنا عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ وفود اور عرض داشتوں کے دن رخصت ہو چکے ہیں۔ ہمیں حکومت سے اپنا سارا تعاون واپس لے لینا چاہیے اور یہی واحد طریقہ ہے جو حکومت کو ہم سے معاملہ کرنے پر مجبور کر سکے گا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ تمام سرکاری خطابات لوٹا دیے جائیں۔ قانونی عدالتوں اور تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے، ہندستانی ملازمتوں سے مستعفی ہو جائیں اور نوساختہ مجالس قانون ساز میں کوئی بھی حصہ لینے سے انکار کر دیں۔

جیسے ہی گاندھی جی نے اپنی تجویز بیان کی، مجھے یاد آیا کہ یہی پروگرام تھا جس کا خاکہ ٹالسٹائے نے بہت سال پہلے مرتب کیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں ایک انارکسٹ نے اٹلی کے بادشاہ پر حملہ کیا تھا۔ ٹالسٹائے نے اس وقت انارکسٹوں کے نام ایک کھلا خط بھیجا تھا کہ تشدد کا طریقہ اخلاقی طور پر غلط اور سیاسی طور پر تقریباً بے سود ہے۔ اگر ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لے لے گا ـــــ دراصل تشدد ہمیشہ پہلے سے زیادہ تشدد کو راہ دیتا ہے۔ ایک یونانی حکایت کے مطابق قتل ہونے والے ہر سپاہی کے خون سے ۹۹۹ (نئے) سپاہی پیدا ہوتے ہیں۔ سیاسی قتل میں ملوث ہونا عفریت کے دانتوں کی فصل اگاتا ہے۔ ٹالسٹائے نے مشورہ دیا کہ کسی جابر حکومت کو بے بس کرنے کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ ٹیکس کی ادائگی سے انکار کر دیا جائے، تمام ملازمتوں سے استعفے دے دیے جائیں، اور ایسے ادارے جو حکومت کی حمایت کرتے ہیں، اُن کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس قسم کا پروگرام کسی بھی حکومت کو مفاہمت کا راستہ اپنانے پر مجبور کر دے گا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ خود میں نے الہلال کے بعض مضامین میں، اسی سے ملتے جلتے پروگرام کی تجویز رکھی تھی۔

دوسروں نے (اس تجویز پر) اپنے ردّعمل کا اظہار اپنے ذہنی پس منظر کے مطابق کیا۔ حکیم اجمل خاں نے کہا کہ وہ پروگرام پر غور کرنے کے لیے کچھ وقت چاہتے ہیں۔ اس وقت تک وہ دوسروں کو بھی کوئی مشورہ نہیں دیں گے، جب تک کہ خود اس پروگرام کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ مولوی عبدالباری نے فرمایا کہ گاندھی جی کی تجویزوں نے بنیادی سوال اٹھائے ہیں اور وہ ان کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تاوقتیکہ مراقبے کے دوران انھیں کوئی غیبی ہدایت نہ مل جائے ـــــ محمد علی اور شوکت علی نے کہا کہ وہ مولوی عبدالباری کا فیصلہ جاننے

تک انتظار کریں گے۔ ——— اس کے بعد گاندھی جی نے میری طرف رُخ کیا۔ میں نے ایک لمحے کی جھجک کے بغیر کہا کہ یہ پروگرام مجھے منظور ہے۔ اگر لوگ سچ مچ ترکی کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو گاندھی جی کے مرتب کیے ہوئے پروگرام کا کوئی بدل نہیں ہے۔

چند ہفتوں کے بعد، میرٹھ میں ایک خلافت کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ یہی کانفرنس تھی جس میں ایک پبلک پلیٹ فارم سے، گاندھی جی نے پہلی بار عدم تعاون کے پروگرام کی تلقین کی۔ وہ بول چکے تو میں نے تقریر کی اور اُن کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کیا۔

ستمبر ۱۹۲۰ء میں، گاندھی جی کے تیار کردہ لائحۂ عمل پر غور کرنے کے لیے کلکتے میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس ہوا۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ اگر ہم سوراج پانا چاہتے ہیں اور اطمینان بخش طریقے سے خلافت کا مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں تو عدم تعاون کا پروگرام ضروری ہوگا۔ لالہ لاجپت رائے اس اجلاس کے صدر تھے اور مسٹر سی، آر، داس اس کی ممتاز شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی گاندھی جی سے اتفاق نہیں کیا ——— بپن چندر پال نے بھی بہت پُرجوش تقریر کی اور کہا کہ برطانوی حکومت سے لڑائی کا بہترین ہتھیار یہ ہے کہ برطانوی اشیا کا بائیکاٹ کیا جائے۔ گاندھی جی کے پروگرام کی دوسری شقوں پر انھیں زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ ان کی مخالفت کے باوجود، عدم تعاون تحریک کی قرارداد بھاری اکثریت کے ساتھ منظور کرلی گئی۔

اس کے بعد ملک کو عدم تعاون کے پروگرام کے لیے تیار کرنے کی غرض سے تفصیلی دورے کیے گئے۔ گاندھی جی نے لمبے لمبے سفر کیے۔ میں بیشتر اوقات میں ان کے ساتھ رہا اور محمد علی اور شوکت علی بھی کئی بار ہمارے ہم سفر رہے ---- دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں ہوا۔ اس وقت تک، ملک کا مزاج بدل چکا تھا۔ مسٹر سی، آر، داس اب کھلے بندوں عدم تعاون کے پروگرام کی حمایت کرتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے ابتدا میں تو کچھ خلاف رہے، مگر جب انھوں نے یہ دیکھا کہ پنجاب کے تمام مندوبین گاندھی جی کے حق میں ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگئے۔ یہی وہ اجلاس تھا جس کے دوران مسٹر جناح نے بالآخر کانگریس سے علاحدگی اختیار کرلی۔

حکومت نے ملک بھر میں لیڈروں کو گرفتار کر کے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا ——— بنگال میں سب سے پہلے گرفتار ہونے والوں میں سی، آر، داس تھے۔ سبھاش چندر بوس اور بیریندر ناتھ سسمال بھی ہم سے جیل میں آملے۔ ہم سب علی پور سنٹرل جیل کے یوروپین وارڈ میں رکھے گئے تھے۔ جو سیاسی بحثوں کا مرکز بن گیا تھا۔

مسٹر سی، آر، داس کو چھ مہینے کی سزا ملی تھی۔ مجھ پر بہت عرصے تک مقدمہ چلتا رہا اور آخر کار مجھے ایک برس کی سزا دی گئی ——— واقعہ یہ ہے کہ مجھے پہلی جنوری ۱۹۲۳ء تک رہا نہیں کیا گیا۔ مسٹر سی، آر، داس کو پہلے ہی چھوڑ دیا گیا تھا اور انھوں نے کانگریس کے گیا سیشن کی صدارت کی تھی۔ اس سیشن کے دوران کانگریس لیڈروں میں شدید اختلاف رائے کا اظہار ہوا۔ مسٹر سی، آر، داس نے موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں نے سوراج پارٹی کی تشکیل کی اور کونسل میں داخلے کا پروگرام پیش کیا جس کی مخالفت گاندھی جی کے کٹر معتقدوں کی طرف سے ہوئی۔ اس طرح کانگریس دو حصّوں میں بٹ گئی، ایک حصّہ تبدیلی کے مخالفین کا تھا، دوسرا تبدیلی کے حامیوں کا ——— میں جب جیل سے باہر آیا تو کوشش کی کہ دونوں گروہوں میں مفاہمت کی راہ نکل آئے، اور ستمبر ۱۹۲۳ء میں ہونے والے کانگریس کے خصوصی اجلاس میں ہم ایک سمجھوتہ کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس وقت میری عمر پینتیس برس کی تھی اور مجھ سے اس اجلاس کی صدارت کے لیے کہا گیا تھا۔ لوگوں کے خیال میں کانگریس کا صدر منتخب ہونے والا میں سب سے کم عمر شخص تھا۔

۱۹۲۳ء کے بعد کانگریس کی سرگرمیاں خاص طور پر سوراج پارٹی کے ہاتھ میں رہیں۔ تقریباً تمام مجالس قانون سازمیں اسے زبردست اکثریت مل گئی اور پارلیمانی محاذ پر بھی اس نے اپنی لڑائی جاری رکھی ——— وہ کانگریسی جو سوراج پارٹی سے باہر تھے، انھوں نے بھی اپنا تعمیری پروگرام جاری رکھا لیکن وہ سوراج پارٹی کی جیسی عوامی حمایت یا توجہ حاصل نہیں کرسکے ——— ایسے بہت سے واقعات ہوئے جنھوں نے ہندستانی سیاست کے آئندہ ارتقا پر اثر ڈالا لیکن اس کی مزید تفصیلات کے لیے مجھے قاری سے یہ درخواست کرنی پڑے گی کہ وہ میری خود نوشت

کی پہلی جلد کے چھپنے کا انتظار کرے۔

۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے تقرر اور اس کی ہندستان آمد کے ساتھ سیاسی جوش وخروش بڑھتا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے آزادی کی قرارداد پاس کردی اور برطانوی حکومت کو یہ نوٹس بھیجا کہ اگر اس قومی مطالبے کو منظور نہیں کیا گیا تو ایک برس بعد وہ حکومت کے خلاف ایک عوامی تحریک شروع کردے گی۔ انگریزوں نے ہمارا یہ مطالبہ ٹھکرا دیا اور ۱۹۳۰ء میں کانگریس نے اعلان کیا کہ نمک قانون توڑے جائیں گے۔ نمک ستیہ گرہ جب شروع ہوئی تو بہت سے لوگوں کو اس کی کامیابی پر شک تھا لیکن تحریک میں جو شدت پیدا ہوتی گئی اس نے حکومت اور عوام دونوں کو حیران کردیا۔ حکومت نے اس کے خلاف سخت کارروائی کی اور کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا۔ اس نے صدر کانگریس اور اس کی ورکنگ کمیٹی کے اراکین کی گرفتاری کا حکم جاری کردیا۔ اس چیلنج کا مقابلہ ہم نے اس طرح کیا کہ ہر صدر کانگریس کو اپنا جانشیں مقرر کرنے کے اختیارات سونپ دیے۔ مجھے بھی ایک صدر منتخب کیا گیا اور میں نے اپنی ورکنگ کمیٹی نامزد کی۔ اپنی گرفتاری سے پہلے، میں نے ڈاکٹر انصاری کو اپنا جانشیں مقرر کیا —— پہلے تو وہ تحریک میں شامل ہونے پر رضامند نہیں تھے لیکن میں انھیں آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگیا —— اس طرح حکومت کو چکمہ دے کر ہم تحریک کو جاری رکھ سکے۔

میری گرفتاری ایک تقریر کی بنیاد پر عمل میں آئی جو میں نے میرٹھ میں کی تھی۔ چنانچہ مجھے تقریباً ڈیڑھ برس کے لیے میرٹھ جیل میں ڈال دیا گیا۔

اس جدوجہد کے ایک سال سے کچھ اوپر جاری رہنے کے بعد، لارڈ ارون نے گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کو آزاد کردیا۔ پہلے ہم الٰہ آباد میں ملے، پھر دہلی میں اور گاندھی ارون سمجھوتے پر دستخط ہوگئے۔ اس کا نتیجہ کانگریسیوں کی عام رہائی اور گول میز کانفرنس میں کانگریس کی شرکت کے طور پر سامنے آیا۔ گاندھی جی کو ہمارے واحد ترجمان کی حیثیت سے بھیجا گیا لیکن مذاکرات لاحاصل ثابت ہوئے اور گاندھی جی خالی ہاتھ لوٹ آئے۔

لندن سے واپسی پر گاندھی جی کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور جبر کی ایک نئی پالیسی شروع کی گئی۔ لارڈ ولنگڈن نئے وائسرائے تھے اور انھوں نے تمام کانگریسیوں کے خلاف سخت کارروائی کی۔ میں دہلی میں تھا اور مجھے ایک برس سے زیادہ کے لیے دہلی جیل میں قید کر دیا گیا تھا۔ اس مدت میں ہندستان کی سیاسی تاریخ میں زبردست معنویت کے حامل کئی واقعات رونما ہوئے، لیکن ان کی تفصیل کے لیے بھی قارئین کو پہلی جلد کا انتظار کرنا پڑے گا۔

۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا گیا جس میں صوبائی خود مختاری اور مرکز میں ایک وفاقی حکومت کے قیام کی منظوری دی گئی تھی ------ یہیں سے اُس کہانی کا آغاز ہوتا ہے جسے میں موجودہ کتاب میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

۱

کانگریس، اقتدار میں

صوبائی خود مختاری کے قیام کے بعد جو پہلے انتخابات ہوئے، ان میں کانگریس بھاری اکثریت سے جیتی۔ بڑے صوبوں میں سے پانچ میں اسے مکمل اکثریت مل گئی اور چار صوبوں میں وہ اکیلی سب سے بڑی پارٹی تھی۔ صرف پنجاب اور سندھ میں ایسا ہوا کہ کانگریس کو نسبتاً ایسی کامیابی نہیں مل سکی۔

کانگریس کی اس کامرانی کو، ہمیں اس حقیقت کے مقابلے میں رکھ کر دیکھنا چاہیے کہ ابتدا میں تو وہ تنہا ولڑنے سے ہی ہچکچا رہی تھی۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں مکمل صوبائی خود مختاری کا لحاظ رکھا گیا تھا لیکن اس مرہم میں ایک مکھی بھی چھپی ہوئی تھی۔ گورنروں کو یہ خصوصی اختیارات سونپے گئے تھے کہ وہ ایمرجنسی کا نفاذ کر سکتے ہیں۔ اور ایک بار ایسا کرتے ہی انھیں یہ حق مل جاتا تھا کہ آئین کو معطل کر دیں اور تمام اختیارات پر قابض ہو جائیں ---- چنانچہ صوبوں میں جمہوریت اسی وقت تک چل سکتی تھی جب تک کہ گورنر اس کی اجازت دیں۔ جہاں تک مرکزی حکومت کا تعلق ہے، صورت حال خراب تر تھی۔ یہاں اس بات کی کوشش کی جا رہی تھی کہ دو عملی کے اصول کو.. جو صوبوں میں پہلے ہی بدنام ہو چکا تھا، نئے سرے سے بروئے کار لایا جائے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ مرکزی حکومت

ایک کمزور وفاق بن جاتی تھی، اس کا جھکاؤ والیانِ ریاست اور مفاد پرستوں کی طرف بھی ہو جاتا تھا —— ان سے عام طور پر یہی توقع کی جاتی تھی کہ یہ ملک کے انگریز حکمرانوں کا ساتھ دیں گے۔

اسی لیے، یہ واقعہ حیران کن نہیں ہے کہ کانگریس، جو ملک کی مکمل آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی تھی، اس کے لیے یہ انتظام قابلِ قبول نہیں تھا۔ مرکزی حکومت کے لیے جس قسم کا وفاق تجویز کیا گیا، کانگریس نے صاف لفظوں میں اس کی مذمت کی۔ بہت دنوں تک، کانگریس ورکنگ کمیٹی صوبائی خود مختاری کو تسلیم کرنے کے بھی خلاف رہی۔ میرا، بہرحال، یہ خیال تھا کہ انتخابات کا بائیکاٹ کرنا غلط ہوگا۔ اگر کانگریس یہ کر بیٹھتی تو کم پسندیدہ عناصر مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز پر قابض ہو جائیں گے اور ہندستانی عوام کے ترجمان بن جائیں گے۔ اس سے قطع نظر، انتخابات کی مہم عوام کو ہندستانی سیاست کے بنیادی اصولوں کا درس دینے کا ایک شاندار موقعہ بھی فراہم کرتی تھی۔ بالآخر یہ نقطۂ نظر جس کی نمائندگی میں کر رہا تھا، تسلیم کر لیا گیا، اور کانگریس انتخابات میں شریک ہوئی جس کے نتائج کی طرف میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں۔

اب کانگریس کی قیادت میں نئے اختلافات رونما ہوئے۔ ایسے لوگ جنھوں نے انتخابات میں حصہ لیا تھا، ان کا ایک حصہ اب اس بات کی مخالفت کر رہا تھا کہ کانگریس کے نامزدگان اقتدار ہاتھ میں لیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ خصوصی اختیارات گورنروں کے لیے محفوظ ہیں، اس لیے صوبائی خود مختاری ایک مسخراپن ہے۔ اس طرح کانگریسی وزارتوں کا انحصار گورنروں کی رضا پر ہے۔ اگر کانگریس اپنے انتخابی وعدوں کو پورا کرنا چاہتی ہے تو گورنر سے اس کا تصادم ناگزیر ہوگا۔ اسی لیے، ان کی حجت یہ تھی کہ کانگریس کو مجلس قانون ساز میں رہ کر آئین کو توڑنے کی کوشش کرتی چاہیے۔ اس مسئلے پر بھی ہم میں سے کچھ لوگ مختلف نقطۂ نظر رکھتے تھے اور ہمارا کہنا یہ تھا کہ صوبائی حکومتوں کو، جو اختیارات دیے گئے ہیں انھیں پوری طرح بروئے کار لانا چاہیے۔ اگر گورنر سے تصادم کی کوئی صورت پیدا ہو تو اس کا سامنا موقعہ و محل کے تقاضوں کے مطابق کیا جانا چاہیے۔ اپنے اقتدار کا حقیقی استعمال کیے

بغیر کانگریس کے پروگرام کو چلایا نہیں جا سکے گا۔ دوسری طرف، اگر کسی مقبول عام مسئلے کو لے کر، کانگریسی وزارتوں کو سبک دوش ہونا پڑا۔ تو اس سے عوام کے ذہنوں پر کانگریس کی گرفت مضبوط تر ہو جائے گی۔

ابھی یہ بحث جاری ہی تھی کہ تمام صوبوں میں انٹرم وزارتیں تشکیل دے دی گئیں۔ انھیں غیر کانگریسی، یا بعض صورتوں میں، کانگریس مخالف عناصر نے تشکیل دیا تھا ــــ اقتدار کو قبول کرنے کے سلسلے میں کانگریس کے تذبذب سے، یہی نہیں کہ کانگریسیوں کے اندرونی اختلافات کی نشاندہی ہوئی، اس سے زیادہ بُرا یہ ہوا کہ رجعت پسند طاقتوں کو اپنی ہزیمت کے احساس پر قابو پانے اور اپنی کھوئی ہوئی زمینوں کو پھر سے حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ وائسرائے سے طویل مذاکرے کے دوران یہ ضمانت پانے کی کوشش کی گئی کہ گورنر وزارتوں کے کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔* ان بحثوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر کانگریس نے اقتدار ہاتھ میں لینا منظور کر لیا۔ پہلے پہل اس نے ایسی ریاستوں میں جہاں اسے پارلیمانی اکثریت حاصل تھی، یہ قدم اٹھایا، اور اخیر میں تو جہاں کہیں بھی یہ ممکن ہو سکا۔

یہ پہلا موقع تھا جب کانگریس انتظامیہ کی ذمّے داری سنبھال رہی تھی۔ چنانچہ کانگریس کے لیے یہ ایک آزمائش بھی تھی اور لوگ اس پر نظر لگائے ہوئے تھے کہ یہ تنظیم اپنے قومی کردار کا حق کس طرح ادا کر پاتی ہے۔ کانگریس کے خلاف مسلم لیگ کا خاص پروپیگنڈہ یہ تھا کہ کانگریس محض برائے نام قومی جماعت ہے عمومی لفظوں میں کانگریس کی مذمّت کو ناکافی سمجھ کر، لیگ نے یہ الزام بھی عائد کیا کہ کانگریسی وزارتیں اقلیتوں پر ظلم ڈھا رہی ہیں۔ اس نے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے ایک رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ ہر طرح کے غیر منصفانہ برتاؤ کا الزام لگایا گیا تھا۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تمام الزامات مطلقاً بے بنیاد تھے۔ مختلف صوبوں کے گورنروں اور وائسرائے کا بھی اس سلسلے میں یہی خیال تھا ــــ چنانچہ، لیگ کی تیار کردہ رپورٹ سمجھ دار لوگوں کو ذرا بھی قائل نہ کر سکی۔

مسلم لیگ کی پھیلائی ہوئی زیادتیوں کی کہانیاں خالصتاً ذہنی اختراع تھیں، لیکن اس وقت دو ایسے واقعات ہوئے جنھوں نے ریاستی کانگریس کمیٹیوں کے رویے کی بابت ایک خراب تاثر قائم کیا۔ مجھے رنج کے ساتھ یہ اعتراف کرنا ہے کہ بہار اور بمبئی، دونوں میں کانگریس اپنی قومیت کے امتحان سے پوری طرح سرخرو نہیں گزر سکی ——— کانگریس کا فروغ ایک قومی تنظیم کے طور پر ہوا تھا اور اسے یہ موقع فراہم کیا گیا تھا کہ مختلف فرقوں کے لوگوں کی قیادت کر سکے۔ چنانچہ، بمبئی میں مسٹر نریمان مقامی کانگریس کے مسلمہ لیڈر تھے۔ جب صوبائی حکومت کی تشکیل کا سوال اٹھا، تو عام توقع یہ تھی کہ اپنے مرتبے اور ریکارڈ کی بنا پر مسٹر نریمان سے قیادت سنبھالنے کو کہا جائے گا۔ اس کا، بہر نوع، یہ مطلب ہوتا کہ کانگریس اسمبلی پارٹی کے اراکین میں گرچہ ہندوؤں کی اکثریت ہے لیکن ایک پارسی کو وزیر اعلا بنایا جائے گا۔ سردار پٹیل اور ان کے ساتھی اس صورت حال کو قبول نہیں کر سکے اور انھوں نے سوچا کہ اس اعزاز سے کانگریس کے ہندو حمایتوں کو محروم کرنا ان کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ چنانچہ مسٹر بی، جی، کھیر سامنے لائے گئے اور انھیں بمبئی میں کانگریس اسمبلی پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا۔ *

اس فیصلے کے سلسلے میں مسٹر نریمان کا پریشان ہونا فطری تھا۔ انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے یہ سوال اٹھایا۔ اس وقت جواہر لال صدر تھے اور فرقہ وارانہ عصبیت سے ان کی مکمل آزادی کے پیش نظر، بہتوں کو امید تھی کہ وہ نریمان کے ساتھ ہونے والی بے انصافی کا تدارک کریں گے۔ بدقسمتی سے یہ نہیں ہو سکا ——— * جواہر لال جانتے تھے کہ لوگ انھیں سردار پٹیل کے ایک نقاد اور مخالف کے طور پر دیکھتے ہیں لیکن انھوں نے ایسا کوئی کام کرنا پسند نہیں کیا جو سردار پٹیل کے دوستوں کو ان پر (جواہر لال پر) اعتراض کا موقعہ مہیا کر سکے۔ اسی لیے انھوں نے پٹیل کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور نریمان کی اپیل مسترد کر دی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اپنی مدت کار میں سردار پٹیل پر وہ کوئی الزام یا تہمت نہیں آنے دیں گے۔ *

نریمان کو جواہر لال کے رویے پر حیرانی ہوئی، خاص طور پر اس لیے کہ جواہر لال نے ان کے ساتھ سختی کا انداز اختیار کیا اور ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں ان کو ڈانٹ کر خاموش رکھنے کی کوشش

کی۔ نریمان نے گاندھی جی کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ اپنا معاملہ وہ گاندھی جی کے سپرد کر دیں گے۔ گاندھی جی صبر کے ساتھ سنتے رہے اور یہ ہدایت دی کہ کسی غیر جانب دار شخص کے ذریعہ سردار پٹیل کے خلاف الزام کی چھان بین کرائی جائے۔

چونکہ نریمان خود پارسی تھے، سردار پٹیل اور ان کے دوستوں نے سمجھایا کہ انکوائری کا کام کسی پارسی ہی کو سونپا جائے۔ انھوں نے اپنی یہ چال بہت سوچ سمجھ کر تیار کی تھی اور مقدمہ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ اصل معاملات صاف ظاہر نہ ہونے پائیں۔ مزید برآں، انھوں نے مختلف طریقوں سے اپنے اثرات استعمال کیے تاکہ بے چارہ نریمان انکوائری کے شروع ہونے سے پہلے ہی مقدمہ ہار بیٹھے۔ آخر کار فیصلہ یہی ہوا کہ سردار پٹیل کے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں ہے۔

کوئی بھی شخص جو اندر کی کہانی جانتا تھا، اس فیصلے سے مطمئن نہیں ہوا۔ ہم سب کو پتہ تھا کہ سردار پٹیل کے فرقہ وارانہ مطالبات کی تشفّی کے لیے سچائی کو قربان کر دیا گیا ہے۔ نریمان غریب کا دل ٹوٹ گیا اور ان کی پبلک لائف کا خاتمہ ہو گیا۔

* ایسا ہی ایک قصّہ بہار میں بھی ہوا ——— جس وقت انتخابات ہوئے ڈاکٹر سیّد محمود صوبے کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک جنرل سکریٹری بھی تھے اور اس طرح انھیں صوبے کے اندر بھی ایک حیثیت حاصل تھی اور باہر بھی۔ کانگریس کو جب مکمل اکثریت حاصل ہوئی تو یہ طے سمجھ لیا گیا کہ صوبائی خود مختاری کے تحت ڈاکٹر سیّد محمود کو لیڈر چن لیا جائے گا اور بہار کا وزیرِ اعلیٰ بنا دیا جائے گا۔ اس کے برخلاف ہوا یہ کہ سری کرشن سنہا اور انوگرہ نارائن سنہا، جو مرکزی اسمبلی کے اراکین تھے، انھیں بہار واپس بلا لیا گیا اور وزارتِ اعلیٰ کے لیے تیار کیا جانے لگا ——— ڈاکٹر راجندر پرساد نے بہار میں وہی رول ادا کیا جو سردار پٹیل نے بمبئی میں کیا تھا۔ بہار اور بمبئی میں بس یہ فرق رہا کہ جب سری کرشن سنہا نے حکومت کی تشکیل کی تو ڈاکٹر سیّد محمود کو بھی کابینہ میں ایک جگہ دے دی گئی۔

ان دو واقعات نے اس زمانے میں ایک بدمزگی پیدا کی۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کانگریس جن مقاصد کی دعویدار تھی اُن پر عمل پیرا نہیں ہو سکی۔ افسوس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کانگریس کی فوقیت اس درجے تک نہیں پہنچ سکی تھی

جہاں فرقہ وارانہ مصلحتوں کو وہ نظرانداز کرسکتی اور اکثریت یا اقلیت کے سوال میں اُلجھے بغیر، لیڈروں کا انتخاب صرف اہلیت کی بنیاد پر کرسکتی۔*

جب میں مسٹر نریمان اور ڈاکٹر سید محمود کے ساتھ ہونے والے سلوک کی بابت سوچتا ہوں تو میرا ذہن مسٹر سی، آر، داس کی طرف جاتا ہے۔ جو تحریک عدم تعاون کے ساتھ ابھرنے والی سب سے طاقتور شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ ہماری قومی جدوجہد کی تاریخ میں مسٹر داس ایک بہت ہی خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک بلند نگاہ اور وسیع تخیل رکھنے والے انسان تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک عملی ذہن بھی رکھتے تھے۔ جو ہر سوال کا جائزہ ایک حقیقت پسند کے نقطۂ نظر سے لیتا تھا۔ ان میں... اپنے ایقانات کے اظہار کا حوصلہ بھی تھا اور جس کسی بات کو وہ صحیح سمجھتے تھے اس کے لیے بے خوفی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ جس وقت گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی، مسٹر داس نے پہلے پہل اس پروگرام کی مخالفت کی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں کلکتے کے خصوصی اجلاس میں اس بات کی نصف ذمے داری ان کی مخالفت پر ہی عاید ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں کوئی قطعی فیصلہ کیوں نہیں کیا جاسکا —— ایک برس بعد، جب ناگپور میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو وہ ہمارے ساتھ شامل ہوگئے اور عدم تعاون کا پروگرام منظور کرلیا گیا۔ کلکتہ بار میں مسٹر داس کی شاندار پریکٹس تھی اور وہ ملک کے سب سے کامیاب وکیلوں میں سے ایک تھے۔ اپنی تعیش پسندی کی وجہ سے بھی وہ مشہور تھے، لیکن ایک لمحے کی جھجک کے بغیر انھوں نے اپنی پریکٹس چھوڑ دی، کھدر پہننے لگے اور اپنے آپ کو پوری دل جمعی کے ساتھ کانگریس کی تحریک کے حوالے کردیا —— میں اُن سے بہت متاثر تھا اور میں انھیں اپنی قومی بیداری کی تاریخ کے سب سے طاقتور انسانوں میں تصور کرتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، مسٹر داس ایک عملی ذہن رکھتے تھے۔ سیاسی سوالات پر وہ اس زاویے سے نظر ڈالتے تھے کہ ان میں مناسب کیا ہے اور قابلِ عمل کیا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر ہندستان کو مذاکرات کے ذریعے آزادی جیتنی ہے تو ہمیں قدم بہ قدم آگے بڑھنے پر خود کو تیار کرنا ہوگا۔ جب گفت وشنید اور ترغیب کا راستہ اپنایا گیا ہے تو آزادی

اچانک ہاتھ نہیں آ سکتی۔ ان کی پیش گوئی یہ تھی کہ ہمارا پہلا قدم صوبائی خود مختاری کا حصول ہوگا۔ وہ اس بات پر مطمئن تھے کہ محدود اختیار کا استعمال بھی ہندستان کی آزادی کے مقصد کو آگے بڑھائے گا اور ہندستانیوں کو اس کے لیے تیار کرے گا کہ جب کبھی وہ کامیاب ہو جائیں تو وسیع تر ذمے داریوں کا بوجھ اٹھا سکیں۔

مسٹر داس کی دُور اندیشی اور بصیرت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی وفات کے تقریباً دس برس بعد انھی خطوط پر ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا گیا۔

۱۹۲۱ء میں اُس وقت کے پرنس آف ویلز، مونٹیگیو چیمس فورڈ اصلاحات کی اسکیم کے افتتاح کے سلسلے میں ہندستان آئے۔ کانگریس نے فیصلہ کیا تھا کہ پرنس کے خیر مقدم کے لیے ترتیب دیے جانے والے تمام استقبالیوں کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ اس صورت حال نے حکومتِ ہند کے لیے بڑی مشکل پیدا کر دی۔ وائسرائے نے برطانوی حکومت کو یقین دلایا تھا کہ ملک میں پرنس کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا جائے گا۔ جب اسے کانگریس کے فیصلے کا پتہ چلا تو اس نے بائیکاٹ کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان مقاصد میں حکومت کامیاب نہیں ہو سکی اور تقریباً ان تمام شہروں میں جہاں پرنس آف ویلز گئے، اُن کا خیر مقدم سرد مہری کے ساتھ کیا گیا۔ ان کا آخری پڑاؤ کلکتہ تھا جو اس وقت ہندستان کا سب سے اہم شہر تھا۔ ہر چند کہ دارالسلطنت دہلی منتقل ہو چکا تھا، لیکن سرما کا ہر موسم وائسرائے کلکتے میں گزارتے تھے اور کلکتے کو ملک کے موسم سرما کے دارالسلطنت کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ شہر میں ایک خاص جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا اور پرنس آف ویلز کو وکٹوریہ میموریل ہال کا سنگ بنیاد رکھنا تھا۔ چنانچہ اس کے استقبال کی خاطر پُر تکلف انتظامات کیے گئے اور حکومت نے، پرنس کے دورۂ کلکتہ کو کامیاب ثابت کرنے کے لیے کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔

ہم سب اُس وقت علی پور سینٹرل جیل میں تھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ کانگریس اور حکومت کے مابین ایک سمجھوتہ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے وائسرائے سے ملاقات

کی اور یہ تاثر لے کر واپس آئے کہ اگر ہم کلکتے میں پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ نہ کرنے پر رضامند ہو جائیں تو حکومت کانگریس سے کوئی معاملہ کرلے گی۔ پنڈت مدن موہن مالویہ مجھ سے اور مسٹر داس سے اس تجویز پر گفتگو کے لیے علی پور جیل آئے۔ تجویز کی بنیاد یہ تھی کہ ہندستان کے سیاسی مستقبل کے سوال کو حل کرنے کے لیے ایک گول میز کانفرنس طلب کی جائے۔ ہم نے پنڈت مالویہ کو کوئی قطعی جواب نہیں دیا کیونکہ ہم اس مسئلے پر آپس میں بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ مسٹر داس اور میں ، ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ہمارا پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ ہی تھا جس نے حکومتِ ہند کو مجبور کر دیا ہے کہ سمجھوتہ کر لیا جائے۔ ہمیں اس صورت حال کا فائدہ اٹھانا چاہیے اور ایک گول میز کانفرنس کی تجویز مان لینی چاہیے ——— ہم یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس سے پوری آزادی تو نہیں ملے گی ، البتہ ہماری سیاسی جدوجہد میں یہ ایک بڑا اور اگلا قدم ہوگا۔ گاندھی جی کو چھوڑ کر کانگریس کے تمام لیڈر اس وقت جیل میں تھے۔ ہم نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم انگریزوں کی پیش کش قبول کر لیں گے ، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہم نے یہ شرط بھی لگا دی کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے تمام کانگریسی لیڈروں کو رہا کیا جائے۔

اگلے روز جب پنڈت مالویہ دوبارہ ہم سے ملنے آئے ، ہم نے انھیں اپنے طرزِ فکر سے مطلع کر دیا ——— ہم نے اُن سے یہ بھی کہا کہ انھیں گاندھی جی سے ملنا چاہیے اور ان کی رضامندی حاصل کرنی چاہیے۔ پنڈت مالویہ نے وائسرائے تک ہماری بات پہنچا دی اور دو روز بعد ہم سے ملاقات کے لیے ایک بار پھر جیل آئے۔ انھوں نے کہا کہ حکومتِ ہند ایسے تمام سیاسی لیڈروں کو رہا کرنے پر آمادہ ہے جو بات چیت میں حصّہ لینے والے ہیں۔ ان میں علی برادران اور بہت سے دوسرے کانگریسی لیڈر شامل تھے۔ ہم نے ایک بیان تیار کیا جس میں بہت واضح طور پر اپنے خیالات درج کیے۔ پنڈت مالویہ نے یہ دستاویز لے لی اور بمبئی چلے گئے تاکہ گاندھی جی سے مل سکیں۔

ہمارے لیے یہ حیرت اور افسوس کی بات تھی کہ گاندھی جی نے ہمارا مشورہ قبول نہیں کیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ پہلے تمام سیاسی لیڈر ، بالخصوص علی برادران غیر مشروط طریقے سے رہا کیے جائیں۔ انھوں نے یہ اعلان کیا کہ گول میز کی تجویز پر ہم صرف اس

وقت غور کر سکتے ہیں جب ان لوگوں کو رہا کر دیا جائے ------ ہم دونوں، یعنی مسٹر داس اور میں، محسوس کرتے تھے کہ یہ مطالبہ غلط ہو گا۔ جب گورنمنٹ یہ مان چکی ہے کہ تمام کانگریسی لیڈر گول میز سے پہلے آزاد کر دیے جائیں گے تو پھر اس قسم کے خصوصی اصرار کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہماری اس رائے کے ساتھ پنڈت مالویہ دوبارہ گاندھی جی کے پاس گئے لیکن وہ راضی نہیں ہوئے ---- نتیجہ یہ ہوا کہ وائسرائے نے اپنی تجویز واپس لے لی۔ اس پیش کش سے ان کا خاص مقصد یہ تھا کہ کلکتے میں پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ نہ ہو۔ چونکہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا اس لیے بائیکاٹ پوری طرح کامیاب رہا، لیکن ہم نے سیاسی سمجھوتے کا ایک سنہرا موقعہ کھو دیا تھا۔ مسٹر داس نے اپنی ناپسندیدگی اور مایوسی کو راز میں نہیں رکھا۔

اس کے بعد گاندھی جی نے بمبئی میں ایک کانفرنس طلب کی جس کی صدارت سی شنکرن نایر کو کرنی تھی۔ گاندھی جی نے اس کانفرنس میں خود ہی ایک گول میز کانفرنس کی تجویز رکھی۔ ان کی شرطیں کم و بیش وہی تھیں جو اس سے پہلے پنڈت مالویہ پیش کر چکے تھے۔ اس دوران میں پرنس آف ویلز ہندستان سے جا چکے تھے اور حکومت کو اس تجویز سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ انھوں نے گاندھی جی کی تجویز پر کچھ توجہ نہیں کی اور اسے یکسر مسترد کر دیا ------ مسٹر داس بہت جلال میں تھے اور کہتے تھے کہ گاندھی جی نے ساری صورت حال کا ستیاناس کر دیا ہے اور ایک بہت بڑی سیاسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں ------ مجھے یہ ماننا پڑا کہ ان کی یہ رائے درست ہے۔

اب گاندھی جی نے چوری چورا واقعے کی بنیاد پر عدم تعاون کی تحریک کو معطل کر دیا۔ اس سے سیاسی حلقوں میں ایک شدید سیاسی ردعمل پیدا ہوا اور ملک بھر میں کم حوصلگی کی فضا پھیل گئی۔ حکومت نے اس صورت حال کا پورا فائدہ اٹھایا اور گاندھی جی کو گرفتار کر لیا ------ انھیں چھ مہینے کی قید ہوئی اور عدم تعاون کی تحریک رفتہ رفتہ معدوم ہوتی گئی۔

مسٹر داس تقریباً ہر روز مجھ سے اس صورت حال پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ انھیں

یقین تھا کہ تحریک کو واپس لے کر گاندھی جی نے بہت بڑی بھول کی ہے۔ اس نے سیاسی کارکنوں کے حوصلے اس درجہ پست کر دیے تھے کہ عوام میں اب پھر سے جوش پیدا کرنے کے لیے کئی برس کی مدت درکار تھی ——— علاوہ ازیں، مسٹر داس کا خیال یہ بھی تھا کہ گاندھی جی کے دونوں طریقے ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ عوام کے حوصلوں کی بحالی کے لیے ہمیں اب دوسرے طریقے اختیار کرنے ہوں گے۔ وہ اس حق میں نہیں تھے کہ بس انتظار کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کب حالات بہتر ہوتے ہیں۔ وہ ایک متبادل پروگرام میں یقین رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ موجودہ صورت حال میں، ہمیں براہ راست اقدامات ترک کر دینے چاہئیں اور اپنی سیاسی لڑائی مجالس قانون ساز کے اندر رہ کر لڑنی چاہیے۔ گاندھی جی کے اثر میں آ کر، کانگریس نے ۱۹۲۱ء میں ہونے والے انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔ مسٹر داس نے اعلان کیا کہ ۱۹۲۴ء میں ہمیں مجالس قانون ساز پر قبضے کی تیاری کرنی چاہیے اور انھیں اپنے سیاسی مقاصد کے فروغ کی خاطر کام میں لانا چاہیے۔ مسٹر داس کو امید تھی کہ کانگریس کے تمام سرگرم لیڈران کے اس تجزیے اور تجویز سے اتفاق کریں گے مجھے خیال ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ پرامید ہیں، لیکن میں ان سے اس بات پر متفق تھا کہ جب وہ رہا کر دیے جائیں تو انھیں دوستوں سے مشورہ کرنا چاہیے اور ملک کے لیے ایک نیا لائحۂ عمل ترتیب دینا چاہیے۔

مسٹر داس اس وقت رہا ہوئے جب گیا کانگریس ہونے کو تھی۔ مجلس استقبالیہ نے انھیں صدر منتخب کیا اور داس نے یہ سوچا کہ وہ ملک کو اپنے پروگرام کے مطابق چلا سکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ حکیم اجمل خاں، پنڈت موتی لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل اُن کے رویے سے اتفاق کرتے ہیں، اُن کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اپنے استقبالیہ خطبے میں مسٹر داس نے یہ تجویز رکھی کہ کانگریس کو کونسل میں داخلے والا پروگرام قبول کر لینا چاہیے اور اپنی سیاسی جد و جہد مجالس قانون ساز کے اندر تک لے جانی چاہیے۔ گاندھی جی اس وقت جیل میں تھے۔ کانگریس کے ایک حلقے نے جس کی قیادت شری راجگوپال آچاری کر رہے تھے، مسٹر داس کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر براہ راست اقدام کو ترک کر دیا گیا اور داس کا پروگرام

منظور کر لیا گیا تو اس سے حکومت یہ نتیجہ نکالے گی کہ گاندھی جی کی لیڈرشپ مسترد کر دی گئی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ شری راج گوپال آچاری کی یہ تعبیر درست تھی۔ مسٹر داس حکومت سے مفاہمت کے چکر میں نہیں تھے بلکہ صرف یہ چاہتے تھے کہ سیاسی جدوجہد کا سلسلہ دوسرے میدانوں تک پھیل جائے۔ انھوں نے تفصیل سے اس امر کی وضاحت کی، لیکن کانگریس کے عام ہمنواؤں کو قائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ شری راج گوپال آچاری، ڈاکٹر راجندر پرساد اور دوسروں نے مخالفت کی اور ان کی تجویز کو ناکام بنا دیا ——— گیا کانگریس دو حصوں میں بٹ گئی اور مسٹر داس نے استعفیٰ دے دیا۔ کانگریسیوں کی ساری طاقت اب دونوں گروہوں کی باہمی کشمکش میں صرف ہونے لگی جن میں ایک گروپ تبدیلی کا حامی (PRO-CHANGERS) کہلاتا تھا اور دوسرا تبدیلی کا مخالف (NO-CHANGERS)

اگلے چھ مہینے بعد، میں جیل سے باہر آیا۔ میں نے دیکھا کہ کانگریس ایک شدید بحران سے دوچار ہے۔ انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی بجائے، تمام کانگریسیوں کی توانائی آپسی جنگ و جدل کی نذر ہوئی جا رہی ہے۔ مسٹر داس، پنڈت موتی لال اور حکیم اجمل خاں تبدیلیوں کے حامی کیمپ کی قیادت کر رہے تھے۔ راجہ جی، سردار پٹیل اور راجندر پرساد تبدیلی کی مخالفت کرنے والوں (NO-CHANGERS) کے ترجمان تھے۔ دونوں گروپ مجھے اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے تھے، لیکن میں نے خود کو کسی بھی کیمپ سے مکمل اتفاق کی اجازت نہیں دی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ اندرونی اختلافات خطرناک ہیں اور اگر بروقت روکے نہیں گئے تو کانگریس کو توڑ کر رکھ دیں گے۔ اسی لیے میں نے دونوں کیمپوں سے باہر رہنے کا فیصلہ کیا اور اپنی ساری توجہ سیاسی جدوجہد پر مبذول کرنے کی کوشش کی ——— یہ کہتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں اپنی کوششوں میں کامیاب رہا۔ دہلی میں کانگریس کا ایک خاص اجلاس ہوا اور دونوں گروہوں کی رضامندی سے مجھے صدر منتخب کر لیا گیا۔

اپنے صدارتی خطبے میں، میں نے اس واقعے پر زور دیا کہ ہمارا اصل مقصد ملک کی آزادی ہے۔ ۱۹۱۹ء سے ہم براہ راست اقدامات کے پروگرام پر عمل پیرا ہیں اور اس سے خاطر خواہ

نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اگر اب، ہم میں سے کچھ لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی لڑائی مجالس قانون ساز کے اندر تک لے جانی چاہیے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے گزشتہ فیصلے سے سختی کے ساتھ چپکے رہیں۔ جب تک ہمارا مقصد ایک ہے، ہر گروپ کو وہ پروگرام اختیار کرنے کی آزادی ہونی چاہیے جسے وہ سب سے بہتر سمجھتا ہے۔

دہلی کانگریس کا فیصلہ یہ تھا کہ تبدیلی کے حامی اور تبدیلی کے مخالف، دونوں کو اپنے اپنے پروگرام کے مطابق عمل کی آزادی ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر راجندر پرساد، شری راج گوپال آچاریہ اور ان کے ساتھیوں نے تعمیری پروگرام ہاتھ میں لے لیا۔ مسٹر سی، آر، داس، پنڈت موتی لال اور حکیم اجمل خاں نے سوراج پارٹی کی داغ بیل ڈالی اور الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ ملک کے طول و عرض میں ان کے اس اقدام نے بے پناہ جوش و خروش پیدا کر دیا۔ تمام صوبائی اور اسی کے ساتھ ساتھ مرکزی اسمبلیوں میں سوراج پارٹی کی قیادت بہت سوں نے مان لی۔

تبدیلی کے مخالفوں کا ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ کونسل میں داخلے کے پروگرام سے گاندھی جی کی لیڈر شپ کمزور پڑ جائے گی۔ واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کا یہ خیال غلط تھا۔ مرکزی مجلسِ قانون ساز میں سوراج پارٹی نے یہ قرارداد پیش کی کہ گاندھی جی کو فوراً رہا کیا جائے۔ حکومت اس اقدام سے متاثر ہوئی اور اس کے جلد ہی بعد گاندھی جی رہا کر دیے گئے۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ مرکزی اور اسی کے ساتھ ساتھ صوبائی مجالسِ قانون ساز میں سوراج پارٹی کے مقتدروں میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید اس کا نمایاں ترین کارنامہ مسلمانوں کے لیے محفوظ نشستوں کے حصول میں کامیاب ہونا تھا۔ رائے دہندگان (بالعموم) فرقہ پرست تھے اور صرف مسلمان ووٹروں نے مسلمان نمائندوں کو (مجالس کے لیے) چنا یا تھا۔ اسی لیے مسلم لیگ اور دوسری فرقہ پرست جماعتیں مسلمانوں کے ہراس کو ہوا دینے میں کامیاب ہوئیں، اور عام طور پر، فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے امیدواروں کی حمایت کی۔ مسٹر داس بنگال کے مسلمانوں کی تشویش اور وسوسوں پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے اور ان کے (مسلمانوں کے) لیڈر مان لیے گئے۔ جس طریقے سے انھوں نے بنگال کے فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کیا، وہ یادگار رہے گا اور اسے آج بھی اپنے لیے ایک مثال بننا چاہیے۔

بنگال میں مسلمان اکثریتی فرقے کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے وہ پسماندہ تھے۔ پبلک لائف یا سرکاری نوکریوں میں انھیں بمشکل کوئی جگہ مل سکی تھی۔ گرچہ آبادی میں ان کا تناسب پچاس فی صد سے زیادہ تھا، مگر سرکاری ملازمتوں میں مشکل سے تیس فی صد ان کے ہاتھ آئی تھیں۔ مسٹر داس زبردست حقیقت شناس تھے اور جلدی ہی انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ مسئلہ اصل میں اقتصادی ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ تاوقتے کہ مسلمانوں کو اپنے معاشی مستقبل کی بابت ضروری تحفظات نہیں دیے جائیں گے، ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ دل سے کانگریس کے ساتھ ہوں گے، اسی لیے انھوں نے ایک اعلان کیا جس نے صرف بنگال ہی نہیں بلکہ ہندستان کو حیران کر کے رکھ دیا۔ ان کا اعلان یہ تھا کہ بنگال میں حکومت کی باگ ڈور جب کانگریس کے ہاتھ میں آجائے گی، تو اُس وقت تک، جب تک کہ اپنی آبادی کے تناسب سے وہ متناسب نمائندگی نہ حاصل کرلیں، تمام نئے تقررات میں سے ساٹھ فی صد مسلمانوں کے لیے محفوظ رہیں گے۔ کلکتہ کارپوریشن کے معاملے میں وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور ایسی ہی شرطوں پر اسّی فی صد نئے تقررات کو محفوظ کرنے کی پیش کش کی۔ انھوں نے اس امر کی نشاندہی کی کہ جب تک پبلک لائف اور ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی متناسب نہیں ہو جاتی، بنگال میں صحیح جمہوریت نہیں لائی جاسکتی ——— ایک بار نابرابری ختم ہوجائے تو مسلمان مساوی شرطوں پر مقابلے کے اہل ہو جائیں گے، اور پھر کسی خصوصی تحفظ (ریزرویشن) کی ضرورت نہیں رہ جائے گی۔

اس جسارت آمیز اعلان نے بنگال کانگریس کو اُس کی بنیادوں تک کپکپا کر رکھ دیا۔ بہت سے کانگریسی لیڈروں نے شدت آمیز طریقے سے اس کی مخالفت کی اور مسٹر داس کے خلاف ایک مہم شروع کردی۔ ان پر موقعہ پرستی، یہاں تک کہ مسلمانوں کے تئیں جانب داری کا الزام لگایا گیا لیکن وہ ایک چٹان کی طرح ثابت قدم رہے۔ انھوں نے پورے صوبے کا دورہ کیا اور اپنا نقطۂ نظر، ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کو یکساں طور پر سمجھایا۔ اُن کے مقصد میں اتنا خلوص اور ایسی طاقت تھی کہ بالآخر بنگال کانگریس کو اُن کا نقطۂ نظر قبول کرنا پڑا۔ بنگال اور باہر کے مسلمانوں پر اُن کے رویّے کا گہرا اثر پڑا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر قبل از وقت

ان کا انتقال نہ ہو جاتا تو انھوں نے ملک میں ایک نیا ماحول پیدا کر دیا ہوتا۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کے مقلّدوں میں سے کچھ نے ان کے رویے پر حملے کیے اور ان کے اعلان کو مسترد کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے مسلمان کانگریس سے دُور ہوتے گئے، اور تقسیم کا پہلا بیج بویا گیا۔

بہر حال، ایک حقیقت مجھے واضح کر دینی چاہیے۔ بہار اور بنگال کی صوبائی کانگریس کمیٹیوں نے ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر نریمان کو مقامی قیادت سے محروم رکھ کر غلطی کی تھی، اور ورکنگ کمیٹی اتنی مضبوط نہیں تھی کہ اس غلطی کا تدارک کر سکے۔ اس ایک لغزش کے علاوہ، کانگریس نے اپنے اصولوں پر پورا اترنے کی ہر ممکن کوشش کی --------- ایک بار وزارتوں کی تشکیل ہو گئی تو پوری کوشش اس بات کی ہوئی کہ تمام اقلیتوں کے ساتھ حتمی طور پر انصاف کیا جانا چاہیے۔

کانگریس کے اقتدار میں آنے پر، وزارتوں کے کام کی نگرانی اور پالیسی کے معاملات میں اُن کی عام رہنمائی کے لیے ایک پارلیمانی بورڈ بنایا گیا۔ یہ بورڈ سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرساد اور مجھ پر مشتمل تھا۔ اس طرح، میں کئی صوبوں، یعنی کہ بنگال، بہار، یو پی، پنجاب، سندھ اور سرحد کے پارلیمانی امور کا انچارج تھا۔ ہر واقعہ جس سے فرقہ وارانہ مسئلے جڑے ہوئے ہوں، میرے سامنے لایا جاتا تھا۔ اپنے ذاتی علم، اور ذمّے داری کے پورے احساس کے ساتھ، اسی لیے، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی کے جو الزامات مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی طرف سے لگائے جاتے تھے، مطلقاً بے بنیاد تھے۔ اگر ان الزامات میں سچائی کی ذرا بھی رمق ہوتی، تو میں اس امر پر پوری توجہ صرف کرتا کہ ناانصافی کا تدارک ہو جائے۔ ایسے کسی سوال پر میں استعفیٰ تک دینے کے لیے تیار تھا۔

کانگریس وزارتیں دو برس سے کچھ کم وقت تک اقتدار میں رہیں، لیکن اس مختصر مدت میں اصولی طور پر کئی اہم مسئلے طے کیے گئے۔ زمینداری یا زمین کی ملکیت، زرعی قرض داری کے خاتمے اور بچوں اور بالغوں، دونوں کے لیے تعلیم کے ایک وسیع پروگرام کی بابت کانگریس وزارتوں نے جو قوانین نافذ کیے، ان کا تذکرہ یہاں خاص طور پر کیا جا سکتا ہے۔

زمین داری کے خاتمے اور زرعی قرضوں کی منسوخی جیسے مسئلے آسانی سے سلجھنے والے نہیں تھے ـــــــ اس طرح کے قانون سے بہت سے قدیمی مفادات پر ضرب پڑتی تھی۔ اسی لیے، یہ بات تعجب کی نہیں کہ مفاد پرستوں نے ہر قدم پر کانگریس سے نبرد آزمائی کی۔ بہار میں زمینی اصلاحات سے متعلق اقدامات کی مخالفت بہت دنوں تک جاری رہی اور مجھے ذاتی طور پر اس مسئلے کے حل کی خاطر، مداخلت کرنی پڑی۔ زمینداروں سے طویل مذاکرات کے بعد، ہم ایک ایسا فارمولہ بنا سکے، جس نے کسانوں کے حقوق کی ضمانت دینے کے ساتھ ساتھ، زمینداروں کے جائز اندیشوں کو بھی دور کر دیا۔

ہم جو ایسے نازک مسئلوں کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بیشتر اس وجہ سے کہ کانگریس کے کسی خاص حلقے کا میں کبھی وکیل نہیں سمجھا گیا تھا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ دوسری دہائی کے اوائل میں (کانگریس میں) تبدیلی کے حامی اور تبدیلی کے مخالف گروپوں کو قریب لانے میں، کس طرح میں مدد کر سکا۔ یہ کشمکش تو ختم ہو گئی، لیکن تیسری دہائی کے دوران کانگریس دو معین حلقوں میں بٹ گئی جس میں ایک کو دائیں بازو والا کہا جاتا تھا، دوسرے کو بائیں بازو والا۔ دائیں بازو والے RIGHTIST مفاد پرستوں کے حامی سمجھے جاتے تھے۔ اس کے برعکس، بائیں بازو والے LEFTIST اپنے انقلابی جوش کی بنا پر برو مند ہو رہے تھے۔ میں نے دائیں بازو والوں کے اندیشوں کا مطلوبہ لحاظ رکھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ، اصلاح کے معاملے میں میری ہمدردیاں بائیں بازو والوں کے ساتھ تھیں۔ اس لیے مجھے دو انتہا پسندانہ نقاط نظر میں مفاہمت کرانے کا موقعہ مل گیا اور یہ امید ہوئی کہ کانگریس، ثابت قدمی کے ساتھ اور بغیر کسی تصادم کے، اپنا پروگرام جاری رکھے گی۔ بہر حال، بین الاقوامی طاقتوں کے کھیل کی وجہ سے، کانگریس کے الیکشن پروگرام کی تدریجی تکمیل کے لیے تمام منصوبے، ۱۹۳۹ء میں معطل کر دیے گئے۔

۲

یورپ میں جنگ

پچھلے باب میں بیان کیے گئے واقعات، سر پر منڈلاتی ہوئی جنگ کے افسردہ پس منظر میں رونما ہو رہے تھے۔ اس پوری مدت میں جو زیر نظر ہے، یورپ میں بین الاقوامی بحران گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ روشن ہوتی جا رہی تھی کہ جنگ ہو کر رہے گی۔ جرمن ریاست میں آسٹریا کی شمولیت کے فوراً بعد ہی سوڈیٹن لینڈ کے مطالبات شروع ہو گئے۔

اس وقت جب مسٹر چیمبرلین نے اپنا میونخ کا تاریخی دورہ کیا جنگ تقریباً ناگزیر دکھائی دیتی تھی۔ ایک سمجھوتہ ہو گیا اور جنگ کے بغیر چیکوسلواکیہ کا ایک حصہ جرمنی کے قبضے میں آ گیا۔ پل بھر کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ جنگ ٹل گئی ہے، لیکن بعد کے واقعات نے یہ امیدیں جھٹلا دیں ——— میونخ کے ایک برس کے اندر، برطانیہ عظمیٰ کو جرمنی سے جنگ کے اعلان پر مجبور ہونا پڑا۔

یورپ میں جو واقعات ہو رہے تھے ان پر کانگریس خوش نہیں تھی۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں تریپوری کے مقام پر ہونے والے اجلاس میں اس نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی تھی:

کانگریس برطانوی خارجہ پالیسی کے تئیں اپنی تمام تر ناپسندیدگی کو ریکارڈ کرتی ہے کہ اس کے نتیجے میں میونخ معاہدہ، اینگلو اطالوی معاہدہ اور باغی اسپین کو تسلیم کرنے کا عمل سامنے آیا ہے۔ یہ پالیسی جمہوریت کے ساتھ سوچی سمجھی دغابازی، متواتر عہد شکنی، اجتماعی تحفظ کے نظام کی بیخ کنی اور وہ حکومتیں، جو جمہوریت اور آزادی کی اقبالی حریف ہیں، ان کے ساتھ تعاون سے عبارت ہے۔ اس پالیسی کے نتیجے میں، ساری دنیا بین الاقوامی انارکی کے اس حال کو پہنچ چکی ہے جہاں بغیر کسی رکاوٹ کے، بہیمانہ تشدد فتح یاب اور برومند ہوتا ہے اور قوموں کی تقدیر کا فیصلہ کرتا ہے، اور امن کے نام پر سب سے زیادہ دہشت ناک جنگوں میں سے ایک کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں۔ مرکزی اور جنوب مغربی یورپ میں، بین الاقوامی اخلاقیات کی سطح اتنی پست ہو چکی ہے کہ دنیا نے دہشت بھری نظروں سے، یہودی النسل لوگوں کے خلاف نازی حکومت کی منظم دہشت گردی اور باغی افواج کی طرف سے شہروں، غیر مسلح باشندوں اور بے سہارا پناہ گزینوں پر لگاتار ہوائی بمباری کا مشاہدہ کیا ہے۔

کانگریس خود کو برطانوی خارجہ پالیسی سے کلیتاً لاتعلق کرتی ہے جس نے فارشسٹ قوتوں کی مسلسل حمایت کی ہے اور جس نے جمہوری ممالک کی بربادی میں معاونت کی ہے۔ کانگریس امپریلزم اور فاشزم دونوں کے خلاف ہے اور اس امر میں یقین رکھتی ہے کہ عالمی امن اور ارتقا کے لیے ان دونوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ کانگریس کے خیال میں، ہندستان کے لیے اس کی فوری ضرورت ہے کہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے اپنی خارجہ پالیسی خود وضع کرے، اس طرح امپریلزم اور فاشزم دونوں سے خود کو الگ رکھے اور اپنے امن اور آزادی کے راستے پر گامزن رہے۔

بین الاقوامی افق پر جیسے ہی طوفان اکٹھا ہوئے، گاندھی جی کے ذہن پر ایک گہری نا اُمیدی چھانے لگی۔ اس تمام عرصے میں وہ ایک شدید ذہنی بحران میں مبتلا رہے تھے۔ یورپ اور امریکہ کی انجمنوں اور افراد کی جانب سے ہونے والی ان اپیلوں نے کہ سر پر منڈلاتی ہوئی جنگ کو دفع کرنے کے لیے گاندھی جی کوئی راہ نکالیں، گاندھی جی کے شخصی کرب میں اضافہ کر دیا۔ دُنیا بھر کے امن پسند، امن کے قیام کی خاطر، انھیں اپنے قدرتی قائد کے طور پر دیکھتے تھے۔

گاندھی جی نے اس سوال پر گہرائی کے ساتھ غور کیا اور بالآخر یہ تجویز کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھی کہ ہندستان کو اس بین الاقوامی بحران کے سلسلے میں اپنا موقف ظاہر کر دینا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندستان کو سر پر آن کھڑی ہوئی اس جنگ میں قطعاً شریک نہیں ہونا چاہیے، خواہ اس (شرکت) سے ہندستانی آزادی کا حصول ہی کیوں نہ ہو جائے۔

جنگ میں شرکت کے اس سوال پر، میں نے گاندھی جی سے اختلاف کیا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ یورپ دو خیموں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک خیمہ نازی ازم اور فاشزم کی ترجمانی کرتا ہے، جبکہ دوسرا جمہوری طاقتوں کا ترجمان ہے۔ ان دو خیموں کی کشمکش میں، مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا کہ ہندستان اگر آزاد ہو جائے تو اسے جمہوریتوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ ہاں، اگر انگریزوں نے ہندستانی آزادی کو تسلیم نہیں کیا، تو صاف ظاہر ہے کہ یہ اُمید رکھنا زیادتی ہوگی کہ ہندستان خود تو جمہوریت سے محروم رہے، اور دوسروں کی جمہوریت کے لیے جدوجہد کرتا رہے۔ اس صورت حال میں ہندستان کو عدم تعاون سے کام لینا چاہیے اور برطانوی حکومت کی جنگی کوششوں میں اس کی کوئی بھی مدد نہیں کرنی چاہیے۔

جیسا کہ دوسرے معاملات میں ہوا تھا، اس معاملے میں بھی کانگریس ورکنگ کمیٹی بٹی ہوئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ بعض اراکین کا ذہن صاف نہیں تھا۔ پنڈت جواہر لال، بہر حال یہ سمجھتے تھے کہ اگر گاندھی جی کی پالیسی اپنے منطقی نتیجے تک اختیار کر لی گئی تو وہ ہمیں ایک ایسی مشکل میں ڈال دے گی جس کا کوئی حل نہیں ہے۔ اسی لیے، وہ لوگ ایک کشمکش و پیچ میں

مبتلا تھے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس مسئلے پر غور و خوض تو کیا، مگر کسی فیصلے تک نہیں پہنچ سکی۔

اِدھر کانگریس تذبذب میں مبتلا تھی کہ اعلانِ جنگ کے فوراً بعد ہی ہندستان میں ایک بحران پھٹ پڑا۔ جب برطانیہ نے ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو دولتِ متحدہ کے تمام اراکین سے بھی یہی کرنے کی اپیل کی۔ ڈومینین پارلیمنٹس نے اپنے اجلاس بلائے اور جنگ کا اعلان کر دیا۔ ہندستان کے معاملے میں وائسرائے نے مرکزی مجلسِ قانون ساز سے مشورے کی رسم تک ادا کیے بغیر، اپنے طور پر ہی جرمنی سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ وائسرائے کے اس اقدام نے اگر مزید ثبوت درکار تھا، تو نئے سرے سے یہ بات ثابت کر دی کہ برطانوی حکومت ہندستان کو اپنی مرضی کے ایک غلام کے طور پر دیکھتی ہے اور ہندستان کے اس حق کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے کہ ہندستان، اپنی راہ کا فیصلہ اپنے لیے خود کرے۔

چنانچہ ہندستان کو جب اس توہین آمیز طریقے سے جنگ میں جھونکا گیا تو گاندھی جی کا ذہنی کرب تقریباً پھٹ پڑنے کی منزل تک آن پہنچا۔ وہ کسی بھی حال میں، جنگ میں ہندستان کی شمولیت پر، خود کو راضی نہیں کر سکے۔ لیکن ان کے خیالات جو بھی رہے ہوں، ایک سرکاری اقدام نے ہندستان کو جنگ میں اتار دیا تھا۔

کانگریس کے خیالات، اُس قرارداد میں واضح طور پر پیش کر دیے گئے تھے، جو ۸ ـــــ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۹ء کو، واردھا میں ہونے والی کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں منظور کی گئی۔ یہ قرارداد جنگ کی طرف کانگریس کے رویّے اور بین الاقوامی میدان میں جمہوریتوں کے رول سے متعلق واضح ترین بیانات میں سے ایک ہے، لیکن میں اسے نقل نہیں کر رہا ہوں کیونکہ حوالے کی تمام کتابوں میں یہ دستیاب ہے●●

(۳)

میں کانگریس کا صدر بنایا گیا

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں جنگ چھڑ گئی۔ اُس مہینے کے ختم ہونے سے پہلے ہی پولینڈ جرمنی کے بازوؤں میں ساکت پڑا ہوا تھا۔ پولینڈ کے باشندوں کی بے بسی میں اضافے کے لیے سوویت یونین نے ان کی زمین کے مشرقی نصف حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب ایک بار پولینڈ والوں کی فوجی مدافعت کو کچل دیا گیا تو یورپ میں ایک اضطراب آسا خاموشی پھیل گئی ——— فرانس اور جرمنی، اپنی مستحکم سرحدوں سے ایک دوسرے کا سامنا کر رہے تھے، لیکن بڑے پیمانے پر مخاصمتوں کو روک دیا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر شخص اس انتظار میں ہے کہ کچھ ہو جائے مگر ان کے غیر متشکل اندیشے مبہم اور غیر متعین تھے۔

ہندستان میں بھی انتظار اور اندیشے کی ایک کیفیت موجود تھی۔ اس غیر یقینی، اور اندیشناک پس منظر میں کانگریس کی صدارت کے سوال نے ایک نئی اہمیت اختیار کر لی۔ پچھلے سال مجھے مجبور کیا جا رہا تھا کہ یہ منصب قبول کر لوں، لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر میں نے انکار کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب صورتِ حال کچھ اور ہے۔ اور اگر میں نے پھر انکار کیا تو اپنے فرض سے کوتاہی کا مرتکب ہوں گا ——— جنگ میں ہندستان کی شمولیت کے سوال پر، گاندھی جی سے اپنے اختلاف کی طرف میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں۔ میں نے سوچا کہ اب، جبکہ

جنگ چھڑ چکی ہے، ہندستان کو جمہوری طاقتوں کے ساتھ خود کو منسلک کر لینے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ مگر، یہ سوال بہر حال سامنے تھا کہ ہندستان خود غلام رہتے ہوئے بھلا کس طرح دوسرے کی آزادی کے لیے لڑ سکتا ہے؟ اگر برطانوی حکومت ہندستان کی آزادی کا اعلان فوراً کر دیتی ہے۔ تو تمام ہندستانیوں کا یہ فرض ہو جائے گا کہ جمہوریت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیں۔ اسی لیے، میں سمجھتا تھا کہ جنگ کے بحران میں، یہ میرا فرض ہے کہ جس حیثیت میں بھی مجھ سے کہا جائے، میں خدمت انجام دوں۔ چنانچہ گاندھی جی نے جب دوبارہ مجھ سے کانگریس کا صدر بننے کی درخواست کی۔ تو میں بلا تامل رضا مند ہو گیا۔

صدارتی انتخاب کے لیے کوئی باقاعدہ مقابلہ نہیں ہوا، اور وہ امیدوار جسے میرے خلاف کھڑا کیا گیا تھا، بھاری اکثریت سے اسے شکست ہوئی —— رام گڑھ میں اجلاس ہوا اور ایک قرارداد منظور کی گئی، جو بڑی حد تک میرے انہی خیالات کا انعکاس کرتی ہے جن کا اظہار میں نے اپنے صدارتی خطبے میں کیا تھا۔ قرارداد حسب ذیل تھی:

"کانگریس کا یہ اجلاس، یورپ میں ہونے والی جنگ کے نتیجے میں رونما ہونے والی سنگین اور تشویشناک صورت حال نیز اس سے متعلق برطانوی پالیسی پر غور و خوض کے بعد، اُن تجویزوں کو جو پاس کی جا چکی ہیں، اور جنگ کی صورت حال پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی نے جو اقدامات کیے، انھیں منظور کرتا ہے اور ان کی تصدیق کرتا ہے۔ کانگریس یہ سمجھتی ہے کہ ہندستان کی برطانوی حکومت، جس کی حیثیت جنگ میں شریک ایک ملک کی ہے، اس کا وہ اعلان جس میں ہندستان کے عوام کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور ہندستان کے وسائل کا اس جنگ میں جس طور پر استحصال ہو رہا ہے، یہ سب کچھ اہانت آمیز ہے اور اسے کوئی بھی آزادی پسند اور عزت نفس کا احساس رکھنے والی قوم قبول یا برداشت نہیں کر سکتی۔ برطانوی حکومت کی جانب سے ہندستان

کے بارے میں حالیہ اعلانات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ یہ لڑائی بنیادی طور پر امپیریلیسٹ مقاصد یا اپنی سلطنت کے تحفظ اور استحکام کی خاطر لڑ رہا ہے جس کا انحصار ہندستان کے عوام، اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے ایشیائی اور افریقی ملکوں کے استحصال پر ہے — ان حالات میں، یہ صاف ظاہر ہے کہ کانگریس کسی بھی طرح، براہِ راست یا بالواسطہ طور پر، جنگ میں ایک فریق نہیں بن سکتی کیونکہ اس کا مطلب اس استحصال کو جاری رکھنا اور اسے مستحکم بنانا ہوگا۔ اسی لیے کانگریس برطانیہ عظمیٰ کی طرف سے ہندستانی فوجیوں کے لڑائی پر مجبور کیے جانے، اور جنگ کے مقصد سے ہندستان کے لوگوں اور وسیلوں کے استعمال کیے جانے کی سختی کے ساتھ مذمت کرتی ہے۔ نہ تو ہندستانیوں کی بھرتی کو نہ ہی ہندستان میں چندہ جمع کرنے کی مہم کو رضاکارانہ امداد سمجھا جاسکتا ہے۔ کانگریسی لوگ، یا وہ لوگ جو کانگریس کے زیر اثر ہیں، اپنے آدمیوں یا سرمائے یا سامان سے جنگ کو جاری رکھنے میں مدد نہیں کر سکتے۔

اس قرارداد کے ذریعہ، کانگریس ایک بار پھر یہ بتا دینا چاہتی ہے کہ مکمل آزادی سے کم، کوئی بھی بات ہندستان کے عوام کے لیے قابلِ قبول نہ ہوگی۔ ہندستانی آزادی امپیریلیزم کے حلقے میں اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتی، اور شہنشاہی ڈھانچے کے اندر ڈومینیں یا کوئی بھی دوسری حیثیت ہندستان کے لیے کلیتاً ناقابلِ اطلاق ہے، ایک عظیم قوم کے وقار سے مطابقت نہیں رکھتی، اور یہ کئی طریقوں سے ہندستان کو برطانوی پالیسیوں اور اقتصادی ڈھانچے سے باندھ کر رکھ دے گی۔ ہندستان کے عوام ہی، بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر منتخب کی جانے والی دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ، اپنے آئین کو مناسب شکل دے سکتے ہیں، اور دنیا کے دوسرے ملکوں سے اپنے تعلقات کا تعین کر سکتے

ہیں۔

کانگریس یہ رائے بھی رکھتی ہے کہ جہاں وہ ہمیشہ کی طرح، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے حصول کی خاطر کوشاں رہے گی اس کا کوئی مستقل حل نہیں ہے سوائے ایک دستور ساز اسمبلی کے، جس میں حتی الامکان تمام تسلیم شدہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ایک معاہدے کے ذریعے کی جائے گی، جو مختلف اکثریتی اور اقلیتی گروہوں کے منتخب نمائندوں کے مابین ہوگا، یا پھر، اگر یہ معاہدہ کسی نتیجہ خیز نقطے تک نہیں پہنچ سکا تو ثالثوں سے مدد لی جائے گی۔ ہندستان کا آئین آزادی، جمہوریت اور قومی اتحاد پر مبنی ہونا چاہیے، اور کانگریس ہندستان کو تقسیم کرنے یا اس کی قومیت کو منتشر کرنے کی ہر کوشش کو مسترد کرتی ہے۔ کانگریس نے ہمیشہ ایک ایسے آئین کو اپنا نصب العین بنایا ہے جس میں گروہ اور فرد کو مکمل آزادی اور ترقی کے مواقع کی ضمانت دی گئی ہو، اور جس میں سماجی ناانصافیوں کی جگہ ایک زیادہ منصفانہ سماجی نظام کو قبولیت دی جائے۔

ڈاکٹر راجندر پرساد سے صدارت کا چارج لینے کے بعد، میرے ابتدائی اقدامات میں سے ایک یہ تھا کہ ورکنگ کمیٹی کو از سر نو تشکیل دیا جائے۔ دس اراکین (نئی اور پرانی کمیٹی میں) مشترک تھے جن کے نام یہ ہیں:

شریمتی سروجنی نائڈو،
سردار ولبھ بھائی پٹیل،
سیٹھ جمنا لال بجاج (خازن)،
شری جے۔ بی۔ کرپلانی (جنرل سکریٹری)،

خان عبدالغفار خاں،
شری بھولا بھائی ڈیسائی،
شری شنکر راؤ دیو،
ڈاکٹر پرفل چندر گھوش،
ڈاکٹر راجندر پرساد اور خود میں،

ڈاکٹر راجندر پرساد کی کمیٹی میں ایک نمایاں نام جو غائب تھا، جواہر لال نہرو کا تھا۔ میں انھیں واپس لایا اور شری سی۔ راجگوپال آچاری، ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر آصف علی کا بھی اضافہ کیا۔

ایک پندرھویں نام کا اعلان بعد کو کیا جاتا تھا، لیکن کانگریس کے اجلاس کے فوراً بعد ہم گرفتار کر لیے گئے اور وہ جگہ مدت تک خالی پڑی رہی۔

کانگریس کی تاریخ میں یہ ایک بہت اندیشہ ناک وقت تھا۔ ہم باہر کے، دنیا کو متزلزل کر دینے والے واقعات سے متاثر ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ پریشان کن ہمارے باہمی اختلافات تھے۔ میں کانگریس کا صدر تھا اور چاہتا تھا کہ اگر ہندستان آزاد ہو جائے، تو اسے جمہوریتوں کے کیمپ میں شامل کرا دوں۔ ایک مقصد جس کا ہندستان کو بہت شدید احساس تھا، جمہوریت تھی۔ ہمارے راستے کی اکیلی رکاوٹ ہندستان کی غلامی تھی۔ گاندھی جی، بہرحال، یہ خیال نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے لیے اصل مسئلہ امن کا تھا، ہندستان کی آزادی کا نہیں۔ میں نے کھلے عام یہ کہا کہ انڈین نیشنل کانگریس امن کی کوئی تنظیم نہیں ہے بلکہ ہندستان کی آزادی کو حاصل کرنے کا ایک آلۂ کار ہے ——— چنانچہ گاندھی جی کا اٹھایا ہوا سوال میرے نزدیک بے معنی تھا۔

مگر، بہرنوع، گاندھی جی اپنے خیالات بدل نہیں سکتے تھے۔ ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہندستان کو جنگ سے الگ رہنا چاہیے۔ وہ وائسرائے سے ملے اور ان کے سامنے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا۔ برطانوی عوام کے نام انھوں نے ایک کھلا خط بھی

لکھا جس میں ان سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ انھیں ہٹلر سے لڑنا نہیں چاہیے بلکہ رُوحانی طاقت کے ذریعہ اس کی مخالفت کرنی چاہیے۔ یہ واقعہ تمام تر حیران کن نہیں کہ برطانوی دلوں پر گاندھی جی کی اپیل کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ اس وقت تک فرانس پہلے ہی مات کھا چکا تھا اور جرمنی کی طاقت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔

یہ وقت گاندھی جی کے لیے بہت مشکل تھا۔ گاندھی جی نے دیکھ لیا کہ جنگ دُنیا کو تباہ کیے دیتی تھی اور وہ اسے بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس درجہ مایوس تھے کہ، کئی موقعوں پر انھوں نے خودکشی تک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ——— انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر وہ جنگ کی لائی ہوئی صعوبتوں کو ختم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تو کم سے کم اپنے ہاتھوں اپنی جان لے کر اس صورتِ حال کا گواہ بننے سے انکار تو کر سکتے ہیں۔ انھوں نے بار بار مجھ پر دباؤ ڈالا کہ ان کے خیالات کی حمایت کروں ——— میں نے بہت گہرائی سے اس مسئلے پر غور کیا لیکن اپنے آپ کو قائل نہ کر سکا۔ میرے لیے عدم تشدد پالیسی کا معاملہ تھا، مسلک کا نہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہندستانی، حسبِ منشا، ہاتھ میں تلوار اٹھانے کا حق رکھتے ہیں، لیکن ملک میں اُس وقت جو حالات موجود تھے، ان کے پیشِ نظر گاندھی جی کا طریقہ درست تھا۔ عدم تشدد کے ذریعے ہمارا لڑنے کا فیصلہ، اسی لیے، حالات کے دباؤ کا نتیجہ تھا۔ میرے، یا دوسرے بہت سے ہندستانیوں کے لیے، یہ معاملہ عقیدے (یا مسلک) کا نہیں تھا ——— اگر آزادی لڑائی کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی، تو بے شک ہم لڑائی میں شریک ہو جاتے۔

اس بنیادی مسئلے پر بھی کانگریس ورکنگ کمیٹی میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا۔ ابتدائی مراحل میں پنڈت نہرو، سردار پٹیل، شری راجگوپال آچاری اور خان عبدالغفار خاں نے میری حمایت کی ——— ڈاکٹر راجندر پرساد، آچاریہ کرپلانی اور شری شنکر راؤ دیو، بہرحال، دل وجان سے گاندھی جی کے ساتھ تھے۔ وہ ان سے اس امر پر متفق تھے کہ ایک بار اگر یہ مان لیا جائے کہ آزاد ہندستان جنگ میں شریک ہو سکتا تھا، تو پھر آزادی کے لیے ہندستان کی پُرامن جدوجہد کی بنیاد ہی ڈھا ہو جائے گی۔ دوسری طرف، میں یہ سمجھتا تھا کہ آزادی کی خاطر ایک اندرونی جدوجہد، اور جارحیت کے خلاف ایک بیرونی جدوجہد، دونوں میں

فرق ہے۔ آزادی کے لیے لڑائی ایک بات تھی۔ ملک کے آزاد ہو جانے کے بعد لڑنا دوسری بات تھی۔ میرا کہنا یہ تھا کہ ہمیں ان دونوں مسئلوں کو ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔

جولائی ۱۹۴۰ء میں، اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے پونا اجلاس میں یہ معاملات فیصلہ کن موڑ تک آن پہنچے۔ کانگریس کے رام گڑھ اجلاس کے بعد یہ ورکنگ کمیٹی کی پہلی میٹنگ تھی —— بحیثیت صدر، میں نے کمیٹی کے سامنے مسئلہ اُس شکل میں پیش کر دیا جس شکل میں مَیں اسے دیکھتا تھا۔ کمیٹی نے میرے خیالات کی تصدیق کی —— چنانچہ، دو قرار دادیں منظور ہوئیں۔ پہلی (قرار داد) میں کانگریس کے اس ایقان کا اعادہ کیا گیا تھا کہ ہندستان کی آزادی پانے کے لیے عدم تشدد کی پالیسی ہی درست ہے اور اسے باقی رکھنا چاہیے۔ دوسری میں یہ کہا گیا تھا کہ نازی ازم اور جمہوریت کے مابین جنگ میں ہندستان کی صحیح جگہ جمہوری کیمپ میں تھی۔ بہر حال جب تک کہ وہ خود آزاد نہ ہو جائے، وہ جمہوریتوں کی جنگی کوششوں میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ قرار دادیں، بالآخر جس شکل میں منظور کی گئیں، وہ میرے ڈرافٹ پر مبنی تھیں۔

جب وہ قرار داد، جس میں عدم تشدد کو ہندستان کی جدوجہد آزادی کی بنیاد کہا گیا تھا، منظور ہوا تو گاندھی جی بہت خوش ہوئے۔ جنگ کی طرف میرے رویّے کی روشنی میں، ایسا لگتا ہے کہ گاندھی جی کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اے۔ آئی۔ سی۔ سی، کانگریس کی عدم تشدد کی پالیسی سے کہیں دستبردار نہ ہو جائے —— مبارکباد کے ایک ٹیلی گرام میں جو انھوں نے مجھے بھیجا، اس میں یہ کہا کہ انھیں اس بات کی خوشی خاص طور پر ہے کہ میں نے اندرونی جدوجہد میں عدم تشدد کے مقصد کی وکالت کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کے موجودہ مزاج کو دیکھتے ہوئے، اے۔ آئی۔ سی۔ سی، میری اس تجویز کو فوراً مان لے گی کہ اگر ہندستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا تو پھر اسے جنگ میں شریک ہو جانا چاہیے۔ اس کے پیشِ نظر انھیں شک تھا کہ میں اے۔ آئی۔ سی۔ سی کو اپنی اندرونی جدوجہد کے سلسلے میں، عدم تشدد پر قرار داد کی منظوری کے لیے آمادہ نہ کر سکوں گا۔

بہر حال، ورکنگ کمیٹی کے اراکین، جنگ کی طرف اپنے رویّے کے سلسلے میں، تذبذب کا شکار ہونے لگے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ بھول نہیں پا رہا تھا کہ گاندھی جی، اصولی طور پر، جنگ میں

کسی بھی طرح کی شرکت کے خلاف ہیں۔ نہ ہی وہ یہ بھول سکتے تھے کہ ہندستان کی جدّوجہدِ آزادی میں، اپنی موجودہ جنھیں گاندھی جی ہی کی قیادت میں حاصل کی ہیں۔ اب وہ پہلی بار ایک بنیادی مسئلے پر گاندھی جی سے اختلاف کر رہے تھے اور انھیں تنہا چھوڑ رہے تھے۔ عدم تشدد میں، ایک مسلک کے طور پر گاندھی جی کا پختہ یقین، اُن لوگوں کے فیصلے پر اثر انداز ہونے لگا ——— پونا اجلاس کے ایک مہینے کے اندر سردار پٹیل نے اپنے خیالات بدل لیے اور گاندھی جی کا موقف اپنا لیا۔ دوسرے اراکین بھی پس و پیش میں پڑ گئے۔

جولائی ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر راجندر پرساد اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے کئی اراکین نے مجھے لکھا کہ جنگ کی بابت گاندھی جی کے خیالات میں وہ پختہ یقین رکھتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ کانگریس انہی خیالات پر عمل پیرا رہے ——— انھوں نے یہ بھی کہا کہ چونکہ میرے خیالات مختلف تھے اور اے۔ آئی۔ سی۔ سی نے پونا میں میری حمایت کی تھی، اس لیے ان دستخط کنندگان کو شک تھا کہ اب وہ اپنی ورکنگ کمیٹی کے اراکین کی حیثیت کو بدستور باقی رہ سکتے ہیں۔ ورکنگ کمیٹی میں ان کی نامزدگی، صدر کے ساتھ تعاون کے لیے کی گئی تھی، لیکن اب چونکہ ایک بنیادی مسئلے پر ان کو اختلاف ہو چلا تھا، اس لیے اب کوئی صورت، سوائے اس کے نہیں رہ گئی تھی کہ وہ استعفیٰ دے دیں ——— انھوں نے اس مسئلے پر گہرائی سے سوچ بچار کیا تھا اور اس خیال سے کہ مجھے خفت کا احساس نہ ہو، وہ اُس وقت تک ورکنگ کمیٹی کے اراکین کی حیثیت سے کام کرتے رہنے پر تیار تھے، جب تک کہ اُن کے اختلافات کا کوئی فوری اطلاق عملاً درکار نہ ہو۔ تاہم، اگر برطانوی حکومت نے میری شرطیں قبول کر لیں اور جنگ میں شرکت کا سوال سچ مچ سامنے آ گیا، تو وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے پاس استعفیٰ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ اگر مجھے یہ صورتِ حال منظور ہو تو وہ ورکنگ کمیٹی کے اراکین کی حیثیت سے کام کرتے رہنے پر آمادہ ہیں ——— بصورتِ دیگر، اسی خط کو اُن کا استعفیٰ نامہ بھی سمجھ لیا جائے۔

مجھے اس خط کو پا کر شدید تکلیف پہنچی جس پر جواہر لال اور راجہ جی کو چھوڑ کر ورکنگ کمیٹی کے سبھی اراکین نے دستخط کیے تھے۔ یہاں تک کہ خان عبدالغفار خاں نے بھی، جو پہلے

میرے سب سے پُرجوش حمایتیوں میں شامل تھے، اب اپنے خیالات تبدیل کر لیے تھے۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی جانب سے ایسے کسی خط کی توقع نہیں تھی —— میں نے جواب میں فوراً یہ لکھا کہ میں پوری طرح اُن کے نقطۂ نظر کو سمجھتا ہوں اور ان کے موقف کو قبول کرتا ہوں۔ برطانوی حکومت کے موجودہ رویے کی روشنی میں، ہندستانی آزادی کے تسلیم کیے جانے کی مشکل ہی سے کوئی امید کی جاسکتی تھی۔ جب تک برطانوی رویہ بدلتا نہیں، جنگ میں شرکت کا سوال ایک طرح کا مکتبی مسئلہ ہی بنا رہے گا۔ اس لیے، میں اُن سے درخواست کروں گا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے اراکین کی حیثیت سے کام کرتے رہیں۔

اگست ۱۹۴۰ء میں، وائسرائے نے مجھے، ایک وسیع تر، اور پہلے سے زیادہ اختیارات رکھنے والی مجلسِ منتظمہ کی بنیاد پر، حکومت میں کانگریس کی شمولیت کے بارے میں گفتگو کے لیے مدعو کیا۔ اپنے ساتھیوں سے مشورہ تک کیے بغیر، میں نے یہ پیشکش نامنظور کر دی۔ مجھے ایسا لگا کہ کانگریس کے مطالبۂ آزادی اور وائسرائے کی مجلسِ منتظمہ میں اضافے کی پیشکش کے مابین کوئی مشترک بنیاد نہیں ہے۔ اس واقعے کے پیشِ نظر، وائسرائے سے ملاقات کا کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ بہت سے کانگریسی میرے فیصلے سے متفق نہیں ہیں۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ مجھے یہ دعوت قبول کرنی چاہیے تھی اور وائسرائے سے ملنا چاہیے تھا، لیکن مجھے پہلے بھی یقین تھا اور آج بھی ہے کہ میں نے صحیح فیصلہ کیا تھا۔

اس واقعے پر گاندھی جی کا ردِعمل، کانگریسیوں کی اکثریت کے ردِعمل سے خاصا مختلف تھا۔ انھوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں میرے فیصلے کی پوری تائید کی گئی تھی۔ ان کے خیال میں وائسرائے سے ملاقات کرنے سے میرا انکار ایک عطیۂ غیبی کی علامت تھا۔ خدا کو یہ منظور نہیں تھا کہ ہندستان اس جنگ میں شریک ہو۔ گاندھی جی کے نزدیک، یہی وہ وجہ تھی جس کی بنا پر میں نے وائسرائے سے ملنے سے انکار کر دیا —— اس طرح یہ قصہ ختم ہو گیا، لیکن اگر، اس کے برعکس، میں نے وائسرائے سے ملاقات کر لی ہوتی، تو گاندھی جی کو ڈر تھا کہ ایک سمجھوتہ ہو گیا ہوتا اور ہندستان جنگ میں ملوّث ہو جاتا۔

اس کے فوراً بعد گاندھی جی نے انگریزوں کے نام ایک اور اپیل جاری کی۔ انھوں نے

پھر یہ درخواست کی کہ وہ اسلحوں سے دستبردار ہو جائیں اور ہٹلر کا مقابلہ روحانی طاقت کے بل پر کریں ——— برطانوی عوام کے نام اس خط کو کافی نہ سمجھتے ہوئے، گاندھی جی لارڈ لنلتھگو سے بھی ملے اور ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ ان کا (گاندھی جی) کا نقطۂ نظر قبول کر لیں اور اسے برطانوی حکومت کو بھی پہنچا دیں۔

جب گاندھی جی نے لارڈ لنلتھگو سے یہ کہا کہ برطانوی عوام کو ہتھیار چھوڑ کر روحانی طاقت کے ساتھ ہٹلر کی مخالفت کرنی چاہیے تو لارڈ لنلتھگو اس مشورے پر جسے وہ غیر معمولی سمجھتے تھے، بھونچکے رہ گئے۔ ان کا عام معمول یہ تھا کہ وہ گھنٹی بجا کر ایک اے۔ڈی سی کو بلاتے تھے جو (رخصت ہوتے وقت) گاندھی جی کو کار تک پہنچاتا تھا۔ اس موقعے پر وہ اتنے حیران ہوئے کہ نہ تو گھنٹی بجائی، نہ الوداع کہی ——— نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی ایک خاموش اور حیرت زدہ وائسرائے کو چھوڑ کر باہر نکلے اور اپنی کار تک کا راستہ خود ہی تلاش کیا۔ گاندھی جی نے مجھ سے اس واقعے کا ذکر اپنے مخصوص مزاح کے ساتھ کیا۔

کانگریس میں اندرونی بحث جاری رہی ——— جہاں تک گاندھی جی کا تعلق ہے، کانگریس کو کسی بھی حالت میں جنگ میں شریک نہیں ہونا تھا۔ میں نے اس حد تک اُن سے اتفاق کیا کہ موجودہ حالات میں ہندستان جنگ میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے بنیادی رویوں میں جہاں ہم ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے، وہیں اس امر پر ہمارا اتفاق بھی تھا کہ موجودہ صورت حال میں، ہندستان کو انگریزوں کے تئیں اپنا تمام تعاون روک لینا چاہیے۔ چنانچہ میری پالیسی اور گاندھی جی کے مسلک میں تصادم محض اصولی نوعیت کا رہا۔ انگریزوں کے رویے نے ہمیں عمل (کے میدان) میں متحد کر دیا گرچہ ہمارے بنیادی رویے ایک دوسرے سے مختلف رہے۔

اب سوال یہ اٹھا کہ موجودہ سیاق میں کانگریس کو کرنا کیا چاہیے۔ ایک سیاسی تنظیم کے طور پر، وہ خاموش تو نہیں بیٹھ سکتی تھی، جبکہ ساری دنیا میں ہولناک واقعات رونما ہو رہے تھے۔ پہلے پہل، گاندھی جی کسی بھی طرح کی تحریک کے مخالف تھے، کیونکہ تحریک ہندستانی آزادی کے مسئلے کو لے کر ہی ممکن تھی، اور اس میں یہ رمز بھی چھپا ہوا تھا کہ ایک بار آزادی

مل گئی تو ہندستان جنگ میں شریک ہو جائے گا۔ دہلی اور پونا کی میٹنگوں کے بعد، جب انگریزوں نے کانگریس کی تعاون کی پیشکش ٹھکرادی، تو گاندھی جی نے سول نافرمانی کی ایک محدود تحریک کے بارے میں سوچا۔ انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ مردوں اور عورتوں کو، ہندستان کے جنگ میں کھینچے جانے کے خلاف، انفرادی طور پر احتجاج کرنا چاہیے۔ وہ کھلے عام، جنگی کوششوں سے اپنے آپ کو لاتعلق رکھیں گے اور اپنی گرفتاری کی پیش کش کریں گے۔ میں یہ سوچتا تھا کہ جنگ کے خلاف تحریک اس سے بڑے پیمانے پر اور زیادہ سرگرم ہونی چاہیے، لیکن گاندھی جی راضی نہیں ہوئے۔ چونکہ وہ اس سے آگے جانے پر آمادہ نہیں تھے، آخر کار میں نے یہ بات مان لی کہ کم سے کم انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہو جانی چاہیے۔

چنانچہ ونوبا بھاوے کو، پہلے انفرادی ستیہ گرہی اور جنگ کے غیر مسلح مخالف کی حیثیت سے منتخب کیا گیا —— بھاوے کے بعد، دوسرے رضاکار کے طور پر پنڈت نہرو نے اپنے آپ کو پیش کیا اور گاندھی جی نے یہ پیشکش قبول کرلی۔ پھر بہت سے دوسرے لوگ آتے گئے اور جلد ہی انفرادی ستیہ گرہ کی ایک ملک گیر تحریک چل نکلی۔ اس (تحریک) کا ماحصل یہ تھا کہ گرچہ عدم تشدد کی طرف اپنے رویے میں، مجھے گاندھی جی سے شدید اختلاف تھا، لیکن جو پروگرام واقعتاً عمل میں آیا، وہ ایسا تھا جس پر ہم دونوں متفق تھے۔

کبھی کبھار اس طرح کی انفرادی ستیہ گرہ میں ایک مضحک پہلو بھی نکل آتا تھا —— پنجاب کا ایک کارکن تھا جس نے گاندھی جی یا ورکنگ کمیٹی کی اجازت حاصل کیے بغیر ستیہ گرہ کی پیشکش کی۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو کانگریس کی واضح ہدایات کے برخلاف، اس نے اپنا دفاع پیش کیا۔ مقدمے کی سماعت کرنے والے مجسٹریٹ نے سزا کے طور پر ایک آنے (کی رقم) کا جرمانہ عاید کیا اور اپنی ہی جیب سے ادائیگی کر کے اُسے چھوڑ دیا —— اس سے پنجاب میں تحریک کی ایسی ہنسی اڑی کہ معاملات کی درستگی کے لیے مجھے وہاں جانا پڑا۔ واپس آتے ہوئے، الٰہ آباد میں مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ یہ گرفتاری بھی مزاح کے عنصر سے خالی نہیں تھی —— صبح سویرے ایک پیالی چائے کی خاطر میں ریفرشمنٹ کار کی طرف جا رہا تھا۔ اسی وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس نے آداب اور اسی کے ساتھ ایک وارنٹ پیش کیا۔ میں نے متانت سے

جواب دیا: ـــــــ یہ خصوصی امتیاز جو آپ نے مجھے عطا کیا ہے، اُسے میں اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہوں۔ آپ نے مجھے گرفتار کر لیا، اس سے پہلے کہ مجھے انفرادی ستیہ گرہ پیش کرنے کا موقعہ مل جاتا۔

مجھے دو سال قید کی سزا ملی اور مجھے نینی جیل میں رکھا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر کاٹجو بھی وہاں میرے پاس ہی آ گئے۔ ہم نے، بہر حال، سزا کی مدت پوری نہیں کی، کیونکہ دنیا کو ہلا کر رکھ دینے والے دو اہم واقعات نے جلد ہی جنگ کا پورا مزاج تبدیل کر دیا۔ ان میں پہلا (واقعہ) جون ۱۹۴۱ء میں سوویت روس پر جرمنی کا حملہ تھا۔ پھر چھ مہینے کے اندر پرل ہاربر کے مقام پر جاپان نے یو۔ ایس۔ اے (امریکہ) کو نشانہ بنایا۔

سوویت روس پر جرمنی کے اور یو، ایس، اے پر جاپان کے حملے نے اس نے جنگ کو سچ مچ عالمی بنا دیا۔ سوویت روس پر جرمن حملے سے پہلے، یہ جنگ بس مغربی یورپین ملکوں کے مابین تھی ـــــــ جرمن حملے نے جنگ کے محاذوں کو پھیلا کر ایسے وسیع علاقوں تک پہنچا دیا جو ابھی بچے ہوئے تھے۔ یو، ایس، اے، یونائیٹڈ کنگڈم (برطانیہ) کو اچھی خاصی امداد دے رہا تھا لیکن اب تک خود جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ امریکی برِّاعظم کو ابھی کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پرل ہاربر پر جاپان کے حملے نے یو، ایس، اے کو بھی اس طوفان میں کھینچ لیا اور جنگ صحیح معنوں میں عالمی ہو گئی۔

ابتدائی منزلوں میں جاپان کی حیران کن کامیابی جنگ کو ہندستان کے عین دروازے تک لے آئی ـــــــ چند ہفتوں کے اندر، جاپان نے ملایا اور سنگاپور پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ جلد ہی برما پر، جو، ۱۹۳۰ء سے پہلے ہندستان کا ہی ایک حصّہ تھا، قبضہ ہو گیا۔ ایک ایسی صورت حال پیدا کی گئی جس میں صاف نظر آتا تھا کہ خود ہندستان پر بھی حملہ کر دیا جائے گا۔ جاپانی جہاز خلیج بنگال میں پہلے ہی دکھائی دے چکے تھے اور جلد ہی جزائر انڈمان اور نکوبار جاپانی بحریہ کی گرفت میں آ گئے۔

(جنگ میں) جاپان کی شمولیت کے ساتھ یو، ایس، اے کو جنگ کی براہ راست ذمے داری کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے یہ وقت آنے سے پہلے ہی انگریزوں کو مشورہ دیا تھا کہ انھیں

ہندستان سے مفاہمت کر لینی چاہیے۔ اب اُس نے برطانیہ پر اور زیادہ دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ہندستانی مسئلے کو حل کرے اور ہندستان کا رضامندانہ تعاون حاصل کرے۔ گو کہ اس وقت یہ بات معلوم نہیں ہوسکی، لیکن صدر روز ویلیٹ نے پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے فوراً بعد، برطانوی حکومت سے درخواست کی تھی کہ ہندستانی لیڈروں سے مصالحت کر لینی چاہیے۔ ہندستان کی حکومت، ان درخواستوں کو تمام وکمال نظر انداز نہیں کر سکتی تھی اور ایک خاص نقطے تک اس نے اپنی پالیسی کو بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔

دسمبر ۱۹۴۱ء میں وائسرائے نے طے کیا کہ جواہر لال کو اور مجھ کو رہا کر دیا جانا چاہیے۔ یہ فیصلہ جنگ کی بدلی ہوئی صورتِ حال پر کانگریس کے ردِ عمل کو پرکھنے کی نیت سے کیا گیا تھا۔ سرکار ہمارے ردِ عمل کو دیکھنا چاہتی تھی اور اس کے بعد یہ طے کرنا چاہتی تھی کہ کیا دوسروں کو بھی آزاد کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی صورت میں، میری رہائی ضروری تھی کیونکہ جب تک مجھے آزاد نہ کیا جاتا، ورکنگ کمیٹی کی کوئی میٹنگ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

میں ذہنی اذیت کی ایک کیفیت میں مبتلا تھا۔ جس وقت رہائی کا پروانہ مجھ تک پہنچا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب مجھے آزاد کیا گیا تو مجھے ایک طرح کی تضحیک کا احساس ہوا۔ پچھلے تمام مواقع پر، جیل سے رہائی اپنے ساتھ جزوی کامیابی کا ایک احساس لے کر آتی تھی۔ اس بار میں نے شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ اگرچہ جنگ کو جاری ہوئے دو برس سے کچھ اوپر ہو چکے ہیں، ہم ہندستانی آزادی کو حاصل کرنے کے لیے کوئی موثر قدم نہیں اٹھا سکے۔ ہم اپنی تقدیر کے مالک نہیں، بلکہ حالات کے شکار معلوم ہوتے تھے۔

اپنی رہائی کے فوراً بعد میں نے باردولی کے مقام پر ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ طلب کی۔ گاندھی جی وہیں مقیم تھے اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ یہ میٹنگ وہیں رکھی جائے۔ میں ان سے ملاقات کے لیے گیا اور فوراً یہ محسوس کر لیا کہ ہم دونوں میں مزید فاصلہ بڑھ چکا ہے۔ اس سے پہلے، ہم نے صرف اصول کے سوال پر ایک دوسرے سے اختلاف کیا تھا، لیکن اب ایک اور بنیادی اختلاف، صورتِ حال کے اُن کے تجربے اور میرے تجربے میں پیدا ہو چکا تھا ——— لگتا تھا، گاندھی جی کو یہ یقین ہو چلا ہے کہ برطانوی حکومت ہندستان کو آزاد

تسلیم کرنے پر آمادہ اور رضامند ہوگئی ہے، اگر ہندوستان جنگی کوششوں میں اپنے پورے تعاون کی پیش کش کر سکے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ گرچہ حکومت پر غلبہ قدامت پسندوں کا ہے اور مسٹر چرچل وزیر اعظم ہیں، لیکن جنگ ایک ایسی منزل پر پہنچ گئی ہے، جہاں انگریزوں کے پاس تعاون کی قیمت کے طور پر ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ میرا اپنا جائزہ بالکل مختلف تھا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ برطانوی حکومت ہمارے تعاون کے لیے خلوص کے ساتھ مضطرب ہے، لیکن تا حال وہ ہندوستان کو آزاد تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ برطانوی حکومت زیادہ سے زیادہ جو کر سکتی ہے، یہ ہوگا کہ وسیع تر اختیارات کے ساتھ ایک نئی مجلس منتظمہ کی تشکیل کر دے اور اس میں کانگریس کو مناسب نمائندگی دے دے ——— اس مسئلے پر ہم نے طویل بحثیں کیں لیکن میں گاندھی جی کو قائل کرنے میں ناکام رہا۔

رہائی کے جلدی ہی بعد، میں نے کلکتے میں ایک پریس کانفرنس کی۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا کانگریس جنگ کی طرف اپنی پالیسی بدلنے پر رضامند ہے، تو میں نے جواب دیا کہ اس کا انحصار برطانوی حکومت کے رویّے پر ہے۔ اگر حکومت اپنا رویّہ بدلے گی تو کانگریس بھی بدل لے گی ——— میں نے یہ بات واضح کر دی کہ جنگ کی طرف کانگریس کا رویّہ کسی ایسے عقیدے کا مزاج نہیں رکھتا جو تغیّر سے بری ہو ——— پھر مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ اگر جاپان ہندوستان پر حملہ کر دے تو ہندوستانیوں کو کیا کرنا چاہیے۔ میں نے ایک لمحے کی جھجک کے بغیر جواب دیا کہ ملک کے دفاع کی خاطر تمام ہندوستانیوں کو تلوار اٹھا لینی چاہیے ——— میں نے مزید کہا: ہم یہ اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب وہ زنجیریں جنھوں نے ہمارے ہاتھوں اور پیروں کو جکڑ رکھا ہے، ہٹا دی جائیں ——— ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے ہوں تو ہم لڑ کیسے سکتے ہیں؟

لندن کے ڈیلی نیوز DAILY NEWS اور دی ٹائمز THE TIMES نے اس انٹرویو پر تبصرہ کیا اور کہا کہ اس سے گاندھی جی اور کانگریس لیڈر شپ کی رایوں میں اختلاف کا پتہ چلتا ہے ——— گاندھی جی نے جنگ کی طرف ایک ناقابلِ تغیّر رویّہ اختیار کر لیا تھا،

جس نے مذاکرات کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی تھی۔ اس کے برخلاف، میرے بیان میں ایک سمجھوتے کی امید موجود تھی۔

جب ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو گاندھی جی نے برطانیہ کے اخباری تبصرہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے یہ بات تسلیم کی کہ تبصرے ایک حد تک ان پر اثر انداز ہوئے ہیں اور ان کے اس ایقان کو تقویت پہنچائی ہے کہ اگر جنگ میں کانگریس تعاون کی پیشکش کرے تو برطانوی حکومت اپنا رویہ تبدیل کرنے پر رضامند ہو جائے گی ——— اس سوال پر کہ کانگریس کا رویہ کیا ہونا چاہیے، دو روز تک بحث جاری رہی لیکن کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہو سکا۔ گاندھی جی اپنے اس خیال پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے کہ عدم تشدد ایک مسلک ہے اور کسی بھی حالت میں اس سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے ——— نتیجتاً، اُن کے لیے کسی بھی صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ جنگ میں ہندستان کی شرکت کو تسلیم کر لیں۔ میں نے اپنا پچھلا خیال دوہرا دیا کہ کانگریس کو زیادہ زور ہندستان کی آزادی پر دینا چاہیے ——— نہ کہ ایک مسلک کی حیثیت سے عدم تشدد پر۔

مشکل ترین مسائل کا حل ڈھونڈ نکالنے کی، گاندھی جی میں جو حیرت انگیز استعداد تھی، اس کی نمایاں تصدیق اس واقعے سے ہوتی ہے کہ اس اندھی گلی سے نکلنے کا ایک فارمولہ بھی گاندھی جی نے نکال لیا، جو دونوں متخالف نقاطِ نظر کے لیے اطمینان بخش ہو سکتا تھا۔ اُن میں اپنے خلاف جانے والے نقطۂ نظر کی منصفانہ ترجمانی اور تفہیم کی بھی ایک عجیب و غریب صلاحیت تھی ——— جب انھوں نے جنگ میں ہندستان کی شرکت کے سوال پر، میرے بے لوچ رویے کو دیکھا تو انھوں نے مجھ پر اُسے بدلنے کے لیے مزید دباؤ نہیں ڈالا۔ اس کے برعکس، انھوں نے ورکنگ کمیٹی کے سامنے ایک قرارداد پیش کر دی جو دیانت داری کے ساتھ میرے نقطۂ نظر کی ترجمان تھی۔

جلدی ہی ہندستان کی سیاسی صورت حال میں ایک اور اہم تبدیلی ہوئی۔ جنگ چھڑتے ہی سبھاش چندر بوس نے ایک مہم کا آغاز کیا جس کا مقصد جنگی کوششوں کی سرگرم مخالفت تھا۔ ان کی سرگرمیوں نے انھیں جیل پہنچا دیا لیکن انھوں نے (بطور احتجاج)

فاقہ شروع کر دیا تو وہ رہا کر دیے گئے ــــــــــ ۲۶ جنوری ۱۹۴۱ء کو یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے ہندستان چھوڑ دیا ہے۔ ایک سال سے زیادہ عرصے تک ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں سنا گیا اور لوگوں کو یقین نہیں تھا کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں ــــــــــ مارچ ۱۹۴۲ء میں ایسے تمام شبہات دور ہو گئے جب ان کی ایک تقریر برلن ریڈیو سے سُنی گئی۔ اب یہ صاف تھا کہ وہ جرمنی پہنچ چکے ہیں اور وہیں سے انگریزوں کے خلاف ایک مورچہ قائم کرنے کی کوشش میں ہیں ــــــــــ اسی دوران میں ہندستان پر انگریزی تسلط کے خلاف جاپانی پروپیگنڈے نے ایک نئی شدت اختیار کر لی۔ جرمنی اور جاپان سے اس پروپیگنڈے کے نتیجے نے ہندستان میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ بہت سے لوگ جاپان کی طرف سے وعدوں میں کشش محسوس کرنے لگے اور یہ سمجھنے لگے کہ جاپان ہندستان کی آزادی اور ایشیا کے استحکام کے لیے سرگرم ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ چونکہ جاپانی حملے نے برطانوی اقتدار کو کمزور کر دیا ہے، اس سے ہماری جدّ و جہدِ آزادی کو مدد ملی ہے اور ہمیں صورت حال کا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے ــــــــــ اسی لیے، ملک میں اس خیال کے لوگوں کا ایک حلقہ بن گیا جس کی ہمدردیاں بتدریج، جاپان کے ساتھ بڑھتی گئیں۔

ایک اور نقطہ بھی تھا جس پر صورت حال کے میرے جائزے اور گاندھی جی کے جائزے میں فرق تھا۔ گاندھی جی اب اس خیال کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوتے جا رہے تھے کہ اتحادی یہ جنگ نہیں جیت سکتے۔ انھیں ڈر تھا کہ اس کا نتیجہ جرمنی اور جاپان کی فتح کے طور پر سامنے آ سکتا ہے یا بہتر سے بہتر بات یہ ہو سکتی ہے کہ جمود کی ایک فضا پیدا ہو جائے۔

جنگ کے انجام کی بابت گاندھی جی نے اپنی رائے کا اظہار واضح لفظوں میں نہیں کیا، لیکن ان سے بات چیت کے دوران مجھے یہ احساس ہوا کہ اتحادیوں کی کامیابی کے سلسلے میں ان کا شک زیادہ سے زیادہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ سبھاش بوس کے، بچ کر جرمنی نکل جانے نے بھی گاندھی جی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ انھوں نے اس سے پہلے سبھاش بوس کی بہت سی سرگرمیوں کو پسند نہیں کیا تھا، لیکن اب مجھے اُن

کے خیالات میں ایک تبدیلی نظر آرہی تھی۔ ان کی بہت سی باتوں نے مجھے یقین دلادیا کہ وہ، ہندستان سے بھاگ نکلنے میں سبھاش بوس نے جس ہمت اور سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا ہے، اسے تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سبھاش بوس کے لیے ان کی اس قدر شناسی نے، غیر شعوری طور پر، جنگ کی پوری صورت حال کے سلسلے میں ان کے خیال کو ایک نیا رنگ دے دیا۔

یہ پسندیدگی بھی اُن اسباب میں شامل تھی جنھوں نے ہندستان میں کرپس مشن کے دوران گفت و شنید پر ایک تکدّر کی کیفیت طاری کردی ——— میں اگلے باب میں اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ کرپس کی لائی ہوئی تجویزوں اور اُن اسباب پر گفتگو کروں گا جن کی وجہ سے ہم نے اُن (تجویزوں) کو مسترد کردیا تھا، لیکن یہاں میں ایک رپورٹ کا ذکر کرنا چاہوں گا جو کرپس کی آمد سے ذرا ہی پہلے گشت کرائی گئی تھی۔ ایک اچانک خبر یہ آئی کہ سبھاش بوس ایک ہوائی حادثے میں ختم ہوگئے ہیں۔ اس نے ہندستان میں سنسنی پھیلادی اور دوسروں کے ساتھ ساتھ گاندھی جی بھی بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے سبھاش بوس کی والدہ کو ایک تعزیتی پیغام بھیجا جس میں ان کے بیٹے کو اور ہندستان کے لیے اُن کے بیٹے کی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین ادا کیا گیا تھا بعد میں پتہ چلا کہ یہ رپورٹ غلط تھی ——— بہرنوع، کرپس نے مجھ سے شکایت کی کہ انھیں گاندھی جی جیسے کسی شخص سے امید نہیں تھی کہ وہ سبھاش بوس کے بارے میں ایسے تعریفی کلمات استعمال کریں گے۔ گاندھی جی عدم تشدد میں پختہ یقین رکھنے والے تھے، جبکہ سبھاش بوس نے کھلم کھلا محوری طاقتوں کا ساتھ دیا تھا اور میدانِ جنگ میں اتحادیوں کی شکست کے لیے ایک زوردار پروپیگنڈا چلا رکھا تھا۔

(۴)

چین کی طرف گریز

میں اس تشویش کی طرف اشارہ کر چکا ہوں جس کا اظہار، پریسیڈنٹ روزویلیٹ نے جنگ میں ہندستان کی رضامندانہ شمولیت کے سلسلے میں کیا تھا۔ جنرلیسیمو چیانگ کائی شیک بار بار اسی خیال کا اعادہ کر رہے تھے۔ مخاصمتوں کے چھڑتے ہی، انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ انگریزوں کو ہندستان سے مفاہمت کر لینی چاہیے اور ان کا یہ اصرار پرل ہاربر پر جاپان کے حملے کے بعد اور بڑھ گیا ——— جاپانی مداخلت کا ایک فطری نتیجہ جنرلیسیمو (چیانگ کائی شیک) اور چینی حکومت کی اہمیت میں اضافہ کرتا تھا۔ یو۔ ایس۔ اے، یو۔ کے، یو۔ ایس۔ ایس۔ آر اور فرانس کی طرح اب چین کا شمار بھی دنیا کی بڑی طاقتوں میں کیا جانے لگا۔ چیانگ کائی شیک نے برطانوی حکومت پر مسلسل یہ دباؤ ڈالا تھا کہ وہ ہندستان کی آزادی کو تسلیم کر لے۔ یہ اُن کا خیال تھا کہ جب تک ہندستان رضامندانہ طور پر جنگ میں شریک نہیں ہو جاتا، اس کی طرف سے وہ مدد نہیں مل سکے گی جس کا وہ اہل ہے۔

جنگ چھڑنے سے کچھ عرصہ پہلے، جواہر لال نے جنوبی چین کا دورہ کیا تھا۔ چیانگ کائی شیک اُن کے میزبان تھے اور اس طرح اُن سے قریبی تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اسی طرح انھوں نے ہندستان کی سیاسی صورت حال کے بارے میں براہِ راست معلومات بھی حاصل کر لی تھیں۔

جواہر لال کے دورے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ چیانگ کائی شیک نے ایک مشن ہندستان کو روانہ کیا اور انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے میرے نام ایک خط لکھا، اپنے خط میں ہندستان کی آرزوؤں کے تئیں انھوں نے پوری ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور ہندستانی فلاح و بہبود کے لیے اپنی فکر مندی بھی ظاہر کی تھی ——— اب انھوں نے فیصلہ کیا کہ خود انھیں، ہندستان آکر وائسرائے اور کانگریسی لیڈروں سے ملاقات کرنی چاہیے، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا مفاہمت کی کوئی راہ نکالی جاسکتی ہے۔ انھیں امید تھی کہ یہ اقدام، جنگی کوششوں سے ہندستان کے قومی رہنماؤں کی وابستگی میں معاون ہوگا۔

میں دہلی میں تھا اور آصف علی کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ فروری ۱۹۴۲ء کے نصف اوّل میں چیانگ کائی شیک ہندستان آنے والے ہیں۔ چند روز بعد مجھے مادام چیانگ کائی شیک کا یہ پیغام موصول ہوا کہ ان کے ساتھ وہ بھی ہوں گی۔ اس کے جلدی ہی بعد حکومت کی طرف سے یہ اعلان جاری کیا گیا کہ جنرلیسیمو اور مادام چیانگ کائی شیک حکومتِ ہند کے مہمانوں کی حیثیت سے دلی آرہے ہیں۔

جنرلیسیمو اور مادام چیانگ کائی شیک ۹ رفروری ۱۹۴۲ء کو دہلی پہنچے۔ ان کی آمد کے دو روز بعد میں اور جواہر لال اُن سے ملنے کے لیے گئے۔ ان سے بات چیت میں ایک دشواری یہ تھی کہ انھیں کوئی بھی غیر ملکی زبان نہیں آتی تھی۔ ایک ترجمان، بے شک ان کے ساتھ تھا، لیکن اس کی وجہ سے ہماری گفتگو فطری طور پر سست رَو اور قدرے رسمی ہوکر رہ گئی تھی۔ جنرلیسیمو نے یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ سہارے کی محتاج قوم، دو میں سے ایک ہی راستے کی مدد سے آزادی حاصل کرسکتی ہے، ایک طویل ابتدائی تقریر کی۔ یا تو وہ تلوار اٹھا لے اور غیر ملکیوں کو اپنے یہاں سے مار بھگائے ——— دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ پُرامن ذرائع سے آزادی حاصل کرسکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آزادی کی سمت رفتار بتدریج ہوگی۔ سیلف گورنمنٹ (سوراج) کی طرف ترقی قدم بہ قدم ہوگی تاآنکہ ہم منزل تک پہنچ جائیں۔ ایک ایسی قوم کے لیے جو کسی غیر ملکی یا قومی آمر کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے، یہی دو طریقے موجود ہیں۔

جنرل لیسیمو نے کہا کہ چین، اس اصول کے معقول ہونے کی روشن مثال ہے۔ چین میں قومی تحریک ۱۹۱۱ء میں شروع ہوئی لیکن آزادی کی منزل تک پہنچنے سے پہلے اسے کئی مرحلوں سے گزرنا پڑا ——— ہندستان کو بھی یہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ فیصلہ بے شک، ہندستانیوں کو ہی کرنا ہوگا کہ وہ اپنے مقصد کا حصول کس طرح کریں گے۔ جنرل لیسیمو کا کہنا یہ تھا کہ اس صورتِ حال کا کوئی اور بدل نہیں ہو سکتا کہ اگر آزادی ایک ضرب میں حاصل نہ ہو تو پھر ہندستان کو تدریجی مراحل کے واسطے سے اس کا حصول کرنا ہوگا ——— اس کے بعد انھوں نے مجھے بتایا کہ اس تمام عرصے میں انھوں نے برطانوی حکومت سے رابطہ بنائے رکھا تھا اور برطانوی وزیر اعظم کو تفصیلی سند لیے بھجوائے تھے۔ انھیں اس کی طرف سے ایک جواب بھی موصول ہوا تھا اور انھیں یقین ہے کہ اگر ہندستانی دانشمندی اور تدبر سے کام لیتے رہے تو جنگ کی صورت حال سے وہ پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد جنرل لیسیمو نے مجھ سے پوچھا: ' ہندستان کا صحیح رشتہ کس سے ہے؟ اس کی جگہ نازی جرمنی کے ساتھ ہے یا جمہوریتوں کے ساتھ؟

مَیں نے جواب دیا: ' مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ اگر ہمارے راستے سے رکاوٹیں ہٹادی جائیں، تو مَیں اس مقصد کے لیے کوئی بھی کوشش باقی نہیں چھوڑوں گا کہ ہندستان جمہوریتوں کے کیمپ میں شامل ہو جائے۔

اس کے بعد جنرل لیسیمو نے خطیبانہ انداز کا ایک سوال پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ بنی نوع انسان کی کثیر آبادیوں کے لیے اس عالمی جنگ میں اصل مسئلہ ایک ہی ہے ——— آزادی یا غلامی ——— ان اونچے داؤوں کے پیشِ نظر کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ کسی طرح کی شرطوں پر اصرار کیے بغیر ہم یو۔ کے۔ اور چین کا ساتھ دیں؟

مَیں نے جواب دیا کہ ہم جمہوری کیمپ میں شامل ہونے کے لیے بے چین ہیں بشرطیکہ ہم آزاد ہوں اور اپنی آزادانہ پسند کے مطابق جمہوریتوں کے ساتھ ہوں۔

جنرل لیسیمو نے دوبارہ کہا کہ جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے، وہ یہ سوچتے ہیں

ڈومینیس اسٹیٹس DOMINION STATUS اور مکمل آزادی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اس سوال پر وہ دیر تک گفتگو کرتے رہے اور کہا کہ اگر برطانوی حکومت ڈومینین اسٹیٹس کے ساتھ خود مختاری کی پیشکش کرتی ہے، تو عقلمندی اس میں ہے کہ ہندستان اسے قبول کرلے ——— انھوں نے یہ بھی کہا کہ انھیں پتہ ہے کہ جواہرلال اُن کے خیال سے متفق نہیں ہیں اور مکمل آزادی چاہتے ہیں، لیکن ہندستان کے ایک خیر خواہ کی حیثیت سے، ان کا مشورہ یہی ہوگا کہ ہمیں کسی ایسی پیشکش کو نامنظور نہیں کرنا چاہیے۔

جواہرلال نے مجھ سے اُردو میں بات کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے اس سوال کا جواب مجھے دینا ہوگا۔

مَیں نے جنرلیسیمو سے کہا کہ اگر برطانوی حکومت ڈومینین اسٹیٹس کی پیش کش کرے گی اور اس پر رضامند ہو جائے گی کہ جنگ کے دوران ہندستانی نمائندے آزادی اور ذمے داری کے ایک احساس کے ساتھ کام کر سکتے ہیں، تو کانگریس اس پیش کش کو نامنظور نہیں کرے گی۔

اس منزل پر مادام چیانگ کائی شیک ہمارے ساتھ شامل ہوگئیں اور ہمیں چائے کی دعوت دی۔ ان کی موجودگی نے گفتگو کو آسان تر کر دیا کیونکہ ان کی تربیت یونائیٹڈ اسٹیٹس میں ہوئی تھی اور وہ پوری روانی کے ساتھ انگریزی بولتی تھیں۔

جنرلیسیمو نے کہا کہ یہ بات ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت کو ہی جنگ کا بار اُٹھانا پڑے گا۔ یہ توقع رکھنا کہ جب تک یہ مخاصمتیں جاری رہتی ہیں، سوفی صد ذمے داری وہ ہندستانیوں کے سپرد کر دیں، معقول نہیں ہوگا۔

مَیں نے جواب دیا کہ جنگ کی مدت تک کے لیے ایک منصوبہ بنایا جا سکتا ہے جو ہندستانی لیڈروں اور برطانوی حکومت دونوں کے لیے قابلِ قبول ہوگا۔ اصل مسئلہ، بہرحال جنگ کے بعد ہندستان کے سوال کو طے کرنے کا ہے۔ برطانوی حکومت ایک بار ابھی یہ جنگ کے بعد ہندستان کی آزادی کا یقین دلا دے، تو ہم سمجھوتا کرلیں گے۔

مادام چیانگ کائی شیک نے مجھ سے دریافت کیا کہ اگر ہماری یہ گفتگو برطانوی حکومت

کی اطلاع میں لائی جائے تو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔

میں نے جواب دیا کہ یہی وہ موقف ہے جس کا اعلان کانگریس کھلے عام کر چکی ہے، اور ہمارے خیالات کسی کو بھی رپورٹ کیے جائیں، اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اس تمام مدت میں جب جنرل لیسیمو چیانگ کائی شیک ہندستان میں رہے --- حکومتِ ہند ایک پریشان کن کیفیت سے دوچار رہی۔ وہ جنرل لیسیمو اور کانگریسی لیڈروں کے مابین اتنے قریبی رابطے پسند نہیں کرتی تھی۔ اس سے ہندستان اور بیرونی ممالک دونوں میں یہ تاثر پیدا ہو سکتا تھا کہ جنرل لیسیمو ہم سے ملنے کے لیے آتے تھے، دوسری طرف، جنرل لیسیمو نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ جنگ کی صورت حال پر صرف وائسرائے اور کمانڈر انِ چیف سے ہی نہیں، بلکہ کانگریسی لیڈروں سے بات چیت کے لیے بھی ہندستان آئے تھے۔ چنانچہ حکومت انھیں ہم سے رابطہ قائم کرنے سے روک نہیں سکی۔

جنرل لیسیمو نے تاج محل دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ حکومت نے ایک سرکاری دورے کا پروگرام بنایا تھا جس میں ان کے ساتھ وہی لوگ ہوں گے جنھیں حکومت نے منتخب کیا ہو۔ لیکن مادام چیانگ کائی شیک نے کہا کہ جواہرلال بھی ان کے ساتھ آگرے تک چلیں ---- چنانچہ وہ بھی اس پارٹی میں شامل ہو گئے۔ حکومتِ ہند نے اس بات کو بھی شدت سے ناپسند کیا تھا۔

دہلی سے جنرل لیسیمو کلکتے گئے۔ حکومتِ بنگال نے یہ انتظام کیا تھا کہ جنرل لیسیمو علی پور کے مقام پر وائسرےگل لاج میں قیام کریں۔ جنرل لیسیمو نے اس کی اطلاع جواہرلال کو دی۔ اور کہا کہ انھیں کلکتے میں ان سے دوبارہ ملنے کی امید ہے ---- جواہرلال کلکتے گئے اور ان کے ساتھ مزید گفتگو کی۔ گاندھی جی اس وقت برلا پارک میں مقیم تھے اور جنرل لیسیمو ان سے ملاقات کے لیے وہاں آئے۔ ان کی یہ ملاقات دو گھنٹے تک جاری رہی جس میں مادام چیانگ کائی شیک ترجمان کے فرائض انجام دیتی رہیں۔ گاندھی جی نے انھیں بتایا کہ کس طرح پہلے پہل جنوبی افریقہ میں انھوں نے ستیہ گرہ شروع کی تھی اور رفتہ رفتہ کس طرح انھوں نے ہندستان کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے تشدد سے عاری عدم تعاون کی تکنیک اختیار کی تھی۔

جنرل لیسیمو کی آمد کے موقعے پر میں کلکتے میں نہیں تھا۔ جواہر لال نے بعد میں مجھے انٹرویو کی بابت بتایا ــــــ اس زمانے میں، جواہر لال ہر معاملے میں گاندھی جی سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گاندھی جی نے جس طریقے سے جنرل لیسیمو کے ساتھ بات چیت کی تھی، اس نے اُن پر بہت اچھا تاثر نہیں ڈالا تھا، اس بیان کو قبول کرنا، میرے لیے، بہر حال مشکل تھا، یہ ممکن ہے کہ جنرل لیسیمو، گاندھی جی کے موقف کے تمام مضمرات کو سمجھ نہ سکے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ گاندھی جی کی دلیلوں سے قائل بھی نہ ہو سکے ہوں، لیکن مجھے اس بات کا یقین تھا کہ وہ مقناطیسی اثر، جو گاندھی جی غیر ملکیوں پر ڈالتے تھے، اس سے جنرل لیسیمو بھی لازمی طور پر متاثر ہوئے ہوں گے۔

رخصت ہونے سے پہلے، جنرل لیسیمو نے برطانیہ عظمیٰ سے پُرزور اپیل کی کہ جتنی جلدی ہو سکے، حقیقی سیاسی اقتدار ہندستان کو دے دیا جائے، مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ وائسرائے یا برطانوی حکومت کو، ہندستانی آزادی کے فوری طور پر تسلیم کیے جانے کی ضرورت کا قائل نہیں کر سکے ہیں۔

۵

کرپس مشن

جیسے جیسے جنگ کا بحران گہرا ہوتا گیا، لوگ یہ توقع کرنے لگے کہ ہندستانی مسئلے کی طرف برطانوی حکومت کے رویے میں ایک تبدیلی آئے گی۔ واقعتاً یہی ہوا اور اس کا نتیجہ ۱۹۴۲ء کا کرپس مشن تھا۔ اس مشن پر گفتگو سے پہلے ایک گزشتہ موقع کی طرف اشارہ ضروری ہے جب جنگ چھڑنے کے فوراً بعد سر سٹیفرڈ کرپس ہندستان آئے تھے۔ اس سفر کے دوران مجھ سے ان کی کافی بات چیت ہوئی —— دراصل، کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دوران انھوں نے کئی دن واردھا میں گزارے۔ جنگی تیاری میں ہندستانی شرکت کا سوال، فطری طور پر، ہماری بات چیت میں بار بار چھڑنے والے موضوعات میں سے ایک تھا۔

اس سفر کے دوران، سر سٹیفرڈ کرپس نے ایک سے زیادہ بار یہ بات کہی کہ جنگ کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات اچھی طرح جانے جاتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ برطانوی حکومت سے مفاہمت کی اُمید مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔ میرے خیالات بھی کافی معروف تھے اور ایسا لگتا تھا کہ گفتگو کے لیے وہ ایک بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں انھیں اس امر کا یقین دلا سکتا ہوں کہ اگر برطانوی حکومت نے ہندستانی آزادی کا مطالبہ منظور کر لیا، تو ہندستانی عوام گاندھی جی کے مقابلے میں میرے خیالات کو قبول کر لیں گے۔ میں نے

انھیں بتایا کہ گرچہ ہم گاندھی جی کا سب سے زیادہ احترام کرتے ہیں اور وہ جو کچھ بھی کہیں اُس پر سب سے زیادہ توجہ کرتے ہیں، لیکن اس خاص مسئلے پر مجھے اطمینان ہے کہ کانگریس اور ملک کی اکثریت میرے ساتھ ہے۔ اس لیے میں انھیں یقین دلا سکتا ہوں کہ اگر ہندستان آزاد ہو جائے تو سارا ملک دل و جان سے جنگ کی حمایت کرے گا۔ انھوں نے یہ بھی پوچھا کہ اگر اس طرح کا کوئی امکان پیدا ہوا تو کیا ہندستان جبری بھرتی کو قبول کرے گا۔ میں نے جواب دیا کہ ہم اس (امکان) کا خیر مقدم کریں گے اور اس بات کا خیال رکھیں گے کہ ہندستانی تنظیم کوشش مکمل ہو۔

سر سٹیفرڈ نے مجھے ایک یادداشت مرتب کر کے بھیجی جس میں انھوں نے ہماری گفتگو کا خلاصہ اور برطانوی حکومت نیز ہندستانی عوام کے مابین ایک سمجھوتے کے لیے اپنی تجویزیں درج کی تھیں۔ ان کے قول کے مطابق، برطانوی حکومت فوری طور پر یہ اعلان کرنے والی تھی کہ مخاصمتوں کے ختم ہوتے ہی، ہندستان کو بغیر کسی تاخیر کے، آزاد قرار دے دیا جائے گا۔ اعلان میں یہ دفعہ بھی شامل ہوگی کہ ہندستان اپنی مرضی کے مطابق یہ طے کرے گا کہ اسے برطانوی دولتِ متحدہ میں شامل رہنا ہے یا نہیں ——— جنگ کی مدت تک کے لیے، مجلسِ منتظمہ کی تشکیل نئے سرے سے کی جائے گی اور اس کے اراکین کا مرتبہ وزیروں کے برابر ہوگا۔ وائسرائے کی حیثیت ایک آئینی سربراہ کی ہوگی۔ اس طرح عملاً یہ اقتدار کی منتقلی ہوگی، لیکن قانونی طور پر یہ منتقلی جنگ کے بعد ہی ممکن ہو سکے گی۔

سر سٹیفرڈ نے اپنی اس تجویز کے بارے میں میرا ردِ عمل دریافت کیا۔ میں نے جواب دیا کہ اتنے اہم مسئلے سے متعلق کسی قیاسی صورتِ حال کے بارے میں، میں حتمی طور پر خود کو اپنی ہی کسی رائے کا پابند نہیں کرنا چاہتا، لیکن میں انھیں یقین دلا سکتا ہوں کہ ایک بار ہندستانی عوام کو یہ یقین آ جائے کہ برطانوی حکومت سچ مچ کچھ کرنا چاہتی ہے تو اپنے اختلاف کو رفع کرنے کی کوئی صورت تلاش کی جا سکتی ہے۔

ہندستان سے سر سٹیفرڈ کرپس، ایک غیر سرکاری مہمان کے طور پر روس گئے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد، انھیں روس کے لیے برطانوی سفیر مقرر کر دیا گیا۔ بعض اوقات یہ کہا

جاتا ہے کہ وہی سوویت روس کو اتحادیوں سے قریب لانے کے ذمے دار تھے۔ بالآخر، جرمنی نے جب روس پر حملہ کیا تو ہٹلر اور اسٹالن کے تعلقات میں اس خرابی کا سہرا بھی بیشتر انہی کے سر باندھا گیا۔ اس (واقعہ) نے انھیں زبردست نیک نامی عطا کی اور برطانوی پبلک زندگی میں اُن کا مرتبہ بہت بڑھ گیا۔ مجھے اس پر شک ہے کہ وہ واقعتاً سوویت پالیسی پر اثر انداز ہوئے ہوں گے، لیکن اصلیت جو بھی رہی ہو، ان کی نیک نامی میں بہت اضافہ ہوا۔ جب وہ یو۔کے۔ ۔۔۔ واپس آئے تو کئی لوگوں نے یہاں تک امید کی کہ حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے وہ مسٹر چرچل کی جگہ بھی لے سکتے ہیں۔

میں اس دباؤ کی طرف پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں جو ہندستانی سوال کو طے کرنے کے لیے، صدر روزولٹ برطانوی حکومت پر ڈال رہے تھے۔ پرل ہاربر کے بعد امریکی رائے عامہ زیادہ سے زیادہ اصرار آمیز ہوتی جا رہی تھی اور مطالبہ کر رہی تھی کہ جنگی تیاری میں ہندستان کا رضامندانہ تعاون ضرور حاصل کیا جانا چاہیے ---------- مسٹر چرچل تک یہ محسوس کرتے تھے کہ اس وقت خیر اندیشی کا اظہار ضروری ہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ایک نیا قدم اٹھائیں گے اور اپنی نئی پالیسی کے ترجمان کی حیثیت سے کرپس کا انتخاب کیا۔

سوویت یونین سے واپسی کے بعد، کرپس کی مقبولیت بہت بلند تھی۔ رائے عامہ کے مطابق، یہ وہ شخص تھا جس نے ماسکو میں زبردست کامیابی کے ساتھ، ایک انتہائی نازک مشن کو سنبھالا تھا۔ اس لیے صاف ظاہر تھا کہ ہندستان کی جانب ایک مشن کے لیے اُن کا انتخاب سب سے زیادہ موزوں تھا۔ علاوہ ازیں، ہندستانی مسئلے میں ان کی دل چسپی پچھلے کئی برسوں سے تھی ---------- میرے پاس اس یقین کے کئی اسباب ہیں کہ ہندستان کے گزشتہ سفر کے دوران، واردھا کے مقام پر انھوں نے جو یادداشت مرتب کی تھی، اسے مسٹر چرچل کے سامنے انہی نے پیش کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ چرچل نے اس یادداشت میں مندرج تجویزیں قبول نہیں کیں لیکن کرپس کا تاثر یہ تھا کہ اسکیم قبول کر لی گئی ہے۔ اسی لیے وہ بڑی مستعدی کے ساتھ ہندستان آنے پر راضی ہو گئے، کیونکہ میرے ساتھ اپنی پچھلی بات چیت کی روشنی میں، وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ کانگریس کے ذریعہ ان کی تجویزوں

کے قبول کر لیے جانے کا بہت کافی امکان ہے۔

کرپس مشن سے متعلق بی، بی سی کے اعلانیے میں حیرت کا ایک عنصر بھی تھا۔ قیاس آرائیوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا تھا، لیکن کسی کو تیقن کے ساتھ یہ بات معلوم نہیں تھی کہ برطانوی حکومت کیا تجویز رکھے گی۔ ہندستان میں یہ اعلانیہ رات کے آٹھ بجے سنا گیا۔ ایک گھنٹے کے اندر، پریس نے میری رائے طلب کی۔ میں نے کہا:

"جب تک کہ توجہ کے ساتھ میں اس کی جانچ پرکھ نہ کر لوں کہ سر سٹیفرڈ کرپس جو پیش کش لے کر آرہے ہیں اس کی صحیح شرطیں کیا ہیں، میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ میں، بہر حال، ان کا خیر مقدم کروں گا، ایک پرانے دوست کی حیثیت سے، اور کوشش کروں گا کہ جہاں تک ہو سکے ان کے خیالات کو قبول کروں۔"

پریس کی جانب سے زبردست دباؤ کے باوجود، میں نے خود کو کچھ اور کہنے سے باز رکھا۔

میں واردھا میں تھا جب وائسرائے نے میرے نام ایک تار بھیجا کہ جنگی کابینہ نے سر سٹیفرڈ کرپس کو ایک مشن پر ہندستان بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھے دلی آنا چاہیے تاکہ ان تجویزوں کے بارے میں بات چیت کر سکوں جنھیں وہ ہندستانی سوال کو طے کرنے کی خاطر اپنے ساتھ لا رہے ہیں ---- میں نے دعوت قبول کر لی اور وائسرائے کو اس کی اطلاع بھی دے دی۔

ہندستان آنے سے پہلے، سر سٹیفرڈ کرپس نے وائسرائے کو لکھا تھا کہ کانگریسی لیڈروں کے ساتھ ساتھ وہ مسلم لیگ کے لیڈروں سے بھی ملاقات کرنا چاہیں گے---- مزید برآں، وہ والیان ریاست کے نمائندوں، ہندو مہاسبھا کے نمائندوں اور خان بہادر اللہ بخش سے بھی ملنا چاہیں گے۔ جو اس وقت سندھ کے وزیر اعلا تھے۔ خان بہادر

اللہ بخش نے نیشنلسٹ مسلمانوں کے کنونشن کی صدارت انجام دینے کے بعد، پچھلے کچھ مہینوں میں اہمیت حاصل کر لی تھی۔ میں اس کانفرنس میں شریک نہیں ہوا تھا، لیکن پردے کے پیچھے رہتے ہوئے، میں نے انتظامات میں مدد کی تھی۔ کانفرنس بہت شاندار طریقے سے ہوئی، اور ہندستان کے تمام علاقوں سے چودہ سو مندوبین شرکت کے لیے دہلی آئے۔ اجلاس اتنا مؤثر تھا کہ انگریزی اور اینگلو انڈین اخبارات نے بھی جو نیشنلسٹ مسلمانوں کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش بالعموم کرتے رہتے تھے، وہ بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکے۔ انھیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا کہ اس کانفرنس نے ثابت کر دیا ہے کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کی حیثیت کسی ناقابلِ لحاظ عنصر کی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اسٹیٹس مین اور ٹائمس آف انڈیا تک نے اس کانفرنس پر ادارتی مقالے لکھے۔

یہ غور کرنا دلچسپ ہوگا کہ برطانوی حکومت ہندستان میں اتنی بہت سی تنظیموں کے نمائندوں سے کیوں مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ بات عام طور پر جانی جاتی تھی کہ کانگریس ہندستانی عوام کی اکثریت کی ترجمان ہے —— یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے ایک حلقے میں خاصا اثر قائم کر لیا تھا، لیکن یہ بیشتر اس تعاون کی وجہ سے تھا جو حکومت مسلم لیگ کو دے رہی تھی! جہاں تک دوسری جماعتوں کا تعلق ہے، تقریباً سب حکومت کی پیدا کردہ تھیں۔ اگر برطانوی حکومت کانگریس سے مفاہمت کر لیتی تو ان جماعتوں میں نہ تو اس کی طاقت تھی، نہ ہمت تھی اور شاید یہ خواہش بھی نہیں تھی کہ اس کی مخالفت کریں۔ سر سٹیفرڈ سے ملاقات کے لیے ایسی تمام جماعتوں کے مدعو کیے جانے کا واحد سبب یہ تھا کہ انھیں امکانی طور پر کانگریس کا وزن گھٹانے کی نیت سے استعمال کیا جائے۔ برطانوی حکومت بیرونی دنیا کو یہ جتانا چاہتی تھی کہ ہندستان میں بہت سی جماعتیں ہیں اور کانگریس پورے ملک کی ترجمان نہیں ہے۔ انگریز شاید یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ کانگریس پر کچھ دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ یہی وہ سیاق تھا جس میں کرپس نے یہ سوچا کہ جب وہ دوسری ہندستانی جماعتوں کے لیڈروں سے مل رہے ہیں تو انھیں نیشنلسٹ مسلم کنونشن کے صدر کو بھی مدعو کرنا چاہیے۔

میں نے سر سٹیفرڈ کے نئی دہلی آنے کے جلد ہی بعد ان سے ملاقات کی۔ پہلی میٹنگ ۲۹ مارچ ۱۹۴۲ء کو دن کے تین بجے ہوئی۔ سر سٹیفرڈ نے اپنی تجاویز پر مشتمل ایک بیان تیار کر رکھا تھا جسے ضمیمہ ۲ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنا بیان میرے حوالے کیا اور کہا کہ وہ تجاویز پر مزید گفتگو اور جہاں ضرورت ہو اس کی مزید مدافعت کے لیے تیار ہیں ——— میں نے جب بیان پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ یہ تجویز تھی، وائسرائے کی ایک نئی مجلسِ منتظمہ کے لیے۔ تمام موجودہ اراکین مستعفی ہو جائیں گے۔ اس کے بعد نیشنل کانگریس اور دوسری نمائندہ تنظیموں سے درخواست کی جائے گی کہ وہ اپنے نامزد کردہ لوگوں کو بھیجیں جنھیں ملا کر ایک نئی مجلسِ منتظمہ کی تشکیل ہو سکے۔ یہ مجلس جنگ کی مدت تک کام کرتی رہے گی۔ برطانوی حکومت متانت کے ساتھ اپنے اس عہد کا اظہار کرے گی کہ مخاصمتوں کے ختم ہوتے ہی ہندستانی آزادی کا سوال زیرِ بحث لایا جائے گا۔

اس تجویز کا ماحصل یہ تھا کہ موجودہ مجلسِ منتظمہ میں برطانوی اراکین کی اکثریت کے بجائے ایک نئی مجلس منتظمہ بنائی جائے گی جس میں صرف ہندستانی ہوں گے۔ برطانوی عہدیدار سکریٹری کے طور پر باقی رہیں گے، کونسل (مجلس) کے اراکین کے طور پر نہیں۔ حکومت کا نظام، بہر حال، بدلا نہیں جائے گا۔

میں نے سر سٹیفرڈ سے پوچھا کہ اس کونسل میں وائسرائے کی کیا حیثیت ہوگی۔ سر سٹیفرڈ نے جواب دیا کہ وائسرائے یو، کے، کے بادشاہ کی طرح، ایک آئینی سربراہ کے طور پر کام کرے گا۔ اس خیال سے کہ شک کے لیے کوئی گنجایش باقی نہ رہے، میں نے ان سے اس امر کی تصدیق چاہی کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آئینی سربراہ کے طور پر وائسرائے کونسل کے مشوروں کا پابند رہے گا ——— سر سٹیفرڈ نے کہا کہ اسی بات کا ارادہ ہے میں نے دوبارہ دریافت کیا کہ بنیادی سوال یہ ہے کہ اختیارات کو بروئے کار کون لائے گا، مجوزہ کونسل یا وائسرائے ——— سر سٹیفرڈ نے یہ بات دہرائی کہ اختیارات کونسل کے پاس ہوں گے، جس طرح کہ فی الوقت برطانوی کابینہ کے پاس ہیں۔ پھر میں نے

پوچھا کہ اس قسم کے خاکے میں انڈیا آفس کی جگہ کیا ہوگی —— سر سٹیفرڈ نے کہا کہ یہ معاملہ تفصیل طلب ہے، جس پر وہ ابھی تک غور نہیں کر سکے تھے، لیکن مجھے وہ اس بات کا یقین دلانا چاہیں گے کہ اس معاملے میں کانگریس جو بھی خیالات رکھتی ہے، ان کی طرف مناسب توجہ کی جائے گی —— سر سٹیفرڈ نے کچھ سوچنے کے بعد مزید یہ کہا کہ انڈیا آفس برقرار رہے گا اور ایک ریاستی حیثیت کا سکریٹری ہوگا، لیکن اس کی حیثیت ایک ڈومینین سکریٹری کی جیسی ہوگی، جس طرح کہ دوسری ڈومینینس DOM INIONS کے ساتھ ہے۔

میں نے تفصیل کے ساتھ یہ وضاحت کی کہ کس طرح، جنگ چھڑنے کے بعد ہندستان نے بار بار جنگ میں شرکت کی پیشکش اس شرط پر کی تھی کہ اس کی آزادی (پہلے) تسلیم کرلی جائے —— یہ الزام انگریزوں پر آتا ہے کہ اس پیشکش کا فائدہ اٹھانے میں وہ ناکام رہے، اور اس طرح جنگ میں ہندستان کی طرف سے کوئی بڑا رول ادا نہ کیے جانے کے ذمّے دار بھی وہی ہیں۔ سر سٹیفرڈ نے بار بار کہا کہ جس شکل میں واقعات رونما ہوئے اس کا انھیں افسوس ہے، لیکن اب انھیں یقین ہے کہ یہ تمام صورت حال ختم ہو جائے گی، اگر برطانوی کابینہ کی جانب سے جو پیشکش وہ لے کر آئے ہیں، اسے قبول کرلیا جائے۔

اس طرح ہماری پہلی بات چیت کا خاتمہ ایک پُرامید نوٹ پر ہوا۔

۲۹ مارچ ۱۹۴۲ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ طلب کی گئی، اور اس کا سیشن ۱۱ اپریل تک جاری رہا۔ ورکنگ کمیٹی نے جتنی میٹنگیں کی تھیں ان میں یہ میٹنگ شاید سب سے طویل تھی۔ جیسی کہ پہلے ہی توقع کی جاتی تھی، اراکین نے ان تجویزوں کو مختلف کیفیتوں اور مختلف نقاطِ نظر کے ساتھ دیکھا۔

گاندھی جی روزِ اوّل سے ان تجویزوں کو تسلیم کرنے کے خلاف تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس کا بیشتر سبب جنگ کے تئیں ان کی ناپسندیدگی ہے، بجائے خود ان تجاویز پر اعتراض نہیں ہے۔ دراصل اس تجویز کے اوصاف کی بابت ان کے فیصلے پر ایسی ہر بات سے جو

ہندستان کو جنگ میں ملوث کرسکے، ان کی خلقی اور ناقابلِ تغیر بیزاری کا رنگ چڑھ جاتا تھا۔ تجویزیں ہندستان کے لیے جاہے جتنی سازگار رہی ہوں، اگر ان کا مطلب یہ تھا کہ ہندستان کو جنگ میں شریک ہونا پڑے گا، تو گاندھی جی کے لیے قطعاً ناقابلِ قبول تھیں۔ انھوں نے پیشکش کا آخری حصہ بھی پسند نہیں کیا، جس میں کہا گیا تھا کہ جنگ کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ کو فرقہ وارانہ مسئلہ طے کرنے کا ایک موقعہ دیا جائے گا۔

کرپس سے، اس مشن کے دوران گاندھی جی پہلی بار ملے، تو کرپس نے انھیں وہ یادداشت یاد دلائی جس کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے ——— کرپس نے کہا کہ یادداشت کانگریسی لیڈروں سے، جن میں گاندھی جی بھی شامل ہیں، مشورے کے بعد تیار کی گئی تھی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جنگ کے دوران مجلس منتظمہ کا مزاج (اراکین کی قومیت کے لحاظ سے) پوری طرح ہندستانی کر دیا جائے گا۔ جنگ کے بعد ہندستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے گا ——— وہ تجویزیں، جنھیں وہ اب اپنے ساتھ لائے ہیں، خاصی حد تک ویسی ہی ہیں۔

گاندھی جی نے کہا کہ انھیں وہ یادداشت اب بالکل یاد نہیں رہ گئی ہے۔ کرپس سے پچھلے سفر کے دوران جو گفتگو ہوئی تھی، اس میں سے بس اتنا یاد رہ گیا ہے کہ سبزی خوری کے سلسلے میں کچھ بات چیت انھوں نے آپس میں کی تھی ——— کرپس نے جواب دیا، یہ ان کی بدقسمتی ہے کہ گاندھی جی کو غذا کے بارے میں بات چیت تو یاد رہی، لیکن وہ تجاویز جن کی تیاری خود گاندھی جی سے مشورے کے بعد بہت احتیاط کے ساتھ کی گئی تھی ——— انھیں وہ بھول گئے۔

اس بات چیت کے دوران، گاندھی جی اور کرپس میں بہت سی خوشگوار باتیں بھی ہوئیں، لیکن تناتنی کے موقعے بھی آئے، اگرچہ ان کی نوعیت دوستانہ رہی۔ گاندھی جی نے کہا کہ یہ تجویزیں بہت معیّن اور غیر دلچسپ ہیں، اور ان میں مذاکرات کی کوئی گنجائش نکالنا مشکل ہے۔ انھوں نے ہنستے ہوئے، کرپس کو تنبیہہ کی کہ میں انھیں بہت زیادہ ڈھیل دے رہا تھا، لیکن انھیں محتاط رہنا چاہیے ——— کرپس نے پلٹ کر (مزاحاً) کہا، وہ جانتے ہیں کہ میرے پاس جو رسّی ہے وہ اتنی لمبی ہے کہ انھیں لٹکایا جا سکتا ہے۔

جواہر لال یورپ اور ایشیا میں واقعات کی صورت حال سے بہت زیادہ پریشان تھے اور انھیں جمہوریتوں کے انجام کی طرف سے تشویش تھی۔ اُن کی فطری ہمدردیاں انہی ——— (جمہوریتوں) کے ساتھ تھیں اور وہ حتی الامکان ان کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے، ان کا میلان، اِن تجویزوں کی جانب دوستانہ توجہ کا تھا۔ مگر انگریزوں کے خلاف، اس وقت ہندستانی احساسات اتنے شدید تھے کہ وہ (جواہر لال) اپنا موقف کھل کر اور زور دے کر بیان نہیں کر سکتے تھے۔ میں بہر حال، ان کے خیالات پڑھ سکتا تھا اور مجھے ان کے خیالات سے بالعموم ہمدردی تھی۔

جہاں تک، کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دوسرے اراکین کا تعلق ہے، اُن میں سے اکثر جنگ کے بارے میں کوئی مرتب رائے نہیں رکھتے تھے۔ رہنمائی کی خاطر، وہ سب گاندھی جی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں استثنائی حیثیت صرف شری راجگوپال آچاری کی تھی۔ وہ پوری طرح (ان تجویزوں) کی قبولیت کے حق میں تھے لیکن ان کے خیالات میں زیادہ وزن نہیں تھا ——— یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ کانگریسی حلقے انھیں ایک ایسا شخص سمجھتے تھے جسے ایک اعتدال پسند MODERATE سے بمشکل ممیز کیا جا سکتا ہو۔

ورکنگ کمیٹی تجویزوں پر دو روز تک بحث کرتی رہی مگر یہ گفتگو نتیجہ خیز نہیں رہی۔ اس وقت میں نے یہ ضروری خیال کیا کہ بعض نکات پر سر سٹیفرڈ سے مزید وضاحتیں اور زیادہ تفصیلی اطلاعات، طلب کی جائیں ——— بنیادی سوال مجلس منتظمہ کے اختیارات سے متعلق تھا۔ سر سٹیفرڈ کی تجویز تھی کہ مجلس تو برقرار رہے گی مگر اس کی تشکیل سیاسی جماعتوں کے منتخب کردہ ہندستانی اراکین کی مدد سے کی جائے گی۔ انھوں نے زبانی مجھے یقین دلایا تھا کہ وائسرائے کی حیثیت وہی ہوگی جو ایک آئینی سربراہ کی ہوتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی چاہتی تھی کہ یہ بات سمجھوتے کی شرطوں میں صاف صاف لے آئی جائے۔ چنانچہ، یکم اپریل ۱۹۴۲ء کو مَیں نے کرپس سے دوبارہ ملاقات کی۔

سر سٹیفرڈ سے یہ ملاقات فیصلہ کن تھی ——— ہماری بات چیت کوئی تین گھنٹے تک جاری رہی۔ مَیں نے محسوس کیا کہ آخری بار جب مَیں ان سے ملا تھا۔ اس کے بعد سے ان

کے موقف میں اب بہت بڑی تبدیلی آچکی ہے۔ پہلی بات چیت کے دوران ان کے جواب کی نسبت اب ان کے جوابات کا مزاج خاصا مختلف تھا ——— جب میں نے مجلس منتظمہ کی حیثیت کے بارے میں سوال کیا تو وہ بولے کہ انھیں امید ہے یہ مجلس، جنگ کے دوران بھی، ایک کابینہ کے طور پر کام کرتی رہے گی ——— اس پر میں نے پوچھا کہ کیا اس سے یہ مطلب نکالا جائے کہ مجلس، (کونسل) تمام مسئلے اکثریت کی بنیاد پر طے کرے گی اور اس کے فیصلے حتمی ہوں گے ——— کرپس نے ایک مبہم سا جواب دیا۔ وہ کھل کر یہ نہیں کہنا چاہتے تھے کہ وائسرائے کو آخری فیصلے کا حق ہوگا، مگر جو کچھ انھوں نے کہا اس کا لب لباب یہی تھا کہ مجلس کو فیصلے کے مکمل اور آزادانہ اختیارات حاصل نہیں ہوں گے ——— انھوں نے یہ کہتے ہوئے اس نکتے کی وضاحت کرنی چاہی کہ وائسرائے کو اس وقت حیثیت جو ملی ہوئی ہے، اُس میں قانون کو بدلے بغیر تبدیلی نہیں لائی جاسکتی ——— بہرحال، اس بات پر انھوں نے بار بار زور دیا کہ قانون کے مطابق حیثیت جو بھی ہو، عملی اعتبار سے وائسرائے صرف ایک آئینی سربراہ کے طور پر کام کرے گا۔

میں نے سر سٹیفرڈ کو یاد دلایا کہ پہلی بات چیت کے دوران انھوں نے نسبتاً کہیں زیادہ واضح جواب دیے تھے۔ انھوں نے میری اس بات سے اتفاق کیا اور مجھے قائل کرنا چاہا کہ ان کا بنیادی موقف بدلا نہیں ہے۔ اس وقت اُن کا ارادہ جو کچھ کہنے کا تھا، وہ عین مین وہی تھا جو وہ اس وقت کہہ رہے تھے۔ میں نے یاد دلایا کہ پچھلے موقع پر، میرے ایک سوال کے جواب میں، انھوں نے صاف صاف کہا تھا کہ مجلس منتظمہ کا طریقِ کار بعینہٖ ایک کابینہ کے جیسا ہوگا۔ مگر، آج وہ یہ کہہ رہے تھے کہ قانونی پوزیشن جوں کی توں رہے گی، اور وہ یہ کہتے ہوئے، صرف میری یقین دہانی کی کوشش کر رہے تھے کہ انھیں امید ہے مجلس (کونسل) ایک کابینہ کی طرح کام کرے گی ——— یہ تاثر، بہر نوع، اس طرح کا نہیں تھا جو پہلی بات چیت کے بعد، میں لے کر اٹھا تھا۔ میں نے انڈیا آفس اور ریاستی سکریٹری برائے ہندستان کے سلسلے میں اپنی گفتگو بھی انھیں یاد دلائی۔ اس وقت انھوں نے کہا تھا کہ ریاستی سکریٹری برائے ہندستان، دولت متحدہ کے سکریٹری کی طرح کام کرے گا، لیکن اب ان کا کہنا یہ تھا کہ انڈیا آفس یا ریاستی سکریٹری برائے ہندستان کی حیثیت میں کسی قسم کی تبدیلی کے لیے ایک نئے پارلیمانی

ایکٹ کے نفاذ کی ضرورت ہوگی۔ کرپس نے جواب دیا کہ ان کے خیال میں عملاً انڈیا آفس ایک نئی بنیاد پر کام کرے گا، لیکن کسی قانون کے نفاذ میں عملی مشکلات ہیں جو ریاستی سکریٹری کے مرتبے کو دولت متحدہ کے سکریٹری جیسا بنا دیں گی۔

اب میں نے مخاصمتوں کے خاتمے پر ہندستانی آزادی کو تسلیم کیے جانے کا سوال اٹھایا۔ کرپس نے کہا کہ جنگ کے بعد ایک نئے زاویے سے ہندستان کے مسئلے پر غور کیا جائے گا اور اسے یہ موقع فراہم کیا جائے گا تاکہ اپنی تقدیر کا فیصلہ وہ خود کرے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بطور ایک دوست کے، وہ یہ مشورہ دینا چاہیں گے کہ ہمیں نئے سوالات اٹھا کر نئی مشکلات پیدا نہیں کرنی چاہئیں ——— ہندستان کو یہ تجاویز، جس شکل میں سامنے آئی ہیں، اسی شکل میں، تسلیم کر لینی چاہئیں اور آگے بڑھ جانا چاہیے۔ ان کے ذہن میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اگر دورانِ جنگ، ہندستان نے برطانیہ کے ساتھ پوری طرح تعاون کیا، تو جنگ کے بعد اس کی آزادی یقینی ہے۔

ہندستان میں اور ہندستان سے باہر، اس سلسلے میں بہت کافی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں کہ پہلی اور دوسری گفتگو کے درمیان سر سٹیفرڈ کرپس نے اپنی پوزیشن تبدیل کیوں کر لی ——— اس کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ سر سٹیفرڈ کو امید تھی کہ اپنی قائل کرنے کی صلاحیتوں اور اپنے خوش گوار طور طریقوں کی مدد سے، وہ کانگریس کو تجاویز کی منظوری پر آمادہ کر لیں گے خواہ بنیادی صورت حال میں کوئی بھی تبدیلی نہ ہو۔ اسی لیے شروع میں، ایک سازگار پہلا تاثر قائم کرنے کی خاطر، صاف لفظوں میں یقین دہانیاں کرائی تھیں۔ بہرنوع، جب تفصیل کے ساتھ تجاویز کی جانچ پرکھ ہوئی اور خود ان سے جرح کی گئی تو انھوں نے محسوس کیا کہ انھیں محتاط رہنا چاہیے اور ایسی امید نہیں دلانی چاہیے جنھیں پورا کرنا ان کے بس میں نہ ہو ——— ایک متبادل توجیہہ یہ (کی جاسکتی) ہے کہ بیچ کے اس عرصے میں، حکومت ہند کے اندرونی حلقے نے ان پر اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ ہمہ وقت وہ وائسرائے اور اس کے مصاحبوں میں گھرے رہتے تھے۔ شاید یہ ناگزیر تھا کہ اُن کے نقطۂ نظر کا کچھ نہ کچھ رنگ سر سٹیفرڈ کی بصیرت میں شامل ہو جائے ——— ایک تیسری توجیہہ یہ ہے کہ بیچ کے

عرصے میں دہلی اور لندن کے درمیان پیغام آئے تھے اور برطانوی جنگی کابینہ نے انھیں نئی ہدایتیں بھیجی تھیں جنھوں نے اُن میں یہ احساس پیدا کیا تھا کہ اگر وہ بہت آگے بڑھ گئے تو ہو سکتا ہے کہ انھیں سرے سے مسترد کر دیا جائے۔

قطعی طور پر کوئی جواب دینا مشکل ہے کہ اصل توجیہہ کیا تھی۔ عین ممکن ہے کہ متذکرہ بالا تمام اسباب صورتِ حال میں تبدیلی لانے کے ذمے دار ہوں ——— کرپس اصلاً ایک وکیل تھے، چنانچہ ہر شے کو، جیسی کہ وہ واقعتاً ہوتی تھی اس کے برعکس، زیادہ خوبصورت بنا کر پیش کرنے کے عادی تھے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر سے چیزوں کو دیکھنے کا میلان بھی رکھتے تھے، اور اپنی پوزیشن کو حتی الوسع، اس درجہ خوبصورت بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے کہ وہ ان کے مخالف پر اثر انداز ہو جائے ——— ہم نے جب انھیں لاجواب کر دیا تو وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ میں نے بعد میں یہ سُنا کہ ماسکو میں بھی، بعض اوقات وہ اسی طرح، موصولہ ہدایات کی حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ اس سے زیادہ فیاضانہ ایک تعبیر بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ بہ حیثیت ایک انگریز کے، انھیں تحریری معاہدوں سے زیادہ، عمل اور رسوم پر زور دینے کی عادت تھی ——— ہو سکتا ہے، انھیں خلوص کے ساتھ اس بات کا یقین رہا ہو کہ ایک بار اُن کی تجویزیں قبول کر لی جائیں، تو ویسی صورتیں خود بہ خود پیدا ہو جائیں گی جن کی جانب انھوں نے اپنی پہلی گفتگو میں اشارہ کیا تھا ——— مگر ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں وہ رسمی طور پر یقین دہانی نہیں کرا سکتے تھے، چنانچہ جب ہم نے باضابطہ طور پر یقین دلائے جانے کا مطالبہ کیا تو انھیں اپنی پہلی پوزیشن سے پیچھے ہٹنا پڑا۔

اسی لیے وہ تصویر، جو میں نے ۱۰ر اپریل کی صبح کو ورکنگ کمیٹی کی دوسری میٹنگ میں، جیسے سر سیٹفرڈ سے میری دوسری گفتگو کے نتائج پر غور کرنے کے لیے طلب کیا گیا تھا، پیش کی وہ کلیتاً نئی تھی ——— میں نے ساری پوزیشن کا خلاصہ مندرجہ ذیل طور پر رکھنے کی کوشش کی:

ا۔ میں نے اب صاف صاف یہ دیکھ لیا کہ برطانوی کابینہ جنگ کے دوران

ہندستان کو آزادی دینے پر تیار نہیں تھی۔ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا ایک خطرہ مول لینا ہوگا اور اس کے لیے وہ آمادہ نہیں تھے۔

۲۔ جنگ کے حالات اور خاص طور سے امریکی دباؤ نے برطانیہ کی پوزیشن میں تھوڑی ترمیم کردی۔ حتیٰ کہ چرچل کی حکومت بھی اب یہ محسوس کرنے لگی کہ ہندستان کو جنگ میں شریک ہونے کا موقعہ اس کی اپنی مرضی کی بنیاد پر فراہم کیا جانا چاہیے۔ یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر وہ ایک خالصتاً ہندستانی مجلس منتظمہ کی تشکیل کے لیے تیار تھے، اور اسے، جس حد تک ممکن ہو اختیار دینا چاہتے تھے۔ قانونی اعتبار سے، بہرحال، یہ مجلس مجلس ہی رہے گی اور ایک کابینہ کی حیثیت نہیں پاسکے گی۔

۳۔ یہ ممکن تھا کہ واقعی عمل کی سطح پر وائسرائے رواداری کا رویہ اختیار کرتا اور مجلس کے فیصلوں کو بالعموم قبول کرلیتا۔ مجلس کی پوزیشن بہرحال، اس کے تابع ہوگی، اور آخری ذمے داری اس کے سر جائے گی نہ کہ مجلس کے۔

۴۔ اس لیے یہ بنیادی سوال جسے ورکنگ کمیٹی نے اٹھایا تھا کہ آخری فیصلے کا حق کون رکھے گا، اس کا جواب یہی نکلتا ہے کہ اس حق پر وائسرائے کا اختیار ہوگا۔

۵۔ جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے، یہ ممکن تھا کہ کرپس کے لفظوں میں، برطانوی حکومت ایک نئے زاویے سے ہندستانی مسئلے کا جائزہ لیتی، لیکن یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مخاصمتوں کے خاتمے پر ہندستان آزاد ہو جائے گا۔

۶۔ بے شک، ایک قوی امکان اس بات کا تھا کہ جنگ کے بعد قدامت پسند حکومت جس کے سربراہ مسٹر چرچل ہیں، اس کی جگہ ایک نئی حکومت آجائے۔ ممکن ہے کہ یہ (نئی) حکومت ہندستانی مسئلے کا

جائزہ زیادہ سوجھ بوجھ اور ہمدردی کے ساتھ لیتی، لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ اس قسم کی امکانی صورت تجاویز کا حصّہ نہیں بن سکتی تھی۔

۷۔ اسی لیے، نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کانگریس کرپس کی پیشکش کو قبول کر لیتی، تو ایسا مخاصمتوں کے خاتمے پر بھی ہندستان کے مستقبل کی بابت کسی واضح یقین دہانی کے بغیر ہوتا۔

ہم نے ان نکات پر بحث اس اعلانیے کی روشنی میں کی ہوئی، بی، سی نے کرپس مشن کے موقعے پر نشر کیا تھا۔ اس وقت واضح لفظوں میں یہ کہا گیا تھا کہ اب ہندستان کو اپنی قسمت کے فیصلے کا ایک موقع مل جائے گا۔ اپنی پہلی بات چیت کے دوران کرپس نے بھی یہی تاثر قائم کیا تھا لیکن جیسے جیسے مذاکرات آگے بڑھتے گئے، اعتماد اور امید کی ابتدائی کیفیت بتدریج رخصت ہوتی گئی۔

اس کیفیت اور ماحول کی تبدیلی کے دوسرے اسباب بھی تھے۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ سر سٹیفرڈ کرپس نے ہندستان آنے سے پہلے، وائسرائے سے کہا تھا کہ متعدد سیاسی لیڈروں کے نام دعوت نامے بھجوا دیے جائیں، جن میں ایک مرحوم اللہ بخش بھی تھے —— ہندستان پہنچنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ کرپس کو اپنا موقف تبدیل کرنا پڑا، شاید وائسریگل ہاؤس کے اثر کی وجہ سے —— اللہ بخش وائسرائے کی دعوت پر دہلی آگئے تھے اور سر سٹیفرڈ سے انٹرویو کے منتظر تھے، لیکن اس کا تعیّن ہو ہی نہیں پا رہا تھا۔ چونکہ اس سے ایک بدنما صورت حال پیدا ہو رہی تھی، میں نے کرپس سے گفتگو کی اور انھوں نے کہا کہ وہ جلد ہی اللہ بخش کو مدعو کر لیں گے۔ لیکن اس وعدے کے باوجود، کوئی دعوت نامہ واقعتاً نہیں بھیجا گیا —— آخر کار اللہ بخش مایوسی سے تنگ آگئے اور کہا کہ دہلی میں اب وہ مزید انتظار نہیں کریں گے۔ میں نے جب یہ سنا، تو میں نے سر سٹیفرڈ سے سخت لہجے میں بات کی اور کہا کہ یہ اللہ بخش کی ہی نہیں، مسلمانوں کی اس تنظیم کی بھی توہین ہے جس کے وہ نمائندے تھے۔ اگر

کرپس کو اس سلسلے میں کوئی شک تھا تو اللہ بخش کو سرے سے مدعو ہی نہیں کیا جانا تھا۔ لیکن چونکہ دعوت نامہ جاری کیا جا چکا تھا، اس لیے اب قاعدے سے اُن سے ملنا چاہیے۔ میری مداخلت کے نتیجے میں، اگلے روز سر سٹیفرڈ اور اللہ بخش میں ملاقات ہو گئی۔ یہ انٹرویو صرف ایک گھنٹے کے لیے تھا اور عام بات چیت تک محدود تھا ——— کرپس نے مسئلے کی جڑ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

اس واقعے نے مجھ پر ایک خراب تاثر قائم کیا۔ میرا خیال تھا کہ پیچیدہ سیاسی مسئلوں سے نمٹنے کا، یہ مناسب طریقہ نہیں ہے۔ میری نظر میں کرپس کا طرزِ عمل ایک مدبّر کے طرزِ عمل جیسا نہیں تھا۔ حکومتِ ہند سے مشورے کے بغیر دعوت نامے جاری نہیں ہونے چاہیے تھے۔ پھر اگر دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں تو انھیں اللہ بخش سے براہِ راست طور پر بتا دینا چاہیے تھا تاکہ وہ دہلی میں پڑے پڑے اپنی ایڑیاں ٹھنڈی نہ کرتے رہتے۔

ایک اور واقعہ بھی ہوا جس نے مجھے بے مزہ کر دیا۔ جیسے ہی پریس نے جنگی کابینہ کی تجویزوں کا متن جاری کیا، ہندستانی اخبارات میں اعتراضات کی بھرمار شروع ہو گئی۔ سب سے زیادہ معترض وہ اخبارات تھے، جو عام طور پر کانگریس کے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے تھے۔ ان میں سے ایک ہندستان ٹائمز تھا جو اپنی رایوں کے اظہار میں سب سے زیادہ صاف گو تھا ——— کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ابھی چل ہی رہا تھا کہ کرپس نے مجھے ایک خط بھیجا جس میں انھوں نے یہ کہا کہ گرچہ ہندو اخبارات نے پیشکش کا خیر مقدم نہیں کیا ہے، انھیں (کرپس کو) امید ہے کہ میں تجویز پر ایک وسیع تر نقطۂ نظر کے ساتھ غور کروں گا۔ ہندو اخبارات کی طرف یہ حوالہ مجھے بہت نامناسب نظر آیا ——— مجھے یہ خیال بھی ہوا کہ ہندو پریس پر زور وہ شاید اس لیے دے رہے ہیں کیونکہ میں ایک مسلمان ہوں۔ اگر انھیں اخباروں کے تبصرے پسند نہیں آئے تھے تو وہ بآسانی ہندستانی پریس (اخبارات) یا اس کے ایک حصّے کا حوالہ دے سکتے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ میں ہندو پریس کی طرف ان کے اس حوالے پر حیران ہوں اور میں نہیں سمجھتا کہ ہندستانی پریس کے مختلف حصّوں میں اس طرح کے خطِ امتیاز کا کوئی جواز ہے۔ میں نے انھیں یقین دلایا

کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی ان تجاویز پر صرف ایک ہندستانی نقطۂ نظر سے غور کرے گی اور کسی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے، یہ مختلف خیالات رکھنے والے حلقوں پر توجہ صرف کرے گی۔

۲۹ مارچ سے ۱۱ اپریل تک، ورکنگ کمیٹی کے طویل سیشن کے دوران میں تقریباً سارا دن عملی طور پر، کمیٹی کے ساتھ ہوتا تھا۔ ۲ اپریل کے بعد تقریباً ہر صبح میں نے کرپس سے ملاقات بھی کی۔ ان میں سے کچھ میٹنگوں میں جواہر لال بھی میرے ساتھ جاتے تھے۔ کرپس کے مجوزہ دورے کی اطلاع جیسے ہی مجھے موصول ہوئی، میں نے ورکنگ کمیٹی کے تمام اراکین کو ایک گشتی مراسلہ بھیجا تھا کہ ان میں کوئی بھی الگ سے، ان (کرپس) سے ملاقات نہ کرے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کی علاحدہ میٹنگیں، بعض اوقات کنفیوژن اور غلط فہمی کی راہ پر لگا سکتی ہیں اور واقعتاً ایسا ہو بھی چکا ہے ——— میں نے یہ بھی کہا کہ اگر ورکنگ کمیٹی کا کوئی رکن، کسی خاص مسئلے یا کرپس سے اپنے پرانے مراسم کی بنا پر ان سے ملنا ہی چاہتا ہے، تو اسے پہلے مجھ کو اپنے ارادے سے مطلع کرنا چاہیے۔

کرپس نے مجھ سے شکایت کی کہ ہندستان کے اپنے گزشتہ سفر کے دوران وہ ورکنگ کمیٹی کے بہت سے اراکین سے ملے تھے۔ اس مرتبہ انھیں پتہ چلا کہ میں نے اُن پر پابندی عائد کر دی ہے اور ایک رکن بھی اُن سے ملاقات کا طلب گار نہیں تھا۔ اگر کسی سماجی تقریب میں، ان کی ملاقات ہوئی بھی تو انھوں نے کوئی رائے تک ظاہر نہیں کی، کیونکہ ان کو یہ خیال تھا کہ صدر کانگریس کو اس طرح کے اقدام پر اعتراض ہو سکتا تھا۔

میں نے کرپس کو بتایا کہ اس وقت جب کوئی ذمے دار تنظیم حکومت سے مذاکرات کر رہی ہو، اسے یہ کچھ صرف اپنے باضابطہ نمائندوں کے توسط سے کرنا چاہیے۔ ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا تھا کہ صدر کانگریس کو مذاکرات جاری رکھنے چاہئیں۔ اسی لیے، ورکنگ کمیٹی کے دوسرے اراکین کے لیے الگ سے مذاکرہ مناسب نہیں ہوگا۔ پھر بھی، اگر کرپس ورکنگ کمیٹی کے کسی رکن سے، کسی بھی وجہ سے ملنا چاہتے ہیں تو میں بخوشی اس کا انتظام کر دوں گا۔

کرپس نے کہا کہ وہ خاص طور پر بھولا بھائی ڈیسائی سے ملاقات کے مشتاق ہیں۔

ہندستان کے گزشتہ سفر میں وہ ان کے ساتھ قیام کر چکے تھے۔ کھادی سوٹ جو انھوں نے پہن رکھا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک تبسم کے ساتھ کرپس نے کہا، یہ لباس بھی جو میں اس وقت پہنے ہوئے ہوں، بھولا بھائی ڈیسائی کی طرف سے ایک تحفہ ہے۔

ورکنگ کمیٹی میں پیشکش پر بحث جاری رہی۔ گاندھی جی اسے قبول کرنے کے خلاف تھے۔ جواہر لال تجاویز کے حق میں تھے۔ مجھے ان دونوں سے اختلاف تھا۔ گاندھی جی تجاویز کے مخالف اس وجہ سے تھے کیونکہ وہ جنگ کے خلاف تھے۔ جواہر لال ان کے حق میں اس لیے تھے کیونکہ انھیں جمہوریتوں سے لگاؤ تھا۔ وہ اس اپیل سے بھی متاثر تھے جس میں مارشل چیانگ کائی شیک نے ہندستانی عوام سے خطاب کیا تھا۔ اسی لیے، وہ سمجھتے تھے کہ تجاویز کو قبول کر لینا چاہیے، اگر کانگریس اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے یہ کر سکتی ہو۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میرے پاس تجاویز کو پرکھنے کا صرف ایک پیمانہ تھا۔ کیا برطانوی حکومت کی پیشکش ہندستان کو آزادی کا راستہ دکھا سکتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں یہ پیشکش خوشی کے ساتھ قبول کر لینی چاہیے اور بغیر کسی ذہنی تحفظ کے ——— اگر جواب نفی میں ہے تو پھر ہمیں قطعی طور پر اسے (پیشکش کو) مسترد کر دینا چاہیے۔ میرے لیے واحد امتحان ہندستانی آزادی کا مسئلہ تھا۔

میری کوشش، مذاکرات کی پوری مدت میں اسی لیے یہ تھی کہ کرپس کی پیشکش اس شکل میں آئے جو ہمیں یہ یقین دلا سکے کہ ایک کنونشن قائم کیا جائے گا جس کے توسط سے مجلس منتظمہ عملاً ایک کابینہ کے طور پر کام کرے گی اور وائسرائے ایک آئینی سربراہ کے طور پر۔ اگر اس نقطے پر ہم مطمئن ہوں تو پھر ہم پیش کش کو قبول کر سکتے تھے اور ہمیں جنگ کے دوران قانونی سطح پر اقتدار کی منتقلی کے سلسلے میں اصرار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، یہ مذاکرات دو طویل ہفتوں تک جاری رہے۔ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ دن میں ہوتی تھی، میں شام کو کرپس سے ملتا تھا اور اگلی صبح ورکنگ کمیٹی کے سامنے رپورٹ پیش کرتا تھا۔ کرپس نے وائسرائے سے گفتگو کی جب کہ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس چل رہا تھا۔ مجھے بھی بعد کو یہ پتہ چلا کہ اس عرصے میں کرپس نے تین مواقع پر چرچل سے مشورہ

کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے جنگی کابینہ کے دوسرے اراکین سے بھی مشورہ کیا ہو۔

کرپس یہ اصرار مسلسل کرتے رہے کہ جنگ کے دوران، فیصلہ کن حقیقت اس لیے کو ہونا چاہیے جو یہ جنگ اختیار کرتی ہے۔ اس وقت جنگ ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں صرف جغرافیائی مصلحتیں ہندستان پر ایک بھاری بوجھ ڈال رہی تھیں۔ اسی لیے یہ ضروری تھا کہ مجلس منتظمہ کو اس معاملے میں مداخلت کا اختیار ہونا چاہیے اور برطانوی جنگی کابینہ تک کو ہندستانی مجلس منتظمہ پر بھروسا کرنا چاہیے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اس نوع کی صورت حال میں، یہ ضروری نہیں تھا کہ مجلس کے قانونی اختیارات کی توسیع پر اصرار کیا جائے یا واضح لفظوں میں یہ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ آخری فیصلے کا حق اس (مجلس) کو حاصل ہوگا۔ حالات کا زور بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان ہندستانی لیڈروں پر ذمے داری رکھتا جائے گا جو مجلس منتظمہ کی تشکیل کریں گے۔

اس وقت ویویل ہندستان میں کمانڈر انچیف تھے۔ کرپس نے ان سے کئی بار گفتگو کی اور یہ مشورہ دیا کہ مجھے بھی ان سے ملنا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میں ویویل سے مل لوں اور جنگی صورت حال پر ان سے ایک رپورٹ حاصل کر لوں تو اس کا خوشگوار اثر پڑے گا چنانچہ انھوں نے مجھے ویویل سے ملاقات کے لیے لکھا۔ میں بخوشی تیار ہو گیا۔ اور کرپس نے ملاقات مقرر کرا دی۔

کرپس بذات خود، جواہر لال کو اور مجھے ویویل کے پاس لے گئے، لیکن رسمی تعارف کے بعد وہ چلے گئے اور ویویل سے ہماری گفتگو گھنٹے ڈیڑھ سے زیادہ ہوئی۔ مگر، اس گفت و شنید کا کچھ ایسا نتیجہ نہیں نکلا جو میرے بنیادی سوال کا جواب ہوتا ----- ویویل کا طرز گفتگو ایک سپاہی کے بجائے ایک سیاست داں کا تھا اور وہ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ جنگ کے دوران، حکمت عملی کی مصلحتوں کو دوسرے تمام مسئلوں پر فوقیت دی جانی چاہیے۔ میں نے اس سے انکار نہیں کیا۔ لیکن اس امر کی نشاندہی کی کہ ہمارا سروکار اس سے ہے کہ ہندستان کے انتظام کو چلانے کا اختیار کس کے ہاتھوں میں ہوگا۔ اس سوال پر ویویل کوئی روشنی نہیں ڈال سکے۔

ہمارے اصرار کے نتیجے میں، یہ تجویز کیا گیا کہ مجلس منتظمہ کا ایک رکن جنگ سے متعلقہ تمام مسئلوں کا نگراں ہوگا۔ کرپس نے ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جنگ کی قیادت کی ذمے داری میں ہندستان کی شمولیت، اس طرح یقینی ہو جائے گی۔ بہر نوع ان کے لیے صاف صاف یہ کہنا مشکل تھا کہ ہندستانی رکن اور کمانڈر انچیف کے مابین رشتے کی نوعیت کیا ہوگی ——— خاص طور پر اسی سوال کے بارے میں گفتگو کے لیے انھوں نے ویویل سے میری ملاقات کا اہتمام کیا۔ جب میں نے ویویل سے یہ پوچھا کہ کیا مجلس کے ہندستانی رکن کا رول ایک ذمے دار وزیر کابینہ کے جیسا ہوگا تو وہ کوئی دو ٹوک جواب نہیں دے سکے۔ اُن سے گفتگو کے بعد جو نتیجہ میں نے نکالا، یہ تھا کہ ہندستانی رکن کے سپرد ذمے داریاں تو کی جائیں گی، مگر کوئی اختیار نہیں۔ وہ کینٹین، رسد کے محکمے اور ٹرانسپورٹ کا انچارج ہوگا لیکن شریک جنگ افواج کے معاملے میں، اس کو مداخلت کا حق تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوگا۔

اس قضیے کا خلاصہ مختصراً حسب ذیل طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ کرپس کی پیشکش کا زور اس بات پر تھا کہ جنگ کے بعد، ہندستانی آزادی تسلیم کر لی جائے گی ———، جنگ کے دوران، واحد تبدیلی یہ ہوگی کہ مجلس منتظمہ تمام و کمال ہندستانی ہوگی اور اس میں سیاسی جماعتوں کے لیڈر شامل ہوں گے۔ فرقہ وارانہ مسئلے کے بارے میں، کرپس نے کہا کہ جنگ کے بعد، صوبوں کو اس فیصلے کا اختیار ہوگا کہ وہ یونین میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔

میں نے کرپس کی (پیش کردہ) تجویز کے اس بنیادی اصول پر اعتراض نہیں کیا تھا کہ آزادی جنگ کے بعد تسلیم کی جائے گی ——— بہرحال، میں یہ محسوس کرتا تھا کہ جب تک عملی اختیار اور ذمے داری جنگ کے دوران مجلس کے سپرد نہیں کی جاتی، یہ تبدیلی معنی خیز نہیں ہوگی۔ ان سے میری پہلی گفتگو کے دوران کرپس نے اس نقطے پر مجھے یقین دلایا تھا اور کہا تھا کہ مجلس ایک کابینہ کی طرح کام کرے گی۔ بات چیت کے ساتھ یہ واضح ہوتا گیا کہ یہ (یقین دہانی) ایک شعری مبالغہ تھا ——— اُن کی اصل پیش کش خاصی مختلف تھی۔

اس سے بھی بڑی رکاوٹ صوبوں کو دیا جانے والا یہ اختیار تھا کہ وہ چاہیں تو یونین میں شامل نہ ہوں۔ اس نے اور فرقہ وارانہ مسئلے کی بابت کرپس کے مجوّزہ حل نے گاندھی جی کو بہت زیادہ پریشان کیا تھا۔ اس کے خلاف اُن کا ردِ عمل بہت شدید تھا۔ کرپس سے اپنی پہلی ملاقات کے بعد، جب میں گاندھی جی سے ملا تو میں نے فوراً یہ سمجھ لیا کہ کرپس کی تجویز کو وہ کلیتاً ناقابلِ قبول تصوّر کرتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ (تجویز) ہماری مشکلات کو صرف بڑھائے گی اور فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کو ناممکن بنا دے گی۔

اس مد کے مضمرات پر کرپس سے میں نے تفصیلی گفتگو کی۔ میں نے ان سے یہ بتانے کی درخواست کی کہ وہ اور جنگی کابینہ میں ان کے ساتھی واقعتاً کیا سوچ رہے ہیں۔ کرپس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہندستانی سیاسی مسئلہ اس وقت تک حل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہ کر لیا جائے ـــــــ یہ دو میں سے ایک طریقے سے ممکن ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اسے فی الفور طے کر لیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کوئی بھی فیصلہ جنگ کے بعد تک کے لیے موقوف رکھا جائے، جب اقتدار ہندستانی ہاتھوں میں آ جائے گا ـــــــ کرپس نے کہا کہ ان کے خیال میں بسرِ دست اس مسئلے کو اٹھانا غلط ہوگا۔ یہ مشکلات کو صرف بڑھائے گا، اس لیے، قابلِ عمل بات صرف یہ ہوگی کہ جنگ کے اختتام کا انتظار کیا جائے۔ انھوں نے، بہرحال مجھے باور کرایا کہ اگر ہندو اور مسلمان آپس میں ایک معاہدہ کر لیں، تو اسی وقت ایک حل نکالا جا سکتا ہے۔

میں نے کرپس کو بتایا کہ صوبوں کو (اپنی مرضی کے مطابق یونین میں شامل ہونے یا) شامل نہ ہونے کا جو اختیار دیا گیا ہے اس کا مطلب علاحدگی پسندی کا دروازہ کھولنا ہے۔ کرپس نے اپنی پوزیشن کا دفاع کرنے کی کوشش، یہ کہتے ہوئے کی کہ اختیار مجموعی طور پر صوبوں کو دیا گیا ہے، کسی مخصوص فرقے کو نہیں ـــــــ یہ بات ان کے دماغ میں بیٹھ چکی تھی کہ صوبوں کا یہ حق انتخاب ایک بار تسلیم کر لیا جائے تو پھر واقعتاً کوئی صوبہ اس کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ دوسری طرف اس حق کا نہ دیا جانا، شک و شبہے اور بے اعتباری کو بڑھاوا دے گا۔ صوبے اس سوال کو معروضی طور پر اسی صورت میں دیکھ سکیں گے جب وہ محسوس کرنے لگیں گے کہ انھیں اپنی مرضی کے مطابق

فیصلہ کرنے کی مکمل آزادی ہے۔

ایک صبح جب ہم اس مسئلے پر گفت گو کر چکے تھے، اس کے بعد، کرپس نے اسی شام مجھے فون کیا کہ اگلے روز سر سکندر حیات خاں اُن سے ملنے کے لیے آرہے ہیں۔ کرپس کو امید تھی کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے میں سر سکندر مددگار ثابت ہوں گے۔ پنجاب سب سے بڑا مسلم اکثریتی صوبہ تھا اور اگر پنجاب نے ہندستان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا، تو اس سے دوسرے مسلم اکثریتی صوبوں کی بھی رہنمائی ہوگی۔ میں نے انھیں بتایا کہ مجھے شک ہے کہ سر سکندر اس مسئلے کو حل کر سکیں گے، لیکن چونکہ وہ دہلی آرہے ہیں، مجھے اُن سے مل کر خوشی ہوگی۔

اگلے روز سر سکندر دہلی آگئے اور کرپس سے ملاقات کے بعد وہ مجھ سے ملے۔ ان کی رائے میں، کرپس کی پیشکش فرقہ وارانہ مسئلے کا بہترین ممکنہ حل تھی۔ انھیں یقین تھا کہ اگر پنجاب اسمبلی میں اس معاملے پر ووٹنگ ہوئی تو اس کا فیصلہ قومی خطوط پر ہوگا، فرقہ وارانہ خطوط پر نہیں۔ میں نے مان لیا کہ اگر اسی وقت ووٹ لیے گئے تو ان کی پیش گوئی صحیح ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جنگ کے اختتام پر کیا کچھ ہوگا، یہ بتانا ان کی یا میری بساط سے باہر ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس وقت بھی ان کا اتنا ہی اثر ہوگا جتنا کہ ابھی ہے۔

ہندستانی ریاستوں کے بارے میں، کرپس کی پیشکش ریاستوں کے نمائندوں کو اپنے مستقبل کے فیصلے کی پوری آزادی دیتی تھی۔ اس میں، بہر نوع، یہ اختیار بھی شامل تھا کہ وہ صوبوں کی طرح چاہیں تو (یونین سے) الگ رہیں۔ میرے لیے، کرپس سے انصاف کرتے ہوئے، اس واقعے کی نشاندہی ضروری ہے کہ ریاستوں کے نمائندوں سے اپنی گفتگو میں کرپس واضح اور صاف گو تھے۔ مہاراجہ کشمیر سے انھوں نے کہا کہ اس ریاست کا مستقبل ہندستان کے ساتھ ہے۔ کسی والیِ ریاست کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچنا چاہیے کہ اگر اس نے الگ رہنے کا فیصلہ کیا تو برطانوی حکمراں اس کی مدد کو آن پہنچیں گے۔ چنانچہ، والیانِ ریاست کو اپنے مستقبل کے لیے حکومتِ ہند کی طرف دیکھنا ہوگا نہ کہ تاجِ برطانیہ کی طرف ——— مجھے یاد ہے کہ ریاستوں کے نمائندوں میں سے بیشتر، کرپس سے گفت گو کے بعد، خستہ و شکستہ دکھائی دیتے تھے۔

ورکنگ کمیٹی نے کرپس کی لائی ہوئی تجویزوں پر ایک قرارداد پہلے ہی منظور کر لی تھی۔ یہ ۲ر اپریل کو انھیں بھیجی گئی لیکن مذاکرات کے بالآخر ٹوٹ جانے تک، اسے پریس کے لیے جاری نہیں کیا گیا۔ ہندستان کو اقتدار کی منتقلی کے عام سوال سے قطع نظر، ایک بڑی دشواری کمانڈر انچیف اور مجلس منتظمہ کا وہ رکن جو دفاع کا انچارج ہوتا، ان دونوں کے اختیارات کی تعیین کے سوال پر پیدا ہو گئی ———— کرپس کی تجویز تھی کہ ہندستانی رکن خاص طور پر تعلقاتِ عامہ، افواج کی سب، دوشی، جنگ کے بعد کی تعمیری اور دفاعی افواج کے اراکین کو وسائل کی فراہمی کا ذمّے دار ہوگا۔ کانگریس ان ذمّے داریوں کو کلیتاً ناکافی سمجھتی تھی اور اس نے ایک جوابی تجویز پیش کی تھی کہ وزیرِ دفاع، سوائے اُن اختیارات کے جو جنگ کی قیادت کے لیے کمانڈر انچیف کو حاصل ہوتے ہیں، دوسرے تمام امور کا انچارج ہوگا۔ کرپس نے جواب الجواب کے طور پر کچھ اور تجویزیں پیش کر دیں، لیکن چونکہ وہ تمام اہم امور کمانڈر انچیف کے لیے مخصوص کر دینا چاہتے تھے، اس لیے یہ تجویزیں بھی غیر اطمینان بخش ثابت ہوئیں۔

کرپس سے میری ایک اور میٹنگ ۹ر اپریل کی سہ پہر کو دیر گئے ہوئی اور ۱۰ر کی صبح کو میں نے ورکنگ کمیٹی کے سامنے اپنی گفتگو کا نتیجہ بیان کیا۔ افسوس کے ساتھ ہمیں یہ طے کرنا پڑا کہ برطانوی حکومت کی تجویزیں، جس شکل میں سامنے آئیں، قابلِ قبول نہیں تھیں۔

چنانچہ، ۱۰ر اپریل ۱۹۴۲ء کو میں نے سر سٹیفرڈ کو لکھا کہ اعلانیے کی عبارت (ڈرافٹ ڈیکلیریشن) میں ہندستانی مسائل کی طرف رویّہ نہ صرف یہ کہ غلط ہے، اس سے مستقبل میں دشوار تر پیچیدگیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے ۱۱ر اپریل کو ایک جواب لکھا جس میں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کی تجویزیں ہندستانی مسئلے کا بہترین ممکنہ حل پیش کرتی ہیں، اور اس بات پر اصرار کیا کہ انھوں نے کسی بھی منزل پر اپنی پوزیشن تبدیل نہیں کی۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے الزام کانگریس کے سر منڈھنے کی کوشش کی اور اپنا جواب وہ شائع کرنا چاہتے تھے۔ میں نے اسی روز جواب دیا جس میں ان کے اعتراض پر افسوس کیا گیا تھا، اور اس امر کی نشاندہی بھی تھی کہ یہ مراسلت کسی بھی غیر جانبدار مشاہد کو یہ یاد کرا دے گی کہ ان کے مشن کی ناکامی میں قصور خود ان کا اپنا ہے، کانگریس کا نہیں۔ میرے دونوں خطوں کے اہم

نکات ذیل میں دے دیے گئے ہیں، لیکن دلچسپی رکھنے والے قارئین پوری مراسلت ضمیمہ ۳ میں دیکھ سکتے ہیں۔

سر سٹیفرڈ کے نام ۱۰ ار اور ۱۱ ار اپریل ۱۹۴۲ء کو اپنے دونوں خطوں میں جو کچھ لکھا تھا، وہ مختصراً یہ ہے: ———— * اگر برطانوی حکومت سچ مچ اس کی خواہاں تھی کہ اس حد تک تاخیر کے بعد، ہندستانیوں میں ایک نئی روح پھونک دی جائے، اور اس نے اس مقصد کو پانے کے لیے سر سٹیفرڈ کا جیسا صاحب مرتبہ شخص بھیجا تھا تو آسان ترین بات یہ ہوتی کہ انہی کے توسط سے یہ اعلانیہ بھی بھجوا دیا جاتا کہ برطانیہ اقتدار سے سبکدوش ہونے پر تیار ہے۔ اس کے بجائے برطانوی حکومت نے معینہ تجاویز مرتب کی تھیں اور ایک بار اس پر عمل ہو گیا تو ہندستانی جماعتوں میں آزادانہ معاہدے کا مرحلہ زیادہ دشوار ہو جائے گا *

میں نے سر سٹیفرڈ کو یہ بھی بتایا کہ اعلانیے (ڈرافٹ ڈیکلیریشن) میں لمحۂ موجود سے زیادہ زور مستقبل پر دیا گیا تھا جب کہ ہندستان کو اپنے موجودہ نظام میں تبدیلی کی ضرورت ہے

* موجودہ صورت حال سے متعلق تجاویز جو اس اعلانیے میں شامل ہیں، مثبت نہیں ہیں بلکہ منفی ہیں۔ دریں حالات میں نہیں سمجھتا کہ کس طرح کانگریس ان تجاویز کو قبول کر سکتی ہے میں نے کہا کہ جنگ ہندستان کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ دشمن سے مقابلے کے لیے ہندستانی عوام میں حوصلے اور اعتماد کی ضرورت تھی لیکن برطانوی رویے کی وجہ سے لکھو کھا انسان جو اپنے ملک کے لیے خود کو قربان کر سکتے تھے، ان کے دلوں سے روشنی رخصت ہو چکی ہے۔ میں نے اس امر کی نشاندہی کی کہ ہمارا مشترکہ مرحلہ، اب اس کا متقاضی ہے کہ ہندستانیوں کے دلوں میں وطن پرستانہ جذبے کی چنگاری کو پھر سے روشن کرنے کے لیے، ہم ایک نفسیاتی رویہ تلاش کریں۔ اس کا حصول صرف مستقبل سے متعلق وعدوں کے ذریعے ممکن نہیں * بلکہ لوگوں کو یہ محسوس کرانا چاہیے کہ آج وہ اپنے ملک میں آزاد ہیں اور انھیں اپنی آزادی اور اپنے ملک کی حفاظت کرنی ہے۔

* میرے خط میں یہ نشاندہی بھی کی گئی تھی کہ فی الوقت، ملک کا دفاع ہمارا اعلاترین مطالبہ ہے۔ جنگ کے دوران، سول انتظامیہ کو جنگ کے تقاضوں کا تابع ہونا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ دفاعی مسائل ہر سول محکمے میں سرایت کر جاتے ہیں ———— دفاع کو دوسرا یا کمتر

انچیف کے لیے محفوظ رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام اختیارات سے ——— بظاہر جو ہندستانی ہاتھوں میں منتقل کیے جاچکے ہیں ان اختیارات سمیت ——— ہندستان کو محروم رکھا جائے گا۔*

ایک اور نکتہ جس پر میں نے زور دیا، یہ تھا کہ کانگریس فرقہ دارانہ مسئلے کو حل کرنے کی اہمیت سے اچھی طرح باخبر تھی۔ ہم یہ جانتے تھے کہ ہندستان میں سیاسی سوال سے نمٹتے وقت، کسی نہ کسی منزل پر فرقہ وارانہ سوالوں کا اٹھ کھڑا ہونا ناگزیر تھا، اور انھیں، بہرحال حل کرنا تھا۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ جیسے ہی سیاسی مسئلہ طے ہوجائے گا، فرقہ دارانہ یا دوسرے مسئلوں کا اطمینان بخش حل ڈھونڈنے کی ذمے داری ہماری ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ ہم جیسے ہی سیاسی سوال کو حل کرسکے، فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی تشفی بخش حل بھی تلاش کرلیں گے۔

اس کے بعد میں نے افسوس کے ساتھ یہ نشاندہی بھی کی کہ سر سٹیفرڈ سے میری پچھلی گفتگوؤں کے نتیجے میں جو تصویر ابھری تھی، اس کا ابتدائی تاثر، جیسے جیسے مادّی نکات پر بات چیت درجہ بدرجہ آگے بڑھتی گئی، بتدریج دھندلا ہوتا گیا ——— ۹ اپریل کی رات کو جب میں آخری بار ان سے ملا، تو ساری تصویر یکسر تبدیل ہوچکی تھی اور مصالحت کی امیدیں معدوم ہوگئی تھیں۔

چونکہ سر سٹیفرڈ نے کہا تھا کہ میرے نام اپنا خط وہ شائع کرنا چاہتے ہیں، میں نے جواباً عرض کیا کہ غالباً انھیں اعتراض نہ ہوگا، اگر میں یہ تمام مراسلت اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ قرارداد جو ہم نے منظور کی تھی، پریس کو جاری کردوں۔ یہ قرارداد تمام مستند تاریخوں میں موجود ہے اور میرے لیے یہ ضروری نہیں کہ یہاں اسے نقل کروں۔ کرپس نے اپنے جواب میں لکھا کہ انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا چنانچہ یہ (تمام کاغذات) ۱۱ اپریل کو پریس کے لیے جاری کردیے گئے۔

میں نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۲ء کو ایک پریس کانفرنس کا انعقاد بھی کیا جہاں صحافیوں کی ایک بڑی تعداد سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے ان کے سامنے ان اسباب کی وضاحت کی جن کی بنا پر ہم نے کرپس کی پیشکش مسترد کردی تھی۔ مجھے یہاں تفصیل کے ساتھ انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ متذکرہ قرارداد اور مراسلت دونوں میں شامل کردیے گئے تھے۔ میں نے اس نکتے پر خاص زور دیا کہ گفتگو بڑھنے کے ساتھ ساتھ، ہمیں پتہ چلا کہ سر سٹیفرڈ کی بنائی ہوئی

گلابی تصویر رفتہ رفتہ دھندلی ہوتی گئی ——— ماحول میں اس تبدیلی کا عکس لارڈ ویویل سے میری بات چیت میں بھی موجود تھا۔ ہماری گفت و شنید کے دوران، سرسٹیفرڈ نے بار بار ان تکنیکی مشکلات پر زور دیا جو کسی ہندستانی رکن کو دفاع (کے تمام اختیارات) کی منتقلی کے راستے میں پڑتی تھیں۔ یہ انہی کے مشورے پر ہوا کہ ہم نے جنرل ویویل سے ملاقات کی تھی، کیونکہ وہ زیادہ بہتر طریقے سے سوال کے تکنیکی پہلو کی وضاحت کر سکتے تھے۔ ایک خاصی حیرانی کی بات ہے کہ کمانڈر انچیف سے ہماری پوری گفتگو کے دوران، جس میں دو دیگر فوجی عہدیدار بھی شامل تھے۔ کسی تکنیکی دشواری کی بابت ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا۔ تمام تر بحث سیاسی خطوط پر آگے بڑھتی رہی۔ مجھے ایک پل کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہم ایک فوجی ماہر سے انٹرویو کر رہے تھے، دراصل لارڈ ویویل ایک منجھے ہوئے سیاست داں کی طرح بات کرتے تھے۔

پریس کانفرنس کے دوران، میں نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ان بحثوں میں جو مہاتما گاندھی کا جو حصہ تھا، اس کے بارے میں، اخبارات کے ایک حلقے میں بعض قیاس آرائیوں کی پیدا کردہ پوزیشن کو صاف کرتا چلوں۔ کسی بھی جنگ میں شمولیت سے متعلق گاندھی جی کے خیالات کا سب کو پتہ تھا اور یہ کہنا سرے سے غلط ہوگا کہ ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کسی بھی شکل میں ان خیالات سے متاثر ہوئے تھے۔

گاندھی جی نے ورکنگ کمیٹی پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دی تھی کہ ہم تجاویز کی خوبیوں اور خرابیوں کی بابت اپنے طور پر فیصلہ کرنے کے لیے پوری طرح آزاد تھے، انھوں نے ورکنگ کمیٹی کی پچھلی نشستوں میں شرکت تک نہیں کرنی چاہی تھی اور یہ صرف میرے اصرار پر ہوا تھا کہ وہ کئی روز تک ٹھہرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ پھر انھیں یہ محسوس ہوا کہ اب مزید قیام ان کے لیے ممکن نہیں، اور میری تمام ترغیبیں انھیں متاثر کرنے میں ناکام رہیں۔

میں نے اپنا پچھلے روز کا بیان بھی دوہرایا کہ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ ہر منزل پر متفقہ تھا۔

میں نے یہ کہتے ہوئے (پریس کانفرنس) میں اپنی بات ختم کی کہ یہ محل بہت افسوس کا تھا ہم اس نصب العین تک، جس کو ہم سب بے حد عزیز رکھتے تھے، نہیں پہنچ سکے، لیکن اسے

ریکارڈ کر لینا چاہیے کہ یہ تمام مباحث، اس کے باوجود کہ گہرے اختلافات بھی رونما ہوئے جو بعض اوقات پرجوش کشمکش کا سبب بنے (بالعموم) ایک دوستانہ ماحول میں جاری رکھے گئے۔ سر سٹیفرڈ اور میں، ایک دوسرے سے دوستوں کی طرح رخصت ہوئے اور گفتگو کی گرمجوشی اخیر تک برقرار رہی۔

جہاں تک کانگریس کا تعلق تھا، (اُس کے لیے) کرپس مشن بایں طور اختتام پذیر ہوا۔ لیکن، جواہر لال اور راج گوپال آچاری کے ساتھ معاملہ یہ نہیں تھا۔ ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کے اگلے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے، مَیں ان واقعات کی طرف دونوں کے ردعمل کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا۔

کرپس کی روانگی کے فوراً بعد جواہر لال نے نیوز کرانیکل (NEWS CHRONICLE) کے نمائندے کو ایک انٹرویو دیا۔ اس انٹرویو کے پورے لہجے اور رویّے سے ایسا لگتا تھا کہ کانگریس اور انگریزوں کے مابین اختلافات کو کم کر کے دکھایا جا رہا ہے۔ جواہر لال نے یہ ظاہر کرنا چاہا کہ گرچہ کانگریس نے کرپس کی پیشکش مسترد کر دی تھی، ہندوستان انگریزوں کی مدد کے لیے تیار تھا، اور اپنا پورا تعاون صرف اُس پالیسی کی وجہ سے نہیں دے پا رہا تھا جو برطانوی حکومت نے اختیار کر رکھی تھی۔

مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ ایک تجویز یہ تھی کہ جواہر لال کو آل انڈیا ریڈیو سے ایک بیان نشر کرنا چاہیے۔ ان کے رویّے کی بابت میں، جو کچھ جانتا تھا، اس سے مجھے ڈر تھا کہ کہیں اُن کا بیان پبلک کے ذہن میں الجھن نہ پیدا کر دے ———— جواہر لال الٰہ آباد کے لیے پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے اور مَیں نے بھی کلکتے کو واپسی کی تیاریاں کر لی تھیں۔ مَیں نے فیصلہ کیا کہ مَیں راستے میں رُک جاؤں گا اور ان سے مزید بات چیت کروں گا۔ مَیں نے یہی کیا اور جواہر لال سے صاف صاف یہ کہا کہ اب جبکہ ورکنگ کمیٹی ایک قرارداد منظور کر چکی ہے، انھیں کچھ بھی کہتے وقت بہت محتاط رہنا چاہیے۔ اگر انھوں نے کوئی ایسا بیان دے دیا جس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ کانگریس کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان برطانیہ کی مدد پر رضامند تھا لیکن صرف ایک آزاد ملک کی حیثیت سے وہ یہ (مدد) کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان کا رویّہ بھی یہی ہے۔ اسی لیے اگر انھوں نے کوئی ایسی

بات کہہ دی جس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ ہندستان برطانوی رویّے کا لحاظ کیے بغیر، جنگی تیاری میں تعاون پر راضی ہے، تو قرار داد بے معنی ہوجائے گی۔ میں نے، اسی لیے، یہ درخواست کی کہ کوئی بیان دینے سے وہ باز رہیں ——— پہلے تو انھوں نے مجھ سے بحث کی لیکن آخر میں میرا نقطۂ نظر انھوں نے سمجھ لیا۔ چنانچہ مجھے بہت خوشی ہوئی جب انھوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ سرے سے کوئی بیان دیں گے ہی نہیں۔ اور اس نشریے کو جس کا وہ وعدہ کر چکے تھے ——— منسوخ کر دیں گے۔

میں اسے مطلقاً واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جواہر لال کا یہ رویّہ ہندستان کی آزادی کے سلسلے میں کسی شک کی وجہ سے نہیں تھا۔ ان کا رویّہ، بین الاقوامی صورت حال کی اُن کی تفہیم کا ایک فطری نتیجہ تھا۔ شروع ہی سے وہ ایک مصدّقہ اینٹی فاشسٹ تھے۔ ان کے دورۂ چین اور چیانگ کائی شیک سے اُن کی گفتگو نے فاشزم سے اُن کی نفرت کو مستحکم کر دیا تھا۔ جاپان کے خلاف چین کی جدّوجہد سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے تھے کہ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ کسی بھی قیمت پر جمہوریتوں کی حمایت کی جانی چاہیے ——— واقعہ یہ ہے کہ انھیں اس بات پر حقیقی افسوس اور اذیت تھی ہندستان جمہوریتوں کے ساتھ لڑائی میں شریک نہیں ہے۔

میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ جواہر لال ہمیشہ، دوسرے بیشتر ہندستانیوں کی بہ نسبت، بین الاقوامی مصلحتوں سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ تمام سوالات کو قومی سے زیادہ، وہ ایک بین الاقوامی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ بین الاقوامی مسئلوں کے تئیں ان کے سروکار میں، میں بھی شریک تھا، لیکن میرے نزدیک ہندستان کی آزادی کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ جمہوریتیں کم تر بدی (LESSER EVIL) کی نمائندہ ہیں، لیکن میں یہ فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ جب تک ہندستان کے معاملے میں جمہوری اصول کا اطلاق نہیں ہوگا، جمہوریت کے تمام دعوے کھوکھلے اور غیر مخلصانہ محسوس ہوں گے ——— پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے واقعات کا سلسلہ بھی مجھے یاد تھا۔ اس وقت انگریزوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ برطانیہ چھوٹی اقوام کے حقوق کی حفاظت کے لیے جرمن امپیریلزم سے لڑ رہا تھا۔ جنگ میں یونائٹڈ اسٹیٹس کے داخلے پر، صدر ولسن نے اپنے مشہور چودہ نکات (FOURTEEN POINTS) مرتب کیے اور تمام قوموں کے حقِ خود

اختیاری کی وکالت کی ——— باوجود اس کے، ہندستان کے حقوق کا احترام نہیں کیا گیا۔ نہ ہی چودہ نکات، کا اطلاق کبھی ہندستان کے معاملے میں کیا گیا۔ اسی لیے، مجھے محسوس ہوا کہ جمہوری خیمے کے بارے میں ساری گفتگو بے معنی ہے تاوقتیکہ ہندستان کے معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے۔ میں نے یہ تمام باتیں ایک انٹرویو میں کہہ دیں جو تقریباً ایک ہفتے بعد، نیوکرانیکل (NEW CHRONICLE) کو دیا گیا تھا۔

اس پوری مدت میں جواہر لال ایک زبردست ذہنی دباؤ کی کیفیت میں مبتلا رہے۔ وہ حال ہی میں چین سے واپس آئے تھے اور جنرلیسیمو اور مادام چیانگ کائی شیک سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ یہ بات ان پر واضح ہو چکی تھی کہ اگر چین جاپان کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرنا چاہتا ہے تو اسے ہندستان سے لازماً مدد درکار ہوگی ——— ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے دوران، ایک شام جواہر لال میرے پاس آئے۔ ہماری گفتگو نے مجھے باور کرا دیا کہ وہ کرپس کی پیشکش قبول کرنے کے حق میں ہیں خواہ برطانوی موقف میں کوئی بھی تبدیلی نہ ہو۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ کرپس کی موافق یقین دہانیوں کی روشنی میں، ہمیں جھجکنا نہیں چاہیے ——— جواہر لال نے یہ بات لفظوں میں کھل کر تو نہیں کہی لیکن ان کے تمام دلائل کا رُخ اسی طرف تھا۔

اس گفتگو کے نتیجے میں، میں بے حد پریشان ہوا اور رات کے تقریباً دو بجے تک میں سو نہیں سکا۔ جیسے ہی میری آنکھ کھلی، میں شریمتی رامیشوری نہرو کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جہاں جواہر لال ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک گھنٹے سے زیادہ ہم مختلف مسئلوں پر بحث کرتے رہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کے خیالات کا میلان ہمارے بہترین مفادات کے خلاف تھا۔ اگر حقیقی اقتدار ہندستان کے حوالے نہیں کیا گیا اور صرف ایک نئی مجلس منتظمہ بنا دی گئی تو ہمیں ایک اکیلی چیز جو کرپس سے ملے گی، بس ایک وعدہ ہے، اور یہ وعدہ بھی جنگ کے بعد پورا کیا جائے گا۔ موجودہ حالات میں، اس طرح کے کسی وعدے کی قدر قیمت بہت کم ہے۔ کس کو پتہ ہے کہ جنگ کا اختتام کیا ہوگا۔ ہم جنگ میں ایک آزاد ملک کی حیثیت سے شریک ہونے پر تیار تھے۔ کرپس کی پیشکش نے اس نکتے پر ہمیں کچھ بھی نہیں دیا۔

یہاں تک کہ جنگ میں شریک ہونے کا فیصلہ بھی ہمارا نہیں بلکہ وائسرائے کا تھا۔ کرپس چاہتے تھے کہ وائسرائے کا یہ فیصلہ ہم تسلیم کر لیں، ہمیں موقع دیے بغیر کہ ہم خود سے یہ فیصلہ کریں۔ اگر اس پر بھی ہم پیش کش قبول کر لیں گے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ہمارے اب تک کے تمام فیصلے غلط تھے۔

میں نے یہ دلیل بھی رکھی کہ جنگ کے بعد دنیا لازمی طور پر تبدیل ہوگی۔ کوئی بھی شخص جو دنیا کی سیاسی صورت حال سے آگاہ ہے، اس میں شک نہیں کر سکتا کہ ہندستان آزاد ہو کر رہے گا۔ چنانچہ کرپس کی پیشکش نے درحقیقت ہمیں کچھ نہیں دیا۔ اگر ہم نے اس پیش کش کو قبول کر لیا تو مستقبل میں ہمیں پشیمانی ہو سکتی ہے۔ بالفرض انگریز اپنے وعدے سے مکر گئے تو ہمارے پاس ایک نئی جدوجہد کے آغاز کا جواز تک نہیں ہوگا۔ جنگ نے ہندستان کو اپنی آزادی کے حصول کا ایک موقع فراہم کیا تھا۔ ہمیں محض ایک وعدے پر بھروسہ کر کے اس موقع کو کھونا نہیں چاہیے۔

ان تمام واقعات سے جو رونما ہو رہے تھے، جواہرلال پر شدید اضمحلال طاری تھا۔ یہ صاف تھا کہ اپنی پوزیشن کے سلسلے میں اُن کا ذہن واضح نہیں ہے۔ ان کے ذہن میں جاری کشمکش نے انھیں بےبسی کے احساس سے دوچار کر رکھا تھا۔ چند لمحوں تک وہ خاموش رہے، پھر بولے میں ایک پل کے لیے بھی اپنے شخصی میلانات کے مطابق کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔ اپنے دماغ سے اس نقطے پر تمام شکوک رفع کر دیجیے ——— میرا فیصلہ وہی ہوگا جو میرے ساتھیوں کا ہوگا۔

جواہرلال کی طبیعت ایسی ہے کہ جس وقت ان کے دماغ میں کوئی تناؤ ہو، وہ سوتے ہیں بھی بڑبڑاتے ہیں۔ دن بھر کی فکرمندیاں خوابوں کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ جب میں باہر نکلا تو شریمتی رامیشوری نہرو نے بتایا کہ پچھلی دو راتوں سے جواہرلال نیند میں بولتے رہے ہیں۔ انھوں نے ایک بحث چھیڑ رکھی تھی، کبھی بڑبڑاتے، کبھی زور سے بولنے لگتے۔ شریمتی نہرو نے انھیں کرپس کا نام لیتے سنا تھا۔ کبھی گاندھی جی کا ذکر کرتے، کبھی میرا نام لیتے ——— یہ مزید ثبوت اس بات کا تھا کہ کتنے زبردست دباؤ میں جواہرلال کا ذہن کام کر رہا تھا۔

دوسری شخصیت جس پر مذاکرات کا بہت گہرا اثر پڑا، شری راجگوپال آچاری کی تھی۔ کچھ عرصے سے ملک کی گرتی ہوئی فرقہ وارانہ صورت حال کی وجہ سے وہ بہت زیادہ پریشان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندستان کی آزادی کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین اختلافات کے باعث رُکی ہوئی تھی۔ صورت حال کے مطالعے نے مجھے اس نتیجے تک پہنچایا تھا کہ جنگ کی مدت کے دوران انگریز کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے، اور دونوں فرقوں میں اختلافات انھیں صرف ایک بہانہ فراہم کرتے ہیں کہ اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھا جائے ——— راجگوپال آچاری اس (رائے) سے متفق نہیں تھے اور کرپس کی پیش کش کے مسترد کیے جانے کے فوراً بعد انھوں نے کھلے عام کہنا شروع کر دیا تھا کہ بس اگر کانگریس مسلم لیگ کے مطالبات کو تسلیم کرلے تو ہندستانی آزادی کے راستے سے رکاوٹیں ہٹ جائیں گی۔ عام سطح پر اپنے خیالات کے اظہار کو کافی نہ سمجھتے ہوئے، انھوں نے مدراس کانگریس لیجسلیچر پارٹی میں ایک قرارداد پیش کروائی جو دراصل کانگریس کے موقف کو رد کرتی تھی۔ اس قرارداد کی عبارت نے کانگریسیوں میں زبردست ناراضگی پیدا کی اور انھوں نے بہت سے احتجاجی مراسلے مجھے بھیجے۔

اس قرارداد کو پیش کروانے سے پہلے راجگوپال آچاری نے مجھ سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی انھوں نے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، کسی اور ساتھی سے مشورہ کیا تھا۔ میں نے جب قرارداد کے بارے میں اخباروں میں پڑھا تو بہت پریشان ہوا۔ اگر ورکنگ کمیٹی میں۔ میرے قریبی ساتھیوں میں سے ایک، کانگریس کے فیصلے کے خلاف بولنا پھرے گا تو اس سے نہ صرف یہ کہ تنظیم کی ڈسپلن کمزور ہوگی، عوام کے ذہن میں انتشار بھی پیدا ہوگا اور امپیریل طاقت کے ہاتھ میں ایک بہانہ آجائے گا ——— چنانچہ مجھے خیال ہوا کہ اس معاملے پر ورکنگ کمیٹی میں بحث ہونی چاہیے۔

میں نے راجگوپال آچاری کو بتایا کہ مدراس لیجسلیچر کی منظور کردہ قرارداد میں کانگریس کی متعینہ پالیسی سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ ورکنگ کمیٹی کے ایک ذمے دار رکن کی حیثیت سے انھیں ایسی قراردادوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اگر اس موضوع پر وہ شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے، تو انھیں اپنے خیالات کو عام کرنے سے پہلے ورکنگ کمیٹی میں اپنے ساتھیوں

سے اس معاملے پر گفت گو کرنی چاہیے تھی۔ اگر ورکنگ کمیٹی ان سے اتفاق نہ کرتی تو انھیں یہ آزادی حاصل تھی کہ استعفیٰ دے دیتے اور اس کے بعد اپنے خیالات کا پرچار کرتے۔

شری راجگوپال آچاری نے اعتراف کیا کہ مدراس لیجسلیچر میں قراردادوں کے پیش کیے جانے سے پہلے انھیں اس معاملے پر ورکنگ کمیٹی میں بات کرنی چاہیے تھی —— بہر حال وہ ان دونوں قراردادوں کو واپس لینے سے قاصر تھے کیونکہ یہ ان کے سوچے سمجھے خیالات کی نمائندگی کرتی تھیں۔ انھوں نے میرے نام ایک خط لکھا جس میں انھوں نے صدر سے مشورہ کیے بغیر، ایک انتہائی متنازعہ سوال کے بارے میں اپنے خیالات کھلے عام بیان کرنے پر اظہار افسوس کیا تھا اور ورکنگ کمیٹی سے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔

٦

بے چینی کا وقفہ

کرپس مشن کی ناکامی سے ملک بھر میں مایوسی اور غصّے کی فضا پیدا ہوگئی۔ بہت سے ہندستانی یہ سوچتے تھے کہ چرچل کابینہ نے سرسٹیفرڈ کو صرف امریکی اور چینی دباؤ کی وجہ سے بھیجا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسٹر چرچل ہندستانی آزادی کو تسلیم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ بہت سی جماعتوں کے ساتھ طول کھینچنے والے مذاکرات کا مقصد بیرونی دنیا پر محض یہ ثابت کرنا تھا کہ کانگریس ہندستان کی صحیح نمایندہ نہیں تھی، اور یہ کہ ہندستانیوں کا عدم اتحاد اصل سبب تھا جس کی بنا پر انگریز ہندستانی ہاتھوں میں اقتدار منتقل نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ خود کانگریسیوں میں غلط فہمی اور انتشار پھیلا ہوا تھا، میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ایک میٹنگ طلب کرنے کا فیصلہ کیا —— یہ میٹنگ ۲۹ اپریل سے ۲ مئی ۱۹۴۲ء تک الٰہ آباد میں ہوئی، اور اس سے پہلے ورکنگ کمیٹی کا ایک اجلاس ۲۷ اپریل سے یکم مئی تک ہوا تھا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ ڈیڑھ ماہ پہلے ہم نے واردھا میں ایک میٹنگ کی تھی۔ اس وقت یہ پتہ چلا تھا کہ برطانوی حکومت نے ہندستانی مسئلے کی طرف ایک نیا انداز نظر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اعلان کیا گیا کہ جنگی کابینہ کے

ایک رکن، سر سٹیفرڈ کرپس ہندستانی مسئلے کو طے کرنے کی غرض سے نئی تجویزوں کے ساتھ ہندستان کے لیے روانہ ہوں گے۔ واردھا میں ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے مجھے کانگریس کی طرف سے، سر سٹیفرڈ سے ملاقات کرنی چاہیے۔
میں نے سر سٹیفرڈ سے سلسلہ وار کئی ملاقاتیں کیں اور انھیں بتایا کہ اعلانیے کا مسودہ (ڈرافٹ ڈیکلیریشن) مایوس کن تھا۔ اس میں ہمارے لیے یہاں اور اس وقت کے لیے کچھ نہیں تھا، اور صرف ایک غیر یقینی مستقبل کی طرف اشارہ تھا ——— حال سے تعلق رکھنے والی تجاویز نہ صرف یہ کہ مبہم تھیں، ان میں عام اختیار کے سپرد کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ دفاع کی تمام تر ذمے داری انگلستان میں ہز میجسٹی کی حکومت کو سونپ دی گئی تھی۔ اس تحفظ نے انگریزوں سے ہندستانی ہاتھوں میں اقتدار کی مفروضہ منتقلی کو بے حقیقت بنا دیا تھا۔ جنگ کے زمانے میں سول انتظامیہ کے ہر شعبے پر دفاع کا تسلط قائم ہو جاتا ہے* اور اگر دفاع کا تحفظ کر لیا جائے تو پھر ہر چیز محفوظ کر لی جاتی ہے۔

میں نے کمیٹی کو بتایا کہ اپنی گزشتہ بات چیت میں سر سٹیفرڈ نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ مسودے (ڈرافٹ) میں جو نیت کی گئی ہے، ایک قومی حکومت کی ہے۔ وائسرائے، گویا کہ حکومت کی پوزیشن وہی رہے گی جو اپنی کابینہ کے تعلق سے ایک آئینی بادشاہ کی ہوتی ہے۔ بہر حال، اس پوزیشن کو برقرار نہیں رکھا گیا ——— کرپس کی پیش کش میں، ایک اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ عنصر، وہ طریقہ تھا جس کے مطابق فرقہ وارانہ اور ہندستانی ریاستوں سے متعلق مسائل کو حل کیا جانا تھا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ یہ مسئلے ہندستانیوں کے لیے چھوڑ دیے جانے چاہئیں تھے تاکہ وہ خود انھیں حل کریں، لیکن بجائے اس کے، کرپس کی پیشکش میں ان مسئلوں کا ایک نہایت قابلِ اعتراض حل تجویز کیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، وہ تصور جس کا جادو سر سٹیفرڈ نے مذاکرات کی ابتدا کے موقع پر جگایا تھا، دھندلی ہوتی گئی، اور پھر جو کچھ باقی رہ گیا، اس لائق نہیں تھا کہ اس پر نظر ڈالی جائے۔

میں نے کمیٹی سے کہا کہ برطانوی رویہ، جنگ چھڑنے کے وقت سے ہی عدم تعاون کا رہا ہے۔ اس کے برعکس، کانگریس اس حد تک گئی جہاں تک جا سکتی تھی تاکہ مسئلہ طے ہو جائے لیکن یہ

حقیقت عیاں تھی کہ برطانوی حکومت کو کانگریس میں کوئی اعتماد نہیں تھا۔ حکومت اس کے لیے تیار نہیں تھی کہ دفاعِ ہندستانیوں کے سپرد کر دیا جائے۔ ورکنگ کمیٹی نے جو موقف اختیار کیا تھا وہ ہندستان کو سرگرمی کے ساتھ جنگ میں شرکت کے راستے پر لگا دیتا۔ یہ بات خوب پھیل چکی تھی کہ ورکنگ کمیٹی کے کچھ ارالین جی جان سے عدم تشدد کی حمایت میں مہاتما گاندھی کے ساتھ تھے ——— مجھے، بہرحال، یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی تھی کہ دہلی مذاکرات کے پورے دو ہفتوں کے دوران ان ارالین نے خود اپنے نقطۂ نظر پر اصرار نہیں کیا اور ہر تجویز کا محاکمہ ملک کے دفاع کے زاویے سے کیا۔ انھوں نے یہ بات واضح کر دی کہ عدم تشدد میں اپنے راسخ یقین کے ساتھ ہم آہنگ رہتے ہوئے، وہ حتی الامکان اس قومی حکومت کی مدد کرتے رہیں گے جو مذاکرات کے نتیجے میں تشکیل دی گئی ہے **

میں نے پبلک میں اپنے ساتھیوں کی حب الوطنی اور وفاداری کو خراج تحسین پیش کیا اور کمیٹی کو یہ اطلاع دی کہ ہمارے تمام فیصلے متفقہ تھے۔ میں نے یہ نشاندہی بھی کی کہ ہمیں ان خطوط کا صاف اندازہ ہے جن پر فرقہ وارانہ اور دوسرے مسئلے حل کیے جاتے تھے، لیکن ہم نے کرپس کی پیش کش کے تئیں اپنے رویے کو اس سے متاثر نہیں ہونے دیا۔ ہم نے اس پیشکش کو صرف ایک زاویے سے پرکھا: یہ پیشکش انگریزوں سے ہندستانی ہاتھوں میں اقتدار منتقل کرے گی یا نہیں کرے گی ——— مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی تشفی بخش حل ہم نے پیدا کر لیا ہوتا اگر سیاسی اقتدار کی منتقلی کا سوال تشفی بخش طریقے سے پہلے طے کر لیا جاتا۔

اس کے بعد میں نے اس خیال سے بحث کی جو کچھ لوگوں نے ظاہر کیا تھا کہ گرچہ کرپس مشن ہند برطانوی مسئلے کا کوئی حل فراہم نہیں کر سکا، لیکن اس نے جنگ کی طرف لوگوں کے رویے کو تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ میرے نزدیک یہ خیال مطلق طور پر غلط اور گمراہ کن تھا۔ مشن نے اگر کچھ کیا تھا تو یہ کہ ہند برطانوی مفاہمت کو تقریباً ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ اس نے امیدیں صرف اس لیے ابھاری تھیں کہ انھیں مایوسیوں میں بدل دے۔ اس نے اس عقیدے کی تصدیق کی تھی کہ ایک غلام ہندستان کا جنگ سے

کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ صرف ایک آزاد ہندستان اپنی مدافعت کر سکتا ہے۔ اب سر سٹیفر ڈکرپس یہ کہہ رہے تھے کہ ہندستانی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پہلا قدم ہندستانی عوام کے لیڈروں کو اٹھانا چاہیے، نہ کہ برطانوی حکومت کو ——— میں نے اعلان کیا کہ کانگریس اس حد تک چلی گئی تھی جہاں تک وہ جا سکتی تھی اور اب اس معاملے میں وہ کوئی پہل نہیں کرے گی۔

اس کے بعد میں نے سر پر منڈلاتی ہوئی اس بربادی کا ذکر کیا جو جاپان کے حملے کی لائی ہوئی تھی۔ میں نے ان لوگوں کی سخت تنقید کی جو یہ سمجھتے یا کہتے تھے کہ جاپان ہندستان کو آزادی دلا دے گا۔ قومی عزت نفس کا تقاضہ یہ تھا کہ ہم اپنے مالکوں میں تبدیلی کی اصطلاحوں میں نہ سوچیں ——— انگریزوں سے اپنے اختلاف کے باوجود، ہم جاپانی جارحیت کا مقابلہ کریں گے۔ جاپان کا کوئی خیر مقدم نہیں ہو سکتا تھا، نہ تو سرگرم نہ ساکت و صامت۔ ہم آزاد ہوتے اور اگر کوئی ملک ہم پر حملہ آور ہوتا تو مسلح ہو کر اپنا دفاع کرتے۔ مسلح مدافعت کا حق ہمیں نہیں دیا گیا، لیکن ہمارے پاس عدم تشدد کا اسلحہ ہے۔ یہ وہ اسلحہ ہے جس کا استعمال ہم پچھلے بائیس برسوں سے کرتے آئے ہیں اور کوئی شخص اسے ہم سے چھین نہیں سکتا آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کے موقف کی تصدیق کی کرپس مشن سے متعلق اس کی منظور کردہ قرارداد کی ایک بار پھر توثیق کی۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ورکنگ کمیٹی کو یہ اختیار دیا جائے کہ ہندستانی آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے جو اقدامات بھی وہ ضروری سمجھتی ہو، وہ کرے ——— الٰہ آباد سے میں کلکتے آگیا اور چاروں طرف حالات میں جو ابتری پیدا ہوتی جا رہی تھی، اسے دیکھ کر پریشان تھا۔ عوام کی اکثریت کو یقین تھا کہ برطانیہ جنگ ہار جائے گا اور کچھ لوگ جاپان کی جیت کا خیر مقدم کرتے نظر آتے تھے۔ انگریزوں کے خلاف تلخی بہت شدید تھی، جو بعض اوقات اس درجہ بڑھ جاتی تھی کہ وہ ہندستان پر جاپان کی فتح کے نتائج کے بارے میں کچھ سوچتے ہی نہیں تھے۔

کرپس کے رخصت ہونے کے بعد میں نے گاندھی جی کے رویے میں ایک نمایاں تبدیلی بھی دیکھی ——— یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ شروع میں جنگ کے دوران کسی بھی تحریک

کے وہ کتنے خلاف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ہندستان کو عدم تشدد کا موید ہونا چاہیے اور کسی بھی وجہ سے، اُس سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔ اسی لیے، میری کوششوں کے باوجود وہ عوام کی کسی تحریک کے حق میں اپنی رضامندی کے اظہار پر آمادہ نہیں ہوئے، کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ اس نوع کی تحریک تشدد کی طرف لے جا سکتی ہے۔ دراصل انتہائی مشکلوں سے یہ ہوا کہ میں انھیں انفرادی ستیہ گرہ یا سول نافرمانی کی تحریک کو تسلیم کرنے پر تیار کر سکا۔ اس پر بھی انھوں نے بہت سی ایسی شرطیں رکھ دیں کہ تحریک کچھ رہ ہی نہیں جاتی تھی، سوائے ایک اخلاقی موقف کی طرف اشارے کے۔

گاندھی جی کا ذہن اب مکمل بے عملی کی ایک انتہا سے منظم عوامی کوششوں کی دوسری انتہا کی سمت بڑھ رہا تھا۔ یہ سلسلہ شاید پہلے ہی شروع ہو چکا تھا، لیکن اس نے کرپس کے جانے کے بعد ہی واضح شکل اختیار کی ——— جون ۱۹۴۲ء میں، مَیں ان سے ملنے کے لیے واردھا گیا اور ان کے ساتھ تقریباً پانچ روز قیام کیا۔ ان سے اپنی بات چیت کے دوران، مَیں نے دیکھا کہ انھوں نے جنگ چھڑنے کے وقت جو پوزیشن اختیار کی تھی، اب اس سے بہت اوپر چلے گئے ہیں۔

مَیں اب یہ محسوس کرنے لگا کہ حکومت کو ہندستان پر ایک جاپانی حملے کا اندیشہ لاحق ہے۔ حکومت اس خیال کی حامل نظر آتی تھی کہ اگر پورے ملک پر حملہ نہیں ہو سکا، جب بھی جاپانی کم سے کم بنگال پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ حکومت نے پہلے ہی سے کچھ ضروری حفاظتی اقدامات کر لیے تھے۔ انھوں نے مختلف مقامات پر مقابلہ آرائی کا ایک منصوبہ بنا لیا تھا اور اس صورت میں کہ پیچھے ہٹنے کی ضرورت پیش آئے، اپنی پسپائی کے راستے کی بابت ہنگامی احکامات تک تیار کر لیے تھے۔ حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ ایک جاپانی حملے کی صورت میں سب کچھ جلا کر پھونک ڈالنے کی پالیسی جیسا کوئی طریقہ اپنانا ہوگا۔ انھوں نے اہم پلوں کو اڑا دینے اور صنعتی تنصیبات اور کارخانوں کو برباد کر دینے کی تیاریاں بھی کر رکھی تھیں تاکہ وہ جاپانیوں کے ہاتھ نہ لگ سکیں۔ جمشید پور کے مشہور فولاد اور اسٹیل کے کارخانے کی تباہی کے منصوبے کا کسی طرح لوگوں کو پتہ چل گیا اور

پورے علاقے میں زبردست تشویش اور بے چینی پھیل گئی۔

میں نے گاندھی جی کو ان تمام حالات کی خبر دی۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ یہ میرا ایقان تھا کہ اگر جاپانی ہندستانی سرزمین پر قدم رکھیں تو یہ ہم سب کا مقدس فریضہ ہوگا کہ اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کا مقابلہ کریں ——— میں سمجھتا تھا کہ یہ بات ناقابل برداشت ہوگی کہ پرانے مالکوں کو نئے مالکوں سے بدل لیا جائے۔ دراصل یہ ہمارے مفادات کے لیے کہیں زیادہ نقصان دہ ہوگا اگر ایک نئے اور تازہ دم فاتح نے اس پرانی حکومت کی جگہ لے لی، جو وقت کے ساتھ ساتھ اب مضمحل ہو چکی تھی اور جس کی گرفت بتدریج کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جاپانیوں کی جیسی ایک نئی شہنشاہیت (امپیریلزم) کو نکال باہر کرنا کہیں زیادہ دشوار ہوگا۔

ہندستان پر جاپان کے امکانی حملے کی پیش بندی کے طور پر، میں نے پہلے ہی کچھ اقدامات کر لیے تھے۔ کانگریس کی تنظیم سے میں نے کہا تھا کہ جاپانیوں کے خلاف عوامی مزاحمت کی تعمیر کے لیے اسے پروپیگنڈے کی ایک مہم چلانی چاہیے۔ میں نے کلکتہ کو مختلف وارڈوں میں تقسیم کرایا تھا اور رضاکاروں کے جتھے، جنھوں نے جاپان کی مخالفت کا عہد کر رکھا تھا، ان کی تربیت اور تنظیم شروع کر دی تھی۔ ان رضاکاروں کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ اگر جاپانی فوج پیش قدمی کرے تو اس کے راستے میں ہر ممکن رکاوٹ کھڑی کرنی ہوگی ——— میرے ذہن میں یہ اسکیم تھی کہ جیسے ہی جاپانی فوج بنگال پہنچے اور برطانوی فوج بہار کی طرف پیچھے ہٹے، کانگریس کو آگے بڑھ کر ملک کے کنٹرول پر قبضہ جما لینا چاہیے۔ اپنے رضاکاروں کی مدد سے، اس سے پہلے کہ جاپانی اپنے قدم جما سکیں، بیچ کے وقفے میں ہمیں اقتدار پر قابض ہو جانا چاہیے۔ صرف اسی طرح ہم اپنے نئے دشمن کا مقابلہ کر سکتے تھے اور اپنی آزادی حاصل کر سکتے تھے۔ دراصل مئی اور جون ۱۹۴۲ء میں میرے وقت کا بیشتر حصہ اس نئی تدبیر کو آگے بڑھانے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں صرف ہوا۔

میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ گاندھی جی مجھ سے متفق نہیں تھے۔ انھوں نے دو ٹوک

لفظوں میں، مجھ سے کہا کہ اگر جاپانی فوج کبھی ہندستان آہی گئی، تو وہ ہمارے دشمن کے طور پر نہیں بلکہ انگریزوں کے دشمن کے طور پر آئے گی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انگریز چلے گئے تو جاپانی ہندستان پر حملہ نہیں کریں گے۔ میں اس تجزیے کو تسلیم نہیں کر سکا اور طویل بحثوں کے باوجود ہم کسی مفاہمت تک نہیں پہنچ سکے ——— چنانچہ ہم اختلاف کے ایک نوٹ کے ساتھ، ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں واردھا میں ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ ہوئی ——— میں ۵ر جولائی کو واردھا پہنچا اور گاندھی جی نے "ہندستان چھوڑو" تحریک کے بارے میں پہلی بار مجھ سے بات کی۔ میں اپنے ذہن کو آسانی کے ساتھ ان کے اس نئے خیال سے ہم آہنگ نہیں کر سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم گومگو کی ایک غیر معمولی الجھن سے دوچار ہیں۔ ہماری ہمدردیاں اتحادی طاقتوں کے ساتھ تھیں، لیکن برطانوی حکومت نے ایک ایسا رویہ اختیار کر لیا تھا کہ ہمارے لیے، اُن سے تعاون کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ہم صرف ایک آزاد ملک کی حیثیت سے انگریزوں کا ساتھ دے سکتے تھے، مگر انگریز یہ چاہتے تھے کہ ہم محض ان کے بہیری CAMP FOLLOWER بنے رہیں۔ دوسری طرف جاپانیوں نے برما پر قبضہ کر لیا تھا اور آسام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمیں ایسا کچھ کہنے یا کرنے سے باز رہنا چاہیے، جس سے جاپانیوں کی کوئی حوصلہ افزائی ہوتی ہو ——— مجھے ایسا لگا کہ واحد کام جو ہم کر سکتے تھے، یہ تھا کہ واقعات کے تسلسل پر نظریں جمائے رہیں اور یہ دیکھیں کہ جنگ کیا صورت حال اختیار کرتی ہے۔ گاندھی جی اس سے متفق نہیں تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ وقت آگیا ہے جب کانگریس کو یہ آواز بلند کرنی چاہیے کہ انگریز ہندستان چھوڑ کر جائیں۔ انگریز اگر یہ (مطالبہ) مان لیتے تو پھر ہم جاپانیوں سے کہہ سکتے تھے کہ انہیں اب اور آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اگر اس کے باوجود وہ آگے بڑھتے تو یہ ہندستان پر ایک حملہ ہو گا، انگریزوں پر نہیں۔ اس قسم کی صورت اگر پیدا ہوئی تو ہمیں اپنی پوری طاقت سے جاپانیوں کا مقابلہ کرنا ہو گا۔

میں یہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جنگ چھڑنے کے موقع پر، میں انگریزوں کے خلاف ایک

منظم مقابلہ آرائی کا حامی تھا۔ اس وقت گاندھی جی نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ اب جبکہ ان میں تبدیلی آگئی تھی، میں نے اپنے آپ کو ایک انوکھی پوزیشن میں پایا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ہندستانی سرحد پر دشمن کو دیکھتے ہوئے، انگریز مزاحمت کی کسی منظم تحریک کو برداشت کر لیں گے ——— ایسا لگتا ہے کہ گاندھی جی کو عجیب و غریب یقین تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریز انھیں اس کی اجازت دے دیں گے کہ اپنی تحریک کو وہ اپنے مخصوص طریقے سے چلائیں۔ جب میں نے ان پر یہ بتانے کے لیے دباؤ ڈالا کہ مزاحمتی پروگرام کی صحیح شکل کیا ہوگی۔ تو ان کے پاس کوئی واضح خیال نہیں تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران واحد نتیجہ جس کا انھوں نے ذکر کیا۔ یہ تھی کہ گزشتہ مواقع کے برعکس۔ اس بار لوگ رضا کارانہ طور پر گرفتاری کی پیش کش نہیں کریں گے انھیں گرفتاری کی مزاحمت کرنی چاہیے اور صرف اسی صورت میں خود کو حکومت کے حوالے کرنا چاہیے، جب ایسا کرنے کے لیے انھیں جسمانی طور پر مجبور کر دیا جائے۔

مجھے جاپانیوں کے وعدوں پر شک تھا اور میرا خیال تھا کہ ہم جاپانیوں کے قول قرار پر کوئی اعتبار نہیں کر سکتے۔ یہ بات مجھے بہت بعید از قیاس دکھائی دیتی تھی کہ جاپانی اپنا فتح مندانہ مارچ، انگریزوں کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر، روک دیں گے۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ انھیں روکنے کے بجائے، اس قسم کا اقدام انھیں یہ ہمت دلا سکتا ہے کہ وہ داخل ہو جائیں انگریزوں کے پیچھے ہٹنے کو، کیا وہ ہندستان پر قابض ہونے کا سب سے اچھا موقع تصور نہیں کریں گے؟ میں ان سوالوں کا قطعی جواب نہیں دے سکتا تھا، اور اسی لیے مجھے گاندھی جی کا طریق اختیار کرنے میں تامل تھا۔

ورکنگ کمیٹی نے جب اپنی بحثیں شروع کیں تو میں نے ان نکات کو مفصل طور پر واضح کیا۔ ورکنگ کمیٹی کے اراکین میں صرف جواہر لال نے ایک نقطے تک میری حمایت کی۔ دوسرے اراکین، خواہ پوری طرح قائل نہ رہے ہوں، لیکن گاندھی جی کے خلاف نہیں جائیں گے۔ میرے لیے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ ——— جواہر لال سے قطع نظر، جو اکثر مجھ سے اتفاق کرتے تھے، دوسرے اراکین گاندھی جی کی تقلید کرتے رہنے پر بالعموم قانع تھے۔ سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرساد اور آچاریہ کرپلانی، جنگ کے بارے میں کوئی واضح خیال نہیں رکھتے تھے۔

شاذونادر ہی انھوں نے چیزوں کو اپنے طور پر پرکھنے کی کوشش کی، اور ہر معاملے میں انھیں اس کی عادت پڑ چکی تھی کہ اپنے فیصلوں کو گاندھی جی کے تابع کر دیں۔ چنانچہ، ان سے بحث کرنا کم و بیش فضول تھا۔ ہماری تمام بحثوں کے بعد وہ بس اتنا کہہ سکے تھے کہ گاندھی جی میں ہمارا اعتماد قائم رہنا چاہیے۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر ہم نے ان پر (گاندھی جی پر) بھروسہ کیا تو وہ کوئی راستہ نکال لیں گے ـــــــ انھوں نے ۱۹۳۰ء کی نمک ستیہ گرہ تحریک کی مثال دی۔ جب یہ شروع ہوئی تھی تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا تھا۔ خود حکومت بھی اسے حقارت بھری نظروں سے دیکھتی تھی اور کھلے عام اس کی ہنسی اڑاتی تھی۔ بہرحال، اخیر میں نمک ستیہ گرہ تحریک زبردست طور پر کامیاب ثابت ہوئی تھی اور انگریزوں کو مصالحت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سردار پٹیل اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ اب کے بار بھی گاندھی جی کو ویسی ہی کامیابی ملے گی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس نوع کی دلیل مجھے مطمئن نہیں کر پاتی تھی۔

گاندھی جی کا خیال کچھ اس طرح کا تھا کہ چونکہ جنگ ہندستانی سرحد پر ہو رہی ہے۔ انگریز جیسے ہی اس تحریک کا آغاز ہوگا، کانگریس سے سمجھوتہ کر لیں گے۔ تاہم، اگر ایسا نہیں ہو سکا تب بھی، انھیں یقین تھا کہ ایسے وقت میں جب جاپانی ہندستان کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے، انگریز کوئی سخت قدم اٹھانے سے گریز کریں گے، ان کا خیال تھا کہ اس سے کانگریس کو یہ موقع اور وقت مل جائے گا کہ ایک مؤثر تحریک کو منظم کر سکے۔ میرا اپنا اندازہ بالکل مختلف تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جنگ کے اس نازک مرحلے میں حکومت کوئی بھی عوامی تحریک برداشت نہیں کرے گی۔ انگریزوں کے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اسی لیے وہ لوگ تیزی کے ساتھ اور سخت قدم اٹھائیں گے۔ مجھے یہ صاف دکھائی دیتا تھا کہ جیسے ہی ہم تحریک (کی شروعات) کا فیصلہ کریں گے، حکومت تمام کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کر لے گی اور پھر کوئی یہ نہیں کہہ پائے گا کہ آگے کیا ہوگا۔

مجھے اس امر میں بہت مستحکم یقین تھا کہ عدم تشدد پر مبنی تحریک، موجودہ حالات میں نہ تو شروع کی جا سکتی ہے نہ چلائی جا سکتی ہے۔ کوئی بھی تحریک اسی صورت میں تشدد سے

...جاری رہ سکتی تھی جب اس کے لیڈر موجود ہوں اور ہر قدم پر اس کی قیادت کے لیے سرگرم ...ہوں اور مجھے یقین تھا کہ کسی تحریک کی پہلی ہی آہٹ کے ساتھ لیڈروں کو گرفتار کرلیا جائے گا۔ ...تاہم، اگر کانگریس عدم تشدد سے دست برداری کا فیصلہ کرلیتی تو کسی تحریک کے لیے گنجائش ...موجود تھی ——— قیادت سے محروم لوگ بھی مواصلات کا انتظام درہم برہم کرسکتے ہیں۔ ذخیروں ...اور گوداموں میں آگ لگا سکتے ہیں اور صدہا طریقوں سے جنگی تیاری میں گڑبڑ پیدا کرسکتے ہیں۔ ...میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اس نوع کی عام شورش ایک تعطل کی طرف لے جاسکتی تھی اور انگریزوں ...کو مصالحت پر مجبور کرسکتی تھی ——— بہرحال اس میں خطرے بہت تھے۔ لیکن میرا خیال ...تھا کہ اگر خطرہ مول لینا ہی پڑے تو ہمیں دونوں آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔ دوسری طرف میں ...ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ گاندھی جی کے ذہن میں جس قسم کی لاتشدد سے عاری ...تحریک (کا منصوبہ) ہے، اسے جنگی حالات میں بھلا کیوں کر شروع کیا جاسکتا ہے اور ...جاری رکھا جاسکتا ہے۔

ہماری بحثیں ۵ جولائی کو شروع ہوئیں اور کئی روز تک جاری رہیں۔ میں نے پہلے بھی ...بعض مواقع پر کسی نقطے کو لے کر گاندھی جی سے اختلاف کیا تھا لیکن اس سے پہلے ہمارے اختلافات ...کبھی بھی اتنے مکمل نہیں تھے۔ اس وقت معاملات اپنے منتہا کو پہنچ گئے، جب انھوں نے اس ...بارے میں ایک خط لکھا کہ میرا موقف ان سے اس قدر مختلف ہے کہ ہم ساتھ کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ...اگر کانگریس چاہتی تھی کہ گاندھی جی تحریک کی قیادت کریں تو مجھے صدارت سے مستعفی ہونا ...پڑے گا اور ورکنگ کمیٹی سے بھی اپنا نام واپس لینا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ جواہرلال کو بھی یہی ...کرنا چاہیے۔ میں نے فوراً جواہرلال کو بلوایا اور انھیں گاندھی جی کا خط دکھایا۔ سردار پٹیل ...بھی اس وقت آنکلے تھے اور انھیں بھی یہ خط پڑھ کر صدمہ ہوا تھا۔ فوراً ہی وہ گاندھی جی ...کے پاس گئے اور ان کے اس فعل کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ سردار پٹیل نے کہا کہ اگر میں نے ...صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور جواہرلال اور میں، دونوں ورکنگ کمیٹی سے الگ ہوگئے تو ...ملک پر اس کے اثرات تباہ کن ہوں گے۔ نہ صرف یہ کہ عوام میں ابتری پیدا ہوگی، کانگریس ...کی بنیادیں تک کانپ اٹھیں گی۔

گاندھی جی نے مجھے یہ خط ۷ر جولائی کو صبح سویرے بھیجا تھا۔ دوپہر کے قریب انھوں نے مجھے بلوایا ——— انھوں نے ایک لمبی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انھوں نے صبح بہت جلدی میں لکھا تھا۔ اب وہ اس مسئلے پر مزید غور کر چکے تھے اور اپنا خط واپس لینا چاہتے تھے۔ میں سوائے اس کے اور کیا کرتا کہ ان کی بات مان لوں۔ اسی سہ پہر کو تین بجے جب ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو پہلی بات جو گاندھی جی نے کہی یہ تھی کہ "گناہ گار نادم ہو کر مولانا کے پاس آیا ہے"۔

مجوزہ تحریک کے مختلف عناصر پر ہم نے زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث شروع کی۔ گاندھی جی نے یہ بات صاف کر دی کہ کانگریس کی دوسری تحریکوں کی طرح، یہ (تحریک) بھی عدم تشدد کی بنیاد پر ہوگی۔ ایسے تمام طریقے جو تشدد سے عاری ہوں جائز سمجھے جائیں گے۔ ان مباحث کے دوران جواہر لال نے کہا کہ گاندھی جی کے ذہن میں جو کچھ ہے، دراصل ایک کھلی ہوئی بغاوت (کا تصور) ہے، ہر چند کہ یہ بغاوت عدم تشدد پر مبنی ہوگی۔ گاندھی کو یہ فقرہ پسند آیا اور انھوں نے کئی بار ایک کھلے ہوئے، عدم تشدد پر مبنی انقلاب کا تذکرہ کیا ——— * ۱۴ر جولائی ۱۹۴۲ء کو ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس کا مفہوم، اگرچہ گاندھی جی اس وقت اسے سمجھ نہیں سکے، یہ تھا کہ انگریزوں سے مذاکرات کا امکان عملاً ختم ہو چکا ہے۔ مجھے اس کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ "ہندوستان چھوڑو" قرارداد کے پہلے مسودے (ڈرافٹ) کی حیثیت سے وہ ہندوستانی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ *

۷

ہندوستان چھوڑدو

ورکنگ کمیٹی کی قرارداد شائع کی گئی، اس نے ملک میں ایک برقی رَو دوڑادی۔ لوگوں نے یہ سوچنے کے لیے بھی دم نہیں لیا کہ اس کے مضمرات کیا تھے، لیکن اتنا محسوس کر لیا کہ بالآخر انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کرنے کے لیے کانگریس ایک عوامی تحریک شروع کررہی تھی۔ دراصل، بہت جلد عوام اور حکومت دونوں میں اس قرارداد کا ذکر ہندوستان چھوڑ دو، قرارداد کے طور پر کیا جانے لگا ——— ورکنگ کمیٹی کے بعض اراکین کی طرح، عوام بھی گاندھی جی کی قیادت میں کامل یقین رکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اُن کے ذہن میں کوئی ایسی تدبیر موجود ہے جو حکومت کو مفلوج کر کے رکھ دے گی اور اُسے مصالحت پر مجبور کردے گی۔ میں یہ اعتراف بھی کرتا چلوں کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی کسی جادو یا فوق الانسانی طریقے کی مدد سے ہندوستان کو آزادی دلادیں گے، اور اسی لیے وہ لوگ اس کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی خاص انفرادی کوشش بھی کی جائے۔

قرارداد کو منظور کرنے کے بعد، ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ وہ حکومت کے ردِّعمل کا انتظار کرے گی۔ اگر حکومت نے مطالبہ منظور کر لیا یا کم سے کم مصالحت کے رویّے کا اظہار کیا تو آئندہ کی گفتگوؤں کے لیے بھی گنجائش نکل آئے گی۔ اس کے برعکس، اگر حکومت نے مطالبہ مسترد کردیا

تو گاندھی جی کی قیادت میں ایک جدوجہد شروع کر دی جائے گی۔ میرے ذہن میں اس بات کا اندیشہ بہت کم تھا کہ حکومت دباؤ میں آ کر بات چیت کرنے سے انکار کر دے گی۔ واقعات کے سلسلے نے ثابت کر دیا کہ میرا قیاس صحیح تھا۔

بیرونی صحافیوں کا ایک بہت بڑا جتھا واردھا آن پہنچا تھا کیونکہ وہ لوگ یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ ورکنگ کمیٹی کیا فیصلہ کرتی ہے۔ ۱۵ر جولائی کو، گاندھی جی نے ایک پریس کانفرنس طلب کی۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اگر تحریک شروع کی گئی تو برطانوی اقتدار کے خلاف یہ تشدد سے عاری ایک بغاوت ہوگی۔ مجھے یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں اس تمام صورتِ حال کے تئیں بہت ناخوش تھا۔ میں نے اس قرارداد کی مخالفت نہیں کی جس میں براہِ راست اقدام کی ترغیب تھی لیکن میں اس کے نتیجے کے سلسلے میں بہت پُرامید نہیں تھا۔

قرارداد کی منظوری کے بعد مہادیو ڈیسائی نے مس سلیڈ (جو ہندستان میں میرا بین کے نام سے مشہور ہیں) سے کہا کہ انھیں جا کر وائسرائے سے ملاقات کرنی چاہیے اور ان کے سامنے قرارداد کے منشا کی وضاحت کرنی چاہیے ——— یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ انھیں مجوزہ تحریک کی نوعیت اور تحریک کے طریق کار کی بابت ایک تفصیلی خاکہ پیش کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ مس سلیڈ وائسرائے سے ملاقات کے لیے واردھا سے روانہ ہوئیں اور اُن سے گفتگو کی ایک درخواست بھی کی ——— وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری نے جواب دیا کہ چونکہ گاندھی جی نے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ وہ بغاوت کی اصطلاحوں میں سوچ رہے ہیں، اس لیے وائسرائے اس پر آمادہ نہیں تھے کہ انھیں انٹرویو کی منظوری عطا فرمائیں۔ انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ حکومت جنگ کے دوران کسی بغاوت کو برداشت نہیں کرے گی، خواہ وہ تشدد پر مبنی ہو یا تشدد سے عاری۔ نہ ہی حکومت ایک ایسی تنظیم کے کسی نمائندے سے ملاقات یا گفتگو کے لیے آمادہ تھی جو اس قسم کی اصطلاحوں میں بات کرتا ہو۔

بعد ازاں میرا بین وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری سے ملیں اور ان سے طویل گفتگو کی۔ اُس وقت میں دہلی میں تھا، اور انھوں نے اپنی بات چیت کا پورا احوال مجھے سُنایا۔ اس کے بعد وہ واردھا گئیں اور گفتگو کی ساری تفصیل گاندھی جی کو بتائی۔ اس کے جلد ہی بعد مہادیو

ڈیسائی نے ایک بیان جاری کیا کہ گاندھی جی کے ارادوں کی بابت ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کو کچھ غلط فہمی ہے۔ انھوں نے کہا، یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ گاندھی جی نے مجوزہ تحریک کو ایک کھلی ہوئی تشدد سے عاری بغاوت کا نام دیا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ مہادیو ڈیسائی کے بیان پر مجھے تعجب ہوا —— واقعہ یہ ہے کہ یہ فقرہ جو اس نے ایجاد کیا تھا اور اس کے بعد گاندھی جی نے کئی مواقع پر اس کا استعمال کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے ذہن میں انھوں نے اس فقرے کو کچھ خاص معنی دیے ہوں، مگر عام پبلک کے نزدیک اس بیان کا مفہوم یہی تھا کہ کانگریس نے اب طے کرلیا ہے کہ وہ بجز اس کے کہ تشدد آمیز بغاوت کا طریقہ اختیار کرے، باقی ہر طریقے سے برطانوی حکومت کو اقتدار سے دست بردار ہوجانے پر مجبور کرے گی —— میں یہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے انگریزوں کے امکانی ردعمل کا اندازہ تھا۔ اور اسی لیے مجھے اس بات پر تعجب نہیں ہوا کہ والسرائے نے گاندھی جی یا اُن کے نمائندے سے ملاقات کی منظوری نہیں دی۔

ان حالات سے دوچار رہتے ہوئے، میں نے فیصلہ کیا کہ اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی ایک میٹنگ بلائی جانی چاہیے تاکہ صورت حال پر مزید غور کیا جاسکے اور اگر ضروری ہو تو ورکنگ کمیٹی کی تجویز کی تصدیق کردی جائے۔ مجھے یہ خیال بھی ہوتا کہ اس طرح حکومت کو ساری صورت حال پر غور کرنے کے لیے مزید وقت مل جائے گا۔ چنانچہ ۷ر اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی ایک میٹنگ طلب کردی گئی۔

۱۴ر جولائی سے ۵ر اگست تک میرا تمام وقت، ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے کانگریسی لیڈروں سے مسلسل ملاقاتوں کی نذر ہوگیا۔ میں انھیں جتا دینا چاہتا تھا کہ اگر حکومت نے ہمارا مطالبہ تسلیم کرلیا، یا کم سے کم ہمیں اپنا کام کرنے کی اجازت دے دی تو اس تحریک کو سختی کے ساتھ گاندھی جی کی پالیسی کا پابند رہنا پڑے گا، لیکن اگر حکومت نے کوئی سخت رویّہ اختیار کیا، تو ملک کو ہر ممکن طریقے سے حکومت کے تشدد کا جواب دینا ہوگا۔ یہ تصویر جس طور پر میرے سامنے آئی تھی، یوں تھی کہ بنگال، بہار، یوپی، سی۔ پی، بمبئی اور دہلی پوری طرح تیار تھے، اور ان صوبوں میں تحریک بہت مستحکم رہے گی، دوسرے صوبوں کی بابت

میں نے مناسب ماحول پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی، لیکن مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میری نظر میں تصویر صاف نہیں ہو سکی۔

میرا بین سے وائسرائے کے ملاقات تک کے لیے انکار نے، گاندھی جی پر یہ حقیقت روشن کر دی کہ حکومت آسانی سے ہار ماننے والی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ جو اعتماد رکھتے تھے، متزلزل ہو گیا لیکن ابھی تک وہ اس یقین سے چمٹے ہوئے تھے کہ حکومت کوئی سخت قدم نہیں اٹھائے گی ——— ان کا خیال تھا کہ اے۔آئی۔سی۔سی کے بعد انھیں کافی وقت مل جائے گا کہ ایک لائحہ عمل تیار کر لیں اور بتدریج اس تحریک میں زور پیدا کر سکیں۔ میں ان کی اس امید پرستی میں شریک نہیں ہو سکا۔ ۸ر جولائی کو ان کے نام میں نے ایک تفصیلی خط لکھا جس میں یہ کہا کہ حکومت پوری طرح تیار تھی اور بمبئی میں اے۔آئی۔سی۔سی کی میٹنگ کے بعد فوری اقدام کرے گی ——— گاندھی جی نے جواب دیا کہ مجھے جلد بازی میں کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے۔ صورت حال کا مطالعہ وہ خود بھی کر رہے ہیں اور انھیں اب بھی یقین ہے کہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔

۳ر اگست کو میں کلکتے سے بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ مجھے کامل یقین تو نہیں تھا لیکن دل یہ کہتا تھا کہ میں کلکتے سے ایک لمبی مدت کے لیے رخصت ہو رہا ہوں۔ مجھے کچھ اطلاعات بھی موصول ہوئی تھیں کہ حکومت نے اپنے منصوبے مکمل کر لیے تھے اور قرارداد کی منظوری کے فوراً بعد تمام لیڈروں کو گرفتار کر لینے کا ارادہ رکھتی تھی۔

ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ۵ر اگست کو ہوئی اور اس نے ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا جو ۷ر تاریخ کو اے۔آئی۔سی۔سی کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اپنے ابتدائی کلمات میں، میں نے کمیٹی کی پچھلی میٹنگ کے بعد سے اب تک کے واقعات کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا۔ میں نے قدرے تفصیل کے ساتھ ان اسباب کی وضاحت بھی کی جنھوں نے ورکنگ کمیٹی کو اپنا رویہ بدلنے اور قوم کو ہندستان کی آزادی کے لیے ایک نئی جدوجہد کے آغاز کی دعوت دینے پر قائل کیا تھا۔ میں نے اس امر کی نشاندہی کی کہ ایک ایسے وقت میں جب اس کی تقدیر (کی ترازو) بیچوں بیچ لٹک رہی ہے، قوم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی نہیں رہ سکتی۔ ہندستان نے جمہوریتوں کو اپنا

تعاون دینے کی جستجو کی تھی لیکن برطانوی حکومت نے باعزت تعاون کو ناممکن بنادیا۔ سر پر منڈلاتے ہوئے جاپانی حملے کی موجودگی میں، قوم اپنی توانائیوں کے حصول کی فکر میں تھی تاکہ جارحیت کا مقابلہ کیا جاسکے ——— انگریز اگر چاہتے تو یہ کر سکتے تھے کہ ہندستان سے اپنے آپ کو نکال لیتے جیسا کہ انھوں نے سنگاپور، ملایا اور برما میں کیا تھا۔ ہندستانی خود تو نکل نہیں سکتے تھے کیونکہ یہ ان کا وطن تھا، اور اسی لیے ان پر لازم آتا تھا کہ برطانوی زنجیروں کو توڑنے کے لیے اور کسی نئے حملہ آور کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی طاقت کو بڑھائیں۔

مٹھی بھر کمیونسٹوں کو چھوڑ کر جو اس اقدام کے مخالف تھے، اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے تمام اراکین نے ورکنگ کمیٹی کی ڈرافٹ کی ہوئی قرارداد کا خیر مقدم کیا۔ گاندھی جی نے بھی میٹنگ سے خطاب کیا اور دو روز کی بحث کے بعد، ۸ راگست کی شام کو دیر گئے یہ تاریخی "ہندستان چھوڑ دو" قرارداد، منظور کر لی گئی۔

بمبئی کے اپنے سفروں میں، بالعموم میں آں جہانی بھولا بھائی ڈیسائی کے ساتھ ٹھہرتا تھا۔ اس مرتبہ بھی میں نے یہی کیا ——— اُن دنوں وہ بیمار تھے اور پچھلے کچھ عرصے سے اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے، مجھے قدرے تعجب ہوا جب اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی میٹنگ کے بعد، میں نے یہ دیکھا کہ وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ اس وقت کافی رات ہو چکی تھی اور میں تھکا ہوا تھا اور یہ سوچا تھا کہ اب تک وہ لیٹ چکے ہوں گے ——— میں نے ان کو اتنی دیر تک جاگتے رہنے پر ہلکی سی فہمائش بھی کی، لیکن انھوں نے مجھے بتایا کہ میرے ایک عزیز محمد طاہر، جو بمبئی میں تجارت کرتے تھے، مجھ سے ملنے آئے تھے اور دیر تک انتظار کیا تھا۔ میں جب واپس نہیں آیا تو وہ بھولا بھائی ڈیسائی کے پاس ایک سندیسہ چھوڑ کر چلے گئے۔ بمبئی پولیس میں محمد طاہر کا ایک دوست تھا اور انھیں پتہ چلا تھا کہ اگلے روز صبح سویرے تمام کانگریسی لیڈر گرفتار کر لیے جائیں گے۔ طاہر کے دوست نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، لیکن اسے یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ ہم سب ہندستان سے باہر، شاید جنوبی افریقہ بھجوا دیے جائیں گے۔

روانگی سے پہلے کلکتے میں، اسی قسم کی افواہیں میں سن چکا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ

افواہ بے بنیاد نہیں تھی۔ جب حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ ہم سب کو گرفتار کیا جانا چاہیے تو انھوں نے یہ بھی سوچا کہ ہمیں ملک میں ہی رکھنا خلاف مصلحت ہوگا۔ دراصل جنوبی افریقہ کی حکومت سے اس سلسلے میں بات کی جا چکی تھی۔ آخری لمحے میں غالباً کوئی اڑچن پیدا ہو گئی، کیونکہ بعد میں فیصلہ بدل دیا گیا۔ جلدی ہی ہم نے معلوم کر لیا کہ حکومت نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ گاندھی جی تو پونے میں روک لیے جائیں، جبکہ باقی ہم سب کو قلعۂ احمد نگر جیل میں قید کر دیا جائے۔

بھولا بھائی اس خبر سے بہت پریشان ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ انہیں میرا انتظار تھا۔ مَیں بہت تھکا ہوا تھا اور اس طرح کی افواہیں سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ مَیں نے بھولا بھائی سے کہا کہ اگر یہ خبر صحیح تھی تو پھر میرے پاس آزادی کے بس چند گھنٹے تھے۔ بہتر یہ ہوگا کہ مَیں جلدی کھانا کھا لوں اور سو جاؤں تاکہ صبح کا سامنا اچھی طرح کر سکوں۔ مَیں سو جانا پسند کروں گا بہ نسبت اس کے اپنی آزادی کے یہ چند گھنٹے افواہوں پر قیاس آرائی میں صرف کر دوں۔ بھولا بھائی نے اس سے اتفاق کیا اور جلدی ہی مَیں سونے کے لیے لیٹ گیا۔

مجھے ہمیشہ سے بہت سویرے جاگ اٹھنے کی عادت رہی ہے۔ اگلے روز بھی مَیں صبح کے چار بجے اُٹھ بیٹھا۔ لیکن ابھی تک بہت تھکا ہوا تھا اور سر بھاری بھاری سا محسوس ہوتا تھا۔ مَیں نے اسپرین کی دو گولیاں کھائیں اور چائے کی ایک پیالی پی اور کام کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ قرارداد جسے ہم نے منظور کیا تھا، اس کی ایک نقل خط کے ساتھ صدر روزویلٹ کو بھیجی جائے گی۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہندستانی آزادی کے سوال میں جو دلچسپی وہ لے رہے تھے، اس کے پیش نظر ہمیں کم سے کم اتنا تو کرنا ہی تھا۔ مَیں نے صدر روزویلٹ کے نام خط ڈرافٹ کرنا شروع کیا، لیکن اسے ختم نہیں کر سکا۔ شاید اس وجہ سے کہ میں تھکا ہوا تھا، یا شاید اسپرین کی وجہ سے، مجھے دوبارہ نیند آنے لگی اور مَیں بستر پر لیٹ گیا۔

مَیں نہیں سمجھتا کہ مجھے سوئے ہوئے پندرہ منٹ سے زیادہ گزرے ہوں گے، ایسا لگا کسی نے میرے پاؤں چھوئے ہیں۔ مَیں نے آنکھیں کھولیں اور بھولا بھائی کے بیٹے، دھیرو بھائی ڈیسائی کو دیکھا، جو کاغذ کا ایک ورق ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ دھیرو بھائی کے یہ بتانے

سے پہلے ہی، کہ بمبئی پولیس کا ڈپٹی کمشنر میرے لیے گرفتاری کا وارنٹ لایا تھا۔ مَیں سمجھ گیا کہ یہ کیا ہے۔ انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ڈپٹی کمشنر برآمدے میں میرا منتظر ہے۔ مَیں نے دھیرو بھائی سے کہا ـــــــ ڈپٹی کمشنر کو مطلع کر دیں کہ مجھے تیار ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔

مَیں نے غسل کیا، اس کے بعد کپڑے بدلے۔ مَیں نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خاں کو ضروری ہدایات بھی دیں جو اس وقت تک میرے پاس آ گئے تھے۔ پھر مَیں برآمدے میں باہر آیا ـــــــ بھولا بھائی اور ان کی بہو، ڈپٹی کمشنر سے باتیں کر رہے تھے۔ مَیں بھولا بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہا، آپ کے دوست پچھلی شام جو اطلاع لے کر آئے تھے، درست ثابت ہوئی۔ پھر مَیں ڈپٹی کمشنر کی طرف مڑا اور کہا ـــــــ 'مَیں تیار ہوں'۔ اس وقت صبح کے پانچ بجے تھے۔

مَیں ڈپٹی کمشنر کی کار میں بیٹھ گیا۔ ایک دوسری کار میں میرا سامان رکھا گیا اور وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ ہم سیدھے وکٹوریہ ٹرمنس پہنچے۔ یہ لوکل گاڑیوں (کے چلنے) کا وقت تھا لیکن اسٹیشن بالکل خالی تھا۔ شاید تمام ٹرینیں اور مسافر عارضی طور پر روک دیے گئے تھے۔ جیسے ہی میں کار سے نیچے اترا، مَیں نے اشوک مہتہ کو دیکھا۔ وہ بھی گرفتار کر لیے گئے تھے اور وکٹوریہ ٹرمنس لائے گئے تھے۔ مَیں سمجھ گیا کہ حکومت نے ورکنگ کمیٹی کے اراکین کو ہی نہیں، بمبئی میں کانگریس کے مقامی لیڈروں کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ مجھے گمان گزرا کہ ہندستان بھر میں یہی کیا جا رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر ایک ٹرین لگی ہوئی تھی جس کے پاس مجھے لایا گیا۔ اس وقت ایک انجن ٹرین سے ڈائننگ کار کو جوڑ رہا تھا۔ یہ ایک کوری ڈار (CORRIDOR) ٹرین تھی جو عام طور پر بمبئی پونا لائن پر چلتی تھی ـــــــ مجھے ایک کمپارٹمنٹ میں لے جایا گیا اور مَیں کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا۔

تقریباً اسی وقت جواہر لال، آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود بھی وہاں آن پہنچے۔ جواہر لال نے مجھے بتایا کہ گاندھی جی بھی اسٹیشن لائے گئے تھے اور انھیں دوسرے ڈبے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ ایک یورپی فوجی افسر ہمارے پاس آیا اور پوچھا کہ ہمیں چائے کی خواہش تو نہیں ہے ـــــــ مَیں اپنی پیالی پی چکا تھا مگر دوبارہ چائے منگوالی۔

اب ایک دوسرا فوجی افسر نمودار ہوا اور ہماری گنتی کرنے لگا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ کوئی

بات اسے چکر میں ڈالے ہوئے ہے کیونکہ اس نے کئی بار ہمیں گنا۔ جیسے ہی وہ ہمارے ڈبے میں آیا، اس نے زور سے کہا: "تیس"۔ جب یہ دو یا تین بار ہو چکا، تو میں نے بھی اتنی ہی اونچی آواز میں جواب دیا: "بتیس"۔ اس نے اسے اور زیادہ الجھا دیا اور وہ ایک بار پھر سے گنتی کرنے لگا ——— بہر حال، جلدی ہی گارڈ نے اپنی سیٹی بجائی اور ٹرین حرکت میں آ گئی۔ میں نے مسز آصف علی کو پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کرنے آئی تھیں۔ جیسے ہی ٹرین چلی انھوں نے میری طرف دیکھا اور بولیں: "میری فکر مت کیجیے گا۔ میں کوئی کام ڈھونڈ نکالوں گی اور بے کار نہ بیٹھوں گی"۔ بعد کے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا، وہی کیا۔

میں یہ پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہ ایک کوری ڈور ٹرین تھی (جس میں ایک ڈبے سے دوسرے میں جانے کا راستہ ہوتا ہے)۔ اب مسز نائیڈو ہمارے ڈبے میں آئیں اور کہا کہ گاندھی جی ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم کوری ڈور سے ہوتے ہوئے اُن کے ڈبے میں گئے، جو کچھ فاصلے پر تھا ——— گاندھی جی بہت مضمحل دکھائی دیتے تھے۔ میں نے انھیں اتنا ملول کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ انھیں اس اچانک گرفتاری کی توقع نہیں تھی۔ صورت حال کے مطالعے سے وہ اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ حکومت کوئی سخت کارروائی نہیں کرے گی۔ ہر چند کہ میں نے بار بار انھیں خبر دار کیا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی خوش گمانی سے کام لے رہے ہیں، لیکن صاف ظاہر تھا کہ گاندھی جی نے خود اپنے فیصلے پر زیادہ بھروسہ کیا تھا۔ اب جبکہ اُن کے اندازے غلط ثابت ہو چکے تھے، وہ طے نہیں کر پا رہے تھے کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔

ہم نے منٹ دو منٹ بات کی ہوگی کہ گاندھی جی نے کہا: "آپ جیسے ہی اپنی منزل پر پہنچیں، حکومت کو مطلع کر دیجیے کہ آپ صدر کانگریس کی حیثیت سے اپنا کام جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے آپ کو اپنے پرائیویٹ سکریٹری اور دوسری ضروری سہولتوں کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ جب پچھلی بار آپ گرفتار کیے گئے تھے اور نینی جیل میں رکھے گئے تھے، حکومت نے یہ سہولتیں مہیا کی تھیں۔ آپ کو انہی سہولتوں کا مطالبہ پھر سے کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو اس (مطالبے) کو ایک مسئلہ بنا لینا چاہیے۔

میں گاندھی جی سے اتفاق نہیں کر سکا۔ میں نے انھیں بتایا کہ اب صورت حال قطعاً مختلف تھی۔ ہم نے کھلی آنکھوں سے یہ راستہ چنا تھا اور اب ہمیں اس کے نتائج کو بھگتنا پڑے گا۔ میں یہ تو سمجھ سکتا تھا کہ وہ کسی ایسے مسئلے کی بنیاد پر، جسے کانگریس نے اختیار کیا ہو۔ یہ چاہتے ہوں کہ میں لڑائی کر دوں، لیکن اس کا جواز کیا ہو سکتا تھا کہ میں محض چند ذاتی سہولتوں کی فراہمی جیسے چھوٹے سے مسئلے کو لے کر لڑ پڑوں ——— میں نہیں سمجھتا تھا کہ میرا یہ مطالبہ حق بجانب ہو گا کہ میرے پرائیویٹ سکریٹری کو مجھ سے ملنے کی اجازت دی جانی چاہیے تاکہ میں کانگریس کا کام جاری رکھ سکوں۔ یہ معاملہ بمشکل اس قابل تھا کہ اس کی بنیاد پر، موجودہ صورت حال میں، میں ایک جھگڑا کھڑا کروں۔

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ بمبئی پولیس کا ڈپٹی کمشنر، جو اسی ٹرین میں ہمارے ساتھ تھا، اندر آیا۔ اس نے ہم سے اپنے کمپارٹمنٹ میں جانے کو کہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ صرف مسز نائیڈو گاندھی جی کے ساتھ ٹھہر سکتی تھیں۔ چنانچہ، جواہر لال اور میں، اپنے ڈبے میں واپس آ گئے ——— اب گاڑی تیزی سے کلیان کی طرف جا رہی تھی۔ کلیان میں وہ ٹھہری نہیں بلکہ پونا کا راستہ پکڑ لیا۔ میں نے سوچا کہ شاید ہمیں وہیں رکھا جائے گا، اور جب ٹرین وہاں ٹھہری تو میرا یقین اور پختہ ہو گیا۔

ایسا لگتا تھا کہ ہماری گرفتاری کی خبر کسی طرح پونا جا پہنچی تھی۔ پلیٹ فارم پر پولیس کھڑی تھی اور پبلک کے کسی آدمی کو وہاں آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ البتہ پل کے اوپر بہت بڑی بھیڑ جمع تھی۔ جیسے ہی ٹرین (اسٹیشن کے) اندر آئی بھیڑ نے نعرے شروع کر دیے، "مہاتما گاندھی کی جے" اس نعرے کا بلند ہونا تھا کہ پولیس نے لوگوں پر لاٹھی چارج کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا، اسے حکومت سے احکامات ملے ہیں کہ کسی مظاہرے یا نعرے کی اجازت نہیں ہو گی۔

جواہر لال بھی کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی انھوں نے دیکھا کہ پولیس لاٹھی چارج کر رہی ہے، وہ ڈبے سے کود پڑے اور چیختے ہوئے آگے بڑھے، "تمھیں لاٹھی چارج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے،" پولیس کمشنر ان کے پیچھے دوڑا اور جواہر لال کو ان کے ڈبے میں واپس لانے

کی کوشش کی۔ جواہر اس کی بات کب سننے والے تھے، چنانچہ غصّے میں بولنے لگے ــــــ اس وقت تک ورکنگ کمیٹی کے ایک اور رکن، شنکر راؤ دیو بھی پلیٹ فارم پر آ گئے تھے۔ چار پولیس والوں نے انھیں گھیر لیا اور ان سے کہا کہ ٹرین میں واپس جائیں۔ جب انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو پولیس والے انھیں جسمانی طور پر اٹھا کر واپس لے چلے ــــــ میں نے جواہر لال کو آواز دی کہ لوٹ آئیں۔ جواہر لال غصّے میں تھے مگر میری درخواست مان لی۔ پولیس کمشنر میرے پاس آیا اور دو یا تین بار کہا ــــــ ' جناب! مجھے بہت افسوس ہے، مگر مجھے یہ حکم دیے گئے ہیں اور مجھے ان پر عمل کرنا ہو گا۔'

میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ مسز نائیڈو اور گاندھی جی کو ٹرین سے باہر لے جایا جا رہا ہے ــــــ بمبئی کا ایک اور شخص جو گاڑی سے اترا تھا، پلیٹ فارم سے آگے جانا چاہتا تھا لیکن پولیس نے اسے روک دیا ــــــ وہ اس وقت تک باز نہیں آیا جب تک کہ پولیس نے اسے جسمانی طور پر زبردستی نہیں روکا ــــــ میرا خیال ہے کہ وہ گاندھی جی کی ہدایتوں کے مطابق عمل کر رہا تھا ــــــ یاد رہے، موجودہ تحریک شروع کرتے وقت گاندھی جی نے کہا تھا کہ کسی کو بھی رضاکارانہ طور پر خود کو گرفتار نہیں کروانا چاہیے ــــــ صرف اسی صورت میں لوگ جیل جانے پر تیار ہوں جب جسمانی طاقت کا استعمال کیا جائے۔

گاندھی جی کے (ٹرین سے) اتار لیے جانے کے بعد ٹرین پھر سے روانہ ہوئی ــــــ اب میں نے سمجھ لیا کہ ہمیں احمد نگر لے جایا جا رہا ہے ــــــ دن کے ڈیڑھ بجے کے قریب ہم اسٹیشن پہنچے ــــــ سوائے مٹھی بھر پولیس افسروں اور ایک اکیلے فوجی عہدیدار کے، پورا پلیٹ فارم خالی تھا ــــــ ہم سے اترنے کو کہا گیا اور ہمیں ان کاروں میں بٹھا دیا گیا جو ہماری منتظر تھیں ــــــ وہ فوراً ہی چل پڑیں اور اس وقت تک نہیں رکیں جب تک کہ ہم قلعے کے اندرونی پھاٹک تک نہیں پہنچ گئے ــــــ وہاں ایک فوجی افسر کھڑا ہوا تھا۔ پولیس کمشنر ایک فہرست لایا اور اسے تھما دی ــــــ فوجی افسر نے ایک ایک کرکے

ہمارے نام پکارے ------ پھر ہمیں اندر جانے کے لیے کہا۔ اصل میں پولیس کمشنر ہمیں فوجی عہدیداروں کے حوالے کر رہا تھا   اب اس کے بعد سے ہم فوج کے قبضے میں تھے۔

۸

قلعۂ احمد نگر جیل

ورکنگ کمیٹی کے نو اراکین میرے ساتھ احمد نگر لائے گئے تھے، یعنی کہ جواہر لال، سردار پٹیل، آصف علی، شنکر راؤ دیو، گووند بلبھ پنت، ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیا، ڈاکٹر سید محمود، آچاریہ کرپلانی اور ڈاکٹر پروفلا گھوش — راجن بابو بھی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے، لیکن چونکہ انھوں نے بمبئی والی میٹنگ میں شرکت نہیں کی تھی، اس لیے انھیں پٹنے میں گرفتار کیا گیا اور وہ وہیں نظر بند کر دیے گئے۔

ہم قلعے کے اندر لے جائے گئے، پھر ایک ایسی عمارت میں پہنچا دیے گئے جو دیکھنے میں فوجی بیرک معلوم ہوتی تھی۔ اس میں کوئی دو سو فٹ لمبا ایک صحن تھا جس کے چاروں طرف کمرے تھے۔ ہمیں بعد کو پتہ چلا کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران یہاں اطالوی قیدی رکھے گئے تھے۔ ہمارا سامان اندر لایا گیا تو ایک جیلر نے جس کا تبادلہ پونے سے یہاں کر دیا گیا تھا، اس کی چھان بین کی — میرے پاس ایک چھوٹا سا (PORTABLE) ریڈیو تھا جسے میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ میری دوسری چیزیں تو اندر آگئیں لیکن ریڈیو روک لیا گیا، اور پھر اپنی رہائی تک میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد، لوہے کی پلیٹوں میں ہمیں (رات کا) کھانا دیا گیا۔ ہمیں وہ اچھی

نہیں لگیں اور میں نے جیلر سے کہا کہ ہم چینی مٹی کی پلیٹوں میں کھانے کے عادی ہیں۔ جیلر نے معذرت طلب کی کہ اس وقت ڈنر سیٹ کا اہتمام اس کے لیے ممکن نہیں تھا، البتہ اگلے روز سے یہ کر دیا جائے گا ——— پونے سے ایک قیدی ہمارا کھانا پکانے کے لیے لایا گیا تھا۔ لیکن وہ ہماری پسند کا کھانا پکا نہیں سکتا تھا۔ جلد ہی اسے بدل دیا گیا اور ایک دوسرا باورچی مقرر کر دیا گیا۔

ہماری نظر بندی کی جگہ راز میں رکھی گئی تھی ——— مجھے یہ بات بے وقوفی کی لگتی تھی کیونکہ ظاہر تھا کہ واقعات کو زیادہ دنوں تک چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔ پھر بھی حکومت کی کارروائی پر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ شاید تمام حکومتیں ایسے مواقع پر اسی طرح کی بے وقوفیاں کرتی ہیں۔ دو تین روز بعد بمبئی کی جیلوں کا انسپکٹر جنرل ہم سے ملنے آیا۔ اس نے ہمیں بتایا، حکومت کے احکامات ایسے ہیں کہ ہم اپنے رشتے داروں کو بھی نہ تو خط بھیج سکتے ہیں، نہ ان کے خط وصول کر سکتے ہیں ——— نہ ہی ہمیں کوئی اخبار فراہم کیا جائے گا۔ اس نے بہت معذرت کی اور کہا کہ یہ احکامات سخت ہیں اور اسے (بہرحال) ان کی بجا آوری کرنی ہے۔ پھر بھی اسے ہماری دوسری کوئی بھی ضرورت پوری کرنے میں خوشی ہوگی۔

جب میں ۳ اگست کو کلکتے سے بمبئی کے لیے روانہ ہوا، میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی میٹنگ کے دوران بھی میں انفلوئنزا میں مبتلا تھا اور حکومت کو یہ بات معلوم تھی۔ انسپکٹر جنرل ایک ڈاکٹر تھا اور چاہتا تھا کہ میری (طبی) جانچ کرے۔ مگر میں اس پر راضی نہیں ہوا۔

ہم باہر کی دنیا سے پوری طرح کٹ گئے تھے اور ہمیں کچھ بھی پتہ نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ ہم نے سوچا کہ اپنی صحت اور ہمت کو بحال رکھنے کے لیے ہمیں اپنی سرگرمیوں کا ایک خاکہ بنانا چاہیے ——— جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں صحن کے چوطرفہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں نے ایک طرف کا پہلا کمرہ لے لیا۔ بغل والے کمرے میں جواہر لال تھے، اور تیسرے میں آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود۔ اس قطار کا آخری کمرہ ہمارا ڈائننگ روم تھا۔ ہر صبح ۸ بجے ناشتے کے لیے اور گیارہ بجے کھانے کے لیے ہم یکجا ہوتے تھے۔ اس کے بعد گھنٹے دو گھنٹے کے لیے میرے کمرے میں مختلف موضوعات پر

بات چیت ہوتی تھی۔ پھر ہم تھوڑی دیر آرام کرتے تھے اور چار بجے (سہ پہر کی) چائے کے لیے پھر سے جمع ہوتے تھے۔ چائے کے بعد صحن میں کچھ کسرت کی جاتی تھی۔ رات کا کھانا آٹھ بجے ملتا تھا اور دس بجے تک ہم باتیں کرتے تھے —— پھر ہم اپنے اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔

جس وقت ہم وہاں پہنچے تھے، صحن خاصا ویران تھا۔ جواہر لال نے یہ تجویز رکھی کہ، وہاں پھولوں کا ایک باغ لگایا جائے کیونکہ اس طرح ہم اپنے آپ کو مصروف بھی رکھیں گے اور اس جگہ کو بھی خوبصورت بنا دیں گے —— یہ خیال ہمیں پسند آیا اور ہم نے پونے سے بیج منگوائے۔ اس کے بعد ہم نے کیاریاں بنائیں۔ جواہر لال اس معاملے میں سب سے آگے آگے تھے۔ ہم نے کوئی تیس یا چالیس طرح کے بیج بوئے، ہر روز کیاریوں میں پانی دیتے اور ان کی صفائی کرتے۔ پودوں میں کلیاں پھوٹنے لگیں تو ہم بڑی محویت آمیز دلچسپی کے ساتھ ان کو پنپتے ہوئے دیکھا کرتے —— پھولوں نے کھلنا شروع کیا تو وہ احاطہ حسن اور مسرت کا مقام بن گیا۔

اس جیل میں آئے ہمیں پانچ روز ہوئے تھے کہ ایک افسر نمودار ہوا جس کے بارے میں ہمیں پتہ چلا کہ اُسے ہماری دیکھ بھال کے لیے جیل کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا گیا تھا۔ وہ شہر میں رہتا تھا، ہر صبح آٹھ بجے وہاں آتا تھا، اور شام کو چلا جاتا تھا۔ ہم اس کا نام نہیں جانتے تھے، سو ہم نے سوچا کہ ہمیں اس کے لیے کوئی نام منتخب کرنا چاہیے —— مجھے یاد آیا کہ جب چاند بی بی اسی جیل میں نظر بند کی گئی تھیں تو ایک حبشی ان کا جیلر تھا جس کا نام چیتا خان تھا۔ مَیں نے مشورہ دیا کہ ہمیں سپرنٹنڈنٹ کا یہی نام رکھ دینا چاہیے —— میرے ساتھی خوشی سے رضامند ہو گئے۔ یہ نام ایسا مقبول ہوا کہ بہت جلد ہر شخص اسے چیتا خان کہنے لگا —— مجھے حیرانی ہوئی جب تین یا چار روز بعد جیلر آیا اور ہمیں بتایا کہ اسی روز صبح سویرے چیتا خان چلا گیا تھا۔

چیتا خان، اب مَیں اسی نام سے اس کا ذکر کروں گا، اس وقت پورٹ بلیئر میں تھا، جب جاپانیوں نے حملہ کیا اور جزائر انڈمان پر قابض ہو گئے۔

۲۵ اگست کو، میں نے وائسرائے کے نام ایک خط لکھا۔ میں نے کہا، مجھے اس کی شکایت نہیں تھی کہ حکومت نے مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو گرفتار کرنا ضروری سمجھا تاہم مجھے اس سلوک کی شکایت ضرور ہے جو ہمارے ساتھ برتا جا رہا ہے۔ سزا یافتہ مجرموں تک کو اس کی اجازت ہوتی ہے کہ اپنے قریبی عزیزوں سے خط و کتابت کر سکیں۔ ہمارے معاملے میں، اس حق پر پابندی لگا دی گئی تھی —— میں نے لکھا کہ میں دو ہفتے انتظار کر لوں گا اور اگر ہمیں کوئی تشفی بخش جواب حکومت کی طرف سے نہیں ملا، تو میرے ساتھی اور میں یہ فیصلہ کریں گے کہ ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔

۱۰ ستمبر کو، چیتیا خان آیا اور کہا کہ اسے احکامات موصول ہوئے ہیں کہ ہفتے میں ایک بار ہم اپنے عزیزوں کو خط لکھ سکتے تھے۔ ہمیں ہر روز ایک اخبار بھی دیا جائے گا۔ ٹائمس آف انڈیا کی ایک کاپی میری میز پر رکھ دی گئی اور اب سے آگے، ہمیں اخبار پابندی سے موصول ہوتا رہا۔ اس رات بڑی دیر تک میں اخبار پڑھتا رہا۔ مہینے بھر سے زیادہ ہمیں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ آخر کار، اب ہمیں پتہ تو چل گیا کہ ہماری گرفتاری کے بعد ملک میں کیا واقعات ہوئے تھے اور جنگ نے کیا شکل اختیار کی تھی۔

اگلے روز میں نے چیتیا خان سے کہا کہ مجھے پچھلی تاریخوں کے اخبارات بھجوا دے۔ اب، جبکہ حکومت ہمیں پابندی سے اخبارات فراہم کرنے پر رضامند ہو گئی تھی، میری اس درخواست پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میری اس بات سے چیتیا خان کو اتفاق تھا۔ چنانچہ دو یا تین روز بعد اس نے مجھے 'ٹائمس آف انڈیا' کی مکمل فائل بھجوا دی۔

جیسے ہی میں نے (اخباری) رپورٹیں پڑھیں، مجھے پتہ چلا کہ صورت حال کے پیش نظر میرا یہ قیاس کہ ہماری گرفتاری کے بعد ملک بھر میں تشدد آمیز ہنگامے برپا ہوں گے، صحیح ثابت ہوا تھا —— بنگال، بہار، یو۔پی، اور بمبئی حکومت کے خلاف جد و جہد کے معاملے میں پیش پیش تھے۔ رسل و رسائل کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا اور کارخانے بند کر دیے گئے تھے۔ پولیس چوکیوں پر حملے کیے گئے اور انھیں جلا دیا گیا۔ ریلوے اسٹیشنوں پر لوگ چڑھ دوڑے اور بعض مقامات پر انھیں تباہ کر دیا گیا —— فوجی لاریاں بھی بہت بڑی تعداد میں جلا دی

گئی تھیں۔ کارخانے ٹھپ ہو گئے اور جنگی سامان کی پیداوار ختم ہو گئی یا بہت کم ہو گئی۔ مختصر یہ کہ حکومت کے ظلم و تشدد کا جواب پورے ملک نے تشدد آمیز طریقے سے دیا تھا۔ اب یہ تحریک تشدد سے عاری کی مزاحمت تک محدود نہیں تھی ——— اس سب کا اندازہ مجھے پہلے سے تھا اور اپنے کارکنوں کو اس بارے میں کسی حد تک میں نے مشورہ بھی دیا تھا اور ان سے بات چیت بھی کی تھی۔

۱۹۴۲ء کے بقیہ مہینے بغیر کسی بڑے واقعے کے گزر گئے۔

۱۹۴۳ء کے شروع میں، فضا ایک بار پھر تبدیل ہوئی۔ فروری میں ہم نے اخباروں میں پڑھا کہ گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھا تھا کہ تزکیہ ذات کی غرض سے وہ برت رکھیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ گاندھی جی یہ قدم دو خاص اسباب کی بنا پر اٹھانا چاہتے ہیں، جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، انھیں توقع نہیں تھی کہ حکومت کانگریسی لیڈروں کو اتنی جلدی گرفتار کر لے گی ——— انھیں یہ اُمید بھی تھی کہ اتنا وقت ان کو مل جائے گا کہ اپنے نظریے کے مطابق تحریک کو تشدد سے عاری خطوط پر آگے لے جائیں۔ ان کی یہ دونوں امیدیں ٹوٹ گئیں۔ جو کچھ ہوا تھا، اس کی ذمے داری انھوں نے قبول کر لی، اور جیسا کہ ان کا معمول تھا، اپنی غلطی کے کفارے کے لیے اب وہ برت رکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اور کوئی مفروضہ ایسا نہیں تھا جس کی بنیاد پر میں اس برت کو بامعنی سمجھ سکوں۔

بہرحال، حکومت ان کے اس فعل کو ایک بالکل ہی مختلف نقطۂ نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس عمر میں اور صحت کی موجودہ حالت میں اکیس روزے کے برت کو وہ جھیل نہیں پائیں گے ——— یہ برت رکھنا، اس کے نزدیک، یقینی موت کو دعوت دینا تھا۔ حکومت کے خیال میں، گاندھی جی یہی چاہتے تھے اور اس طرح حکومت کو اپنی موت کا ذمے دار ٹھہرانا چاہتے تھے۔ بعد کو ہمیں معلوم ہوا کہ اس (قیاس) کی بنیاد پر حکومت نے تمام ضروری انتظامات کر لیے تھے۔ اس یقین کے ساتھ کہ گاندھی جی اس برت سے جاں بر نہ ہو سکیں گے، حکومت نے ان کے کریا کرم کے لیے صندل کی لکڑی بھی خرید لی تھی۔ اس کا ردِ عمل یہ تھا کہ اگر گاندھی جی اپنی موت کی ذمے داری حکومت پر ڈالنا ہی چاہتے ہیں تو حکومت اس ذمے داری

کو قبول کرے گی۔ ان کی آخری رسوم آغا خان پیلیس ہی میں ادا کی جائیں گی جہاں وہ نظر بند رکھے گئے تھے، اور ان کی راکھ ان کے بیٹوں کو بھجوا دی جائے گی۔

ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے نے حکومت کو لکھا کہ وہ گاندھی جی کے برت کے دوران ان کے معالج کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے تھے۔ اس پر حکومت نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ برت کے دوران ایک منزل پر ایسا لگا کہ حکومت کے اندازے صحیح ثابت ہونے والے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے معالجوں نے بھی امید چھوڑ دی ——— بہرحال، گاندھی جی نے حکومت کے اور اپنے معالجوں کے تمام قیاسات الٹ پلٹ کر رکھ دیے۔ اذیت جھیلنے کی جس غیر معمولی استعداد کا مظاہرہ انھوں نے دوسرے موقعوں پر کیا تھا، اس بار اس کا اظہار ایک ناقابلِ یقین حد تک ہوا۔ ان کی اندرونی توانائی موت کے چیلنج پر غالب آگئی اور اکیس روز بعد انھوں نے برت توڑ دیا۔

گاندھی جی کے برت سے جو کھلبلی پیدا ہوئی تھی، اس کے بعد ہم پھر سے اپنے روزمرہ معمول پر آگئے ——— ان کے اس برت کے دوران، ہمیں قید میں اپنی تمام تر بے بسی کا شدید احساس ہوا تھا۔ یہی احساس اگلے برس مجھے اور زیادہ شدت کے ساتھ ہوا ——— میری اہلیہ کئی برسوں سے بیمار تھیں۔ ۱۹۴۱ء میں، جب میں مینی جیل میں تھا، ان کی حالت اس درجہ بگڑ گئی تھی کہ انھیں دیکھنے کے لیے مجھے رہا کر دیا گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹروں سے صلاح لی تو انھوں نے تبدیلی (آب و ہوا) کا مشورہ دیا۔ سو وہ رانچی چلی گئیں اور پھر جولائی ۱۹۴۲ء میں واپس لوٹیں۔ اس وقت وہ قدرے بہتر تھیں، لیکن اگست کے پہلے ہفتے میں جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہوا تو ان کی صحت نے ایک بار پھر تشویش ناک صورت اختیار کر لی۔

۹ راگست کو میری اور میرے ساتھیوں کی گرفتاری کی خبر نے انھیں زبردست صدمہ پہنچایا ہوگا، اور ان کی صحت، جو پہلے ہی سے ابتر تھی، اب پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوتی گئی۔ اسیری کے دوران، میری سب سے بڑی پریشانیوں میں ایک پریشانی ان کی گرتی ہوئی صحت سے متعلق اطلاعات تھیں۔ ۱۹۴۳ء کے اوائل میں، گھر سے مجھے خبر ملی کہ وہ پھر بہت بیمار ہیں۔ اس کے بعد اور زیادہ پریشان کن خبریں ملیں۔ ان کے معالج، ان کی طرف سے متفکر تھے، چنانچہ اپنے طور پر انھوں نے حکومت کو لکھا کہ چونکہ ان کے بچنے کی امید کم ہے اس لیے ایک بار مجھے انھیں دیکھنے کا موقعہ

فراہم کیا جائے۔ حکومت نے معالجوں کے اس خط کو نظر انداز کر دیا ـــــــ میں نے بھی وائسرائے کو لکھا لیکن ہماری خط و کتابت ادھوری رہ گئی۔ ایک روز اپریل میں، دوپہر کے وقت چیتا خان آیا۔ یہ بات معمول کے بالکل خلاف تھی۔ اس نے کچھ کہا نہیں اور ایک ٹیلی گرام مجھے تھما دیا۔ یہ خفیہ اشاروں کی زبان میں تھا، لیکن انگریزی میں اس کی عبارت بھی ساتھ دی ہوئی تھی۔ یہ کلکتے سے آیا تھا اور یہ خبر لایا تھا کہ میری اہلیہ کا انتقال ہو چکا ہے ـــــــ میں نے وائسرائے کو لکھا کہ حکومت ہند عارضی طور پر، بآسانی مجھے کلکتہ منتقل کرنے کا انتظام کر سکتی تھی تاکہ موت سے پہلے میں نے اپنی اہلیہ کو دیکھ لیا ہوتا ـــــــ اس خط کا مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔

تین مہینے بعد، قسمت میں میرے لیے ایک اور صدمہ لکھا ہوا تھا۔ میری بہن آبرو بیگم، جو بھوپال میں رہتی تھیں، بیمار پڑیں۔ تقریباً دو ہفتے کے اندر یہ خبر آئی کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔

اسی زمانے میں، ہم نے اچانک اخباروں میں پڑھا کہ گاندھی جی رہا کر دیے گئے تھے۔ میرا دھیان اس خیال کی طرف جاتا ہے کہ خود گاندھی جی بھی اپنی رہائی کے اسباب سمجھ نہیں پائے ہوں گے ـــــــ لگتا ہے، وہ یہ سوچتے تھے کہ ان کی آزادی کا دارومدار برطانوی پالیسی میں تبدیلی پر ہے۔ بعد کے واقعات نے دکھا دیا کہ ایک بار پھر وہ غلطی پر تھے۔ ان کی صحت اس برت کی وجہ سے برباد ہو چکی تھی۔ اس کے بعد سے انھیں کوئی نہ کوئی بیماری لگی رہتی تھی۔ پونے کے سول سرجن نے ان کا معائنہ کیا اور یہ رپورٹ دی کہ زیادہ دنوں تک ان کے بچنے کی امید نہیں ہے۔ یہ برت ان کی قوت (برداشت) سے باہر تھا اور سول سرجن کا خیال تھا کہ ان کی زندگی کے دن اب گنے چنے باقی رہ گئے ہیں ـــــــ وائسرائے تک جب یہ رپورٹ پہنچی، تو اس نے ان کی رہائی کا فیصلہ کر لیا تاکہ ان کی موت کی ذمے داری حکومت پر نہ آنے پائے۔ اس سے قطع نظر، سیاسی صورت حال اب اتنی زیادہ بدل چکی تھی کہ انگریزوں کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہ گیا تھا ـــــــ جنگ کا بحران ختم ہو چکا تھا۔ اتحادیوں کی فتح اب بس کوئی دن کی بات تھی۔ حکومت یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ ایسی صورت میں جب کانگریس کے تمام لیڈر جیل میں ہیں، گاندھی جی اکیلے شاید ہی کچھ کر سکیں۔ اس کے برعکس

ان کی موجودگی، ایسے عناصر کو قابو میں رکھنے کا ذریعہ بن سکتی تھی، جو تشدد آمیز طریقے اختیار کرنے کی کوشش میں تھے۔

رہائی کے بعد کچھ عرصے تک، گاندھی جی اتنے بیمار رہے کہ کوئی مؤثر قدم اٹھانا، ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ چند ماہ تک ان کا علاج ہوتا رہا، پھر جیسے ہی انھوں نے اپنی حالت میں قدرے بہتری محسوس کی، انھوں نے کئی سیاسی اقدامات کا ڈول ڈالا۔ ان میں سے دو اس کے مستحق ہیں کہ ان کا تذکرہ خاص طور پر کیا جائے۔ گاندھی جی نے مسلم لیگ سے مفاہمت کی ایک نئی کوشش کی اور مسٹر جناح سے ملاقات کا اہتمام کیا ——— ان کا دوسرا اقدام حکومت سے از سرِ نو مذاکرات کا دروازہ کھولنے کی ایک کوشش تھا۔ اپنے پچھلے اعلانات کے برعکس، اب انھوں نے یہ بیان جاری کیا کہ اگر ہندستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے، تو وہ رضا کارانہ طور پر انگریزوں کی حمایت کرے گا اور جنگی تیاریوں میں اپنا پورا تعاون دے گا۔ میں حیرت زدہ تھا اور یہ جانتا تھا کہ ان دونوں اقدامات کو ناکام ہونا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس موقعے پر، مسٹر جناح کی طرف گاندھی جی کا بڑھنا، ایک بہت بڑی سیاسی غلطی تھی ——— اس نے مسٹر جناح کو ایک نئی اور مزید اہمیت عطا کی جس کا انھوں نے بعد میں پورا فائدہ اٹھایا۔ گاندھی جی نے جناح کی طرف، دراصل شروع ہی سے ایک عجیب وغریب رویّہ اپنا رکھا تھا۔ دوسری دہائی میں کانگریس سے علاحدگی کے بعد، جناح اپنی سیاسی اہمیت خاصی حد تک کھو بیٹھے تھے۔ اس کی بہت بڑی وجہ گاندھی جی کے بعض اقدامات اور فروگزاشتیں تھیں کہ جناح نے ہندستان کی سیاسی زندگی میں اپنی اہمیت پھر سے حاصل کر لی ——— واقعتاً، اس بات میں شک ہے کہ گاندھی جی کے رویّے کے بغیر، جناح کو کبھی بھی برتری حاصل ہو پاتی۔ ہندستانی مسلمانوں کے وسیع حلقے مسٹر جناح اور ان کی پالیسی کے متعلق شکوک رکھتے تھے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ گاندھی جی ان کے پیچھے مسلسل بھاگ رہے ہیں اور انھیں خوش کرنے میں لگے ہوئے ہیں، تو بہتوں کے دل میں جناح کے لیے ایک نئی عزت پیدا ہو گئی ——— ان کا خیال یہ بھی تھا کہ فرقہ وارانہ مفاہمت میں مفید مطلب شرطوں کی تکمیل کے لیے شاید جناح بہترین

شخص تھے۔

یہاں میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ گاندھی جی ہی تھے جنھوں نے مسٹر جناح کے لیے سب سے پہلے قائدِ اعظم، یعنی بہت بڑے قائد کے خطاب کو رواج دیا ——— گاندھی جی کے کیمپ میں ایک بیوقوف لیکن نیک نفس خاتون تھیں جن کا نام امت السلام تھا۔ انھوں نے بعض اردو اخبارات میں جناح کا ذکر 'قائدِ اعظم' کے طور پر دیکھا تھا۔ جس وقت گاندھی جی ملاقات کے لیے جناح کے نام خط لکھ رہے تھے، خاتون نے گاندھی جی سے کہا کہ اردو اخبارات جناح کو قائدِ اعظم لکھتے ہیں، چنانچہ گاندھی جی کو بھی ان سے اسی طرح خطاب کرنا چاہیے۔ اس اقدام کے مضمرات پر ایک لمحے کے لیے بھی غور کیے بغیر، گاندھی جی نے جناح سے قائدِ اعظم کے طور پر خطاب کیا ——— یہ خط جلدی ہی اخباروں میں چھپ گیا۔ ہندستانی مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ گاندھی جی بھی جناح کو قائدِ اعظم کہتے ہیں، تو انھوں نے سوچا کہ وہ سچ مچ قائدِ اعظم ہیں ——— جولائی ۱۹۴۴ء میں جب میں نے یہ رپورٹ پڑھی کہ گاندھی جی جناح سے خط و کتابت کر رہے تھے اور ان سے ملاقات کے لیے بمبئی جا رہے تھے، تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ گاندھی جی بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ ان کا یہ فعل مسئلوں کو حل نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کے برخلاف ہندستانی سیاسی صورتِ حال کو دشوار تر بنا دے گا ——— جناح نے اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور خود اپنی پوزیشن بنالی، لیکن انھوں نے ایک بھی ایسی بات نہ تو کی نہ کہی جو کسی بھی طرح ہندستانی آزادی کے مقصد میں معاون ہو سکتی۔

گاندھی جی نے حکومت کی طرف دوسرا قدم جو بھی اٹھایا وہ ناوقت تھا ——— یاد ہوگا کہ جس وقت مخاصمتیں شروع ہوئیں، میں نے کانگریس کو یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ جنگ کی طرف ایک مثبت اور حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرے۔ اس وقت گاندھی جی اس بات پر اڑ گئے کہ ہندستان کی سیاسی آزادی بے شک اہم ہے، لیکن عدمِ تشدد کے اصول پر قائم رہنا اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ دراصل کئی موقعوں پر انھوں نے صاف صاف یہ کہا تھا کہ ہندستانی آزادی کے حصول کا واحد راستہ اگر تشدد سے ہو کر نکلتا ہے تو کم سے کم وہ خود اسے نہیں اپنائیں گے۔ اب وہ یہ کہتے تھے کہ اگر ہندستان کی آزادی کا اعلان ہو جائے تو کانگریس

کو انگریزوں سے تعاون کرنا چاہیے۔ یہ ان کے پچھلے خیالات کی یکسر الٹی شکل تھی اور اس سے ہندستان میں اور ہندستان سے باہر غلط فہمیاں پھیلنے لگیں —— ہندستانی اپنے طور پر ذہنی الجھن میں مبتلا تھے۔ دوسری طرف برطانیہ میں جو تاثر پیدا ہوا وہ اور زیادہ ناخوشی کا تھا۔ بہت سے انگریز یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی نے انگریزوں کی مدد سے احتراز کیا تھا جس وقت جنگ کا معاملہ شبہے کی منزل میں تھا۔ تعاون کے لیے ان کی موجودہ پیشکش کی تعبیر وہ ایک ایسی کوشش کے طور پر کر رہے تھے، جس کا مقصد اس وقت جبکہ اتحادیوں کی جیت یقینی تھی، برطانوی ہمدردی حاصل کرنا تھا —— نتیجتاً، انھوں نے اس پیشکش کی طرف وہ توجہ نہیں کی جس کی اُمید گاندھی جی کو تھی۔ مزید برآں، اب انگریز ہندستان حمایت کے اتنے محتاج نہیں رہ گئے تھے جتنے کہ جنگ کے ابتدائی دنوں میں تھے —— اس وجہ سے بھی وہ گاندھی جی کے اقدام کی طرف سے بے نیاز رہے۔

اب، جبکہ، ۱۹۵۰ء میں، مَیں یہ باتیں لکھ رہا ہوں اور پیچھے مڑ کر واقعات کی طرف دیکھ رہا ہوں، تو یہ کہنے سے مَیں باز نہیں رہ سکتا کہ گاندھی جی کے سب سے قریبی مقلدوں کے رویے میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھنے میں آئی —— سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرساد، آچاریہ کرپلانی اور ڈاکٹر پرفلا گھوش نے اس وقت ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ جب کانگریس نے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ اگر انگریزوں نے ہندستان کی آزادی کا اعلان کر دیا تو وہ جنگی تیاری میں مدد دے گی۔ وہ کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ عدم تشدد ان کے لیے ایک مسلک تھا اور ہندستانی آزادی سے بھی زیادہ اہم تھا۔ بہرحال، جب ۱۹۴۷ء میں ہندستان آزاد ہوا تو ان میں سے ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ ہندستانی فوج کو سبکدوش کر دینا چاہیے۔ برخلاف اس کے، انھوں نے اس پر زور دیا کہ ہندستان فوج کی تقسیم ہونی چاہیے اور اسے حکومت ہند کے فوری اختیار کا تابع کر دیا جانا چاہیے۔ یہ اس وقت کے کمانڈر انچیف کی پیش کردہ تجویزوں کے برعکس تھا۔ کمانڈر انچیف کی تجویز یہ تھی کہ تین برس کے لیے ایک مشترکہ فوج اور اس کی مشترک کمان ہونی چاہیے۔ لیکن بزعم خود علمبردارانِ عدم تشدد کے یہ علم بردار اس پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ اگر عدم تشدد واقعی اُن کا مسلک تھا، تو ان کے لیے یہ کیونکر ممکن ہوا کہ ایک

ایسی حکومت کی ذمے داری قبول کریں جو سالانہ ایک کروڑ سے زیادہ کی رقم فوج پر خرچ کرتی تھی؟ سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ مسلح افواج پر اخراجات بڑھانا چاہتے تھے، نہ کہ کم کرنا!

مجھے ہمیشہ سے اس بات کا احساس رہا ہے کہ ہمارے یہ دوست اور ساتھی بیشتر سیاسی معاملات پر اپنی عقل سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ گاندھی جی کے پکے مقلد تھے۔ جب بھی کوئی سوال اٹھتا، وہ اس انتظار میں رہتے کہ دیکھیں گاندھی جی کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ گاندھی جی کے احترام اور عقیدت میں، میں ان میں سے کسی سے بھی پیچھے نہیں ہوں، لیکن ایک پل کے لیے میں یہ نہیں مان سکتا کہ ہمیں گاندھی جی کی اندھی تقلید کرنی چاہیے۔ عجیب بات ہے کہ ان دوستوں نے ۱۹۴۰ء میں ورکنگ کمیٹی سے جس سوال پر استعفیٰ دیا تھا، آج وہ ان کی نگاہ سے یکسر اوجھل ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی، بغیر ایک فوج اور وسیع دفاعی انتظامات کے ہندستان کی حکومت کو چلانے کے بارے میں نہیں سوچ سکتے۔ نہ ہی انھوں نے جنگ کے امکان کو مسترد کر دیا ہے ——— جواہر لال اس ورکنگ کمیٹی کے تنہا ممبر تھے جو میرے خیالات میں پوری طرح شریک تھے۔ میرا یقین ہے کہ واقعات کی منطق نے ان کے اور میرے موقف کی تائید کر دی ہے۔

جون ۱۹۴۴ء میں ہم نے 'ڈی ڈے' کے بارے میں رپورٹیں پڑھیں۔ اسی نقطے سے جنگ نے پلٹا کھایا ——— اتحادیوں کی فتح اب یقینی تھی اور دکھائی دے رہی تھی۔ دنیا بھی اب سمجھنے لگی تھی کہ جنگ کے دوران نمایاں ہونے والی سب سے بڑی شخصیت صدر روزویلٹ کی تھی ایسا لگتا تھا کہ مستقبل کی جو تصویر ان کے ذہن میں تھی مسلسل طور پر صحیح ثابت ہوتی جاتی تھی۔ افریقہ اور ایشیا دونوں میں اتحادی طاقتیں کامیاب ہوئی تھیں اور اب ہٹلر کے یورپی ٹھکانے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ مجھے اس پر ذرا بھی تعجب نہیں تھا۔ عرصے سے میں یہ سوچتا تھا کہ پہلی عالمی جنگ کی طرح، اس مرتبہ جرمنی نے دو محاذوں پر لڑ کر غلطی کی تھی۔ دراصل جس روز ہٹلر نے یو، ایس، ایس، آر پر حملے کا فیصلہ کیا، اس نے اپنے زوال کا بیج بو دیا ——— اس کے، یا اس کی قوم کے

لیے تباہی سے بچنے کا اب کوئی راستہ نہیں تھا۔

قلعۂ احمد نگر میں ہماری زندگی کا معمول اچانک ایک نئے واقعے کی وجہ سے بگڑ گیا۔ ایک روز چیتا خان آیا اور کہا کہ اسے ڈاکٹر سید محمود کی رہائی کے احکامات موصول ہوئے ہیں۔ ہم سب کو حیرانی تھی کیونکہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ صرف انھیں ہی اس برتاؤ کا مستحق کیوں سمجھا گیا ہے۔

کچھ مہینے پہلے، احمد نگر میں ہیضے کی وبا کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ چیتا خان نے ہمیں اس بیماری کے ٹیکے لگوانے کا مشورہ دیا۔ ہم میں سے پانچ ——— جواہر لال، پٹابھی سیتا رمیا، آصف علی، ڈاکٹر سید محمود اور میں نے ——— اس کے مشورے پر عمل کیا۔ آچاریہ کرپلانی، شنکر راؤ دیو اور ڈاکٹر پروفلا گھوش نے ——— ضمیر کی بنیادوں پر انکار کر دیا۔ مجھے (ٹیکہ لگوانے کے) ردِ عمل کے طور پر ہلکا بخار تھا، لیکن ایسا لگتا تھا کہ ڈاکٹر محمود کو ٹیکے سے الرجی ہے۔ انھیں تقریباً پندرہ روز تک مسلسل اور غیر معمولی طور پر شدید بخار رہا۔ ہم سب ان کی طرف سے متفکر تھے، اور جواہر لال اپنی روایتی دوست داری کے ساتھ ان کی دیکھ بھال اور خدمت کرتے رہے ——— بالآخر بخار نے ان کا پیچھا چھوڑا مگر ان کے مسوڑھوں سے خون برابر آتا رہا۔ وہ چیتا خان کے زیرِ علاج تھے اور تقریباً صحت یاب ہو چکے تھے، جب ان کی رہائی کے احکامات جاری ہوئے۔ چنانچہ صرف اُن کی بیماری ان کی رہائی کا معقول سبب نہیں بن سکتی تھی۔ ہم یہ سمجھے کہ شاید اس کا مطلب حکومت کی پالیسی میں کوئی تبدیلی ہو ——— اب وہ زیادہ نرمی سے پیش آنے پر تیار تھی اور صحت کی بنیاد پر ڈاکٹر سید محمود کو رہا کر دیا تھا۔

* ڈاکٹر سید محمود جب پٹنہ پہنچے تو پریس نے ان کا انٹرویو لیا۔ انھوں نے یہ اشارہ کیا کہ اپنی رہائی کے سبب کا انھیں صاف پتہ نہیں ہے۔ اس (بیان) کا نتیجہ انتہائی غیر متوقع ہوا۔ حکومت نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی تردید کیے بغیر نہیں رہے گی۔ چنانچہ اس نے پریس کو ایک خط جاری کر دیا جو سید محمود نے احمد نگر سے وائسرائے کے نام لکھا تھا۔ حکومت کا کہنا تھا کہ سید محمود اسی خط کی بنیاد پر رہا کیے گئے تھے۔

ہم نے احمد نگر جیل میں جب یہ خط پڑھا، تو ہم سب کو غصّہ آیا اور شرم محسوس ہوئی۔ ہم کبھی یہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ ڈاکٹر محمود اس قسم کا خط لکھیں گے اور ہم میں سے کسی کو یہ بھی نہیں بتائیں گے کہ انھوں نے حکومت سے خط و کتابت کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض انگریزی فقروں اور محاوروں کی بابت انھوں نے ہم میں سے کچھ لوگوں سے مشورہ کیا تھا ——— جواہر لال اور میں نے یہ سمجھا کہ وہ کتاب لکھنے میں مصروف ہیں اور چند فقروں کے سلسلے میں اپنا شک دور کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ وہ وائسرائے کے نام ایک معافی نامہ ترتیب دے رہے تھے۔

اپنے خط میں ڈاکٹر سید محمود نے لکھا تھا کہ جس وقت 'ہندستان چھوڑ دو' قرارداد منظور کی گئی، وہ ورکنگ کمیٹی یا اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی میٹنگوں میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اس پر مجھے اور زیادہ تعجب ہوا، کیونکہ وہ (ان میٹنگوں میں) موجود بھی تھے اور قرارداد سے متعلق بحثوں میں انھوں نے حصّہ بھی لیا تھا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس واقعے پر ہم سب شرمندہ تھے ——— عجیب بات تھی کہ انھوں نے اس قسم کا خط لکھا، اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ ٹینے میں پریس کو انٹرویو کے دوران انھوں نے اس خط کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ شاید انھیں یہ خیال تھا کہ وائسرائے کے نام اس خط کی کسی کو خبر نہ ملے گی ——— حکومت نے جب یہ خط جاری کر دیا تو وہ سخت پریشان ہوئے اور گاندھی جی سے ملنے گئے۔ ان سے بات چیت کے بعد ڈاکٹر محمود نے ایک بیان دیا کہ گرچہ یہ خط انھوں نے لکھا تھا، مگر بہت دنوں تک اسے وائسرائے کو نہیں بھیجا ——— دراصل، وہ فیصلہ نہیں کر پارہے تھے کہ انھیں اسے بھیجنا چاہیے یا نہیں۔ اسی کشمکش و پیچ میں انھوں نے تین مرتبہ قرآن سے فال نکالی۔ ہر بار ان کی نگاہ ایک ہی عبارت پر ٹھہری جس میں کہا گیا تھا کہ اپنی خواہش کے مطابق انھیں عمل کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر محمود کا کہنا تھا کہ انھوں نے اسے غیبی اشارہ تصوّر کیا، چنانچہ خط وائسرائے کو بھیج دیا ——— مجھے اعتراف ہے کہ ان کی یہ صفائی مجھے ان کے عمل سے بھی زیادہ عجیب و غریب نظر آتی ہے۔ اپنے عمل کی ذمے داری اللہ پر ڈال دینے سے یہ معاملہ بہتر نہیں ہو گیا!

ایسے تمام معاملات میں گاندھی جی کا رویّہ بہت فیاضانہ ہوتا تھا۔ سید محمود جب ان سے

مل لیے اور اپنی غلطی تسلیم کر لی تو گاندھی جی کو اُن پر ترس آیا۔ انھوں نے ایک بیان جاری کر دیا کہ گرچہ ڈاکٹر محمود کے لیے وائسرائے کے نام اس طرح کا خط لکھنا، جیل میں اپنے دوستوں کو مطلع کیے بغیر، ہرگز مناسب نہیں تھا، مگر ہندستانی عوام کو اُن کے پچھتاوے کا لحاظ رکھنا چاہیے اور ان کا بہت سخت محاسبہ نہیں کرنا چاہیے۔*

گو کہ یقینی طور پر ہمیں اس کا کچھ پتہ نہیں تھا، مگر ایسا لگتا تھا کہ ہماری اسیری کے دن اب ختم ہونے والے ہیں۔ ۱۹۴۴ء کے نصف آخر میں کسی وقت، حکومتِ ہند اس نتیجے تک پہنچی کہ ہمیں احمد نگر میں نظر بند رکھنا اب چنداں ضروری نہیں تھا۔ ہم وہاں کئی وجوہ کی بنا پر لے جائے گئے تھے۔ حکومت نے یہ سمجھا تھا کہ ہماری نظر بندی راز رکھی جا سکے گی۔ وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ اگر ہمیں کسی سول جیل میں رکھا گیا تو اس کا امکان ہے کہ بیرونی دنیا سے ہم رابطہ قائم کر لیں۔ فوجی کنٹرول کے تحت نظر بندی میں یہ امکان ختم ہو جائے گا۔ احمد نگر کیمپ جیل میں صرف یورپین فوجی تعینات تھے اور یقین تھا کہ وہ لوگ بیرونی دنیا سے رابطہ قائم نہ ہونے دیں گے۔ حتیٰ کہ جسمانی طور پر بھی باہر کی دنیا سے رابطے پر پابندی تھی۔ جن بیرکوں میں ہمیں رکھا گیا تھا ان میں روشن دان بنے ہوئے تھے جن سے گرد و پیش کا ماحول دکھائی دیتا تھا۔ ہمیں وہاں لانے سے پہلے ہی انھیں بند کر دیا گیا۔ پلاسٹر اتنا نیا تھا کہ ہم جب وہاں پہنچے تو اس میں نمی ابھی باقی تھی۔ احمد نگر میں اپنی ساڑھے تین برس کی نظر بندی کے دوران ہم نے مشکل سے باہر کا کوئی ہندستانی دیکھا۔ ایک یا دو بار عمارتوں میں معمولی مرمت کا کچھ کام ہوا۔ لیکن اس کے لیے بھی کسی ہندستانی مزدور سے کام نہیں لیا گیا۔ اس طرح ہم دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گئے تھے۔

حکومت باہر کی دُنیا سے ہمارے رابطے کو روکنے میں تو کامیاب ہو گئی، لیکن اس کا پہلا مقصد ناکام ثابت ہوا تھا۔ پبلک کو ہفتے بھر کے اندر ہی معلوم ہو گیا کہ ہم سب احمد نگر جیل میں نظر بند تھے۔ اب اسے صیغۂ راز میں رکھنے کی ضرورت بھی ختم ہو چکی تھی۔ انگریزوں کی فتح اب سامنے تھی۔ حکومتِ ہند نے اسی لیے یہ سوچا کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے کہ ہمیں فوجی قید میں رکھا جائے ——— اور اب ہمیں اپنے صوبوں کی سول جیلوں میں اطمینان کے ساتھ منتقل کیا جا سکتا ہے۔

سردار پٹیل اور شنکر راؤ دیو سب سے پہلے نکلے اور پونا جیل میں چلے گئے۔ آصف علی کو بٹالہ بھیج دیا گیا جہاں دہلی کے قیدی بالعموم رکھے جاتے تھے۔ جواہر لال کو پہلے الہ آباد کے قریب نینی اس کے بعد الموڑہ لے جایا گیا ــــــــ رخصت ہوتے وقت جواہر لال نے کہا کہ شاید ہماری رہائی کا وقت قریب آپہنچا ہے۔ انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ رہائی کے فوراً بعد ہی ورکنگ کمیٹی یا اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی کوئی میٹنگ مجھے نہیں رکھنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ آرام اور تفریح کے لیے اور اسی کے ساتھ ہندستان کے بارے میں ایک کتاب جو وہ لکھ رہے تھے، اسے مکمل کرنے کے لیے انھیں تھوڑا وقت درکار تھا۔

میں نے جواہر لال سے کہا کہ خود میں بھی یہی چاہتا تھا کہ مجھے بھی آرام کے لیے اور اپنی صحت کی بحالی کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ اس وقت مجھے پتہ نہیں تھا کہ ہم ایسے حالات میں آزاد کیے جائیں گے جب (جیل سے نکلتے ہی) فوری اور سرگرم سیاسی مصروفیتیں درکار ہوں گی۔ اور پھر شاید ہماری باقی ماندہ زندگی کے لیے آرام کا سوال ہی نہیں اٹھے گا۔

میری منتقلی کا وقت آیا تو چھتاری خان نے کہا کہ چونکہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے میرے حق میں اچھا نہیں ہوگا کہ کلکتے جاؤں جہاں کی آب وہوا مرطوب ہے۔ اس نے اشارہ کیا کہ مجھے بنگال کے اندر ہی کسی خشک تر مقام پر بھیجا جائے گا ــــــــ ایک روز سہ پہر کو اس نے مجھ سے تیار ہونے کو کہا۔ میرا سامان اس کی کار میں رکھ دیے جانے کے بعد، وہ مجھے لے کر چل پڑا، احمد نگر اسٹیشن کی طرف نہیں بلکہ کئی میل دور ایک دیہاتی اسٹیشن کی طرف ــــــــ وجہ یہ تھی کہ اگر میں احمد نگر سے سفر کرتا تو فوراً ہی لوگوں کو خبر ہو جاتی۔ حکومت میری حرکات و سکنات کے بارے میں کسی قسم کی تشہیر نہیں چاہتی تھی۔

احمد نگر جیل میں، اپنا بیشتر وقت میں نے شدید ذہنی دباؤ کے عالم میں گزارا۔ میری صحت پر اس کا بہت خراب اثر پڑا۔ جس وقت میں گرفتار کیا گیا تھا، میرا وزن ۱۷۰ پاؤنڈ تھا ــــــــ احمد نگر سے منتقلی کے وقت میرا وزن گھٹ کر ۱۳۰ پاؤنڈ رہ گیا تھا میری بھوک مٹ چکی تھی اور میں بمشکل کچھ کھا سکتا تھا۔

میرے ساتھ جانے کے لیے بنگال کا ایک سی۔ آئی۔ ڈی، انسپکٹر چار کانسٹبلوں کے

ساتھ آیا تھا۔ چھیتا خان نے مجھے ان کے حوالے کر دیا ——— ہم احمد نگر سے کلیان ہوتے ہوئے آسنسول کی طرف بڑھے۔ آسنسول میں مجھے ریٹائرنگ روم میں پہنچا دیا گیا جہاں میرے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے۔ سارے معاملے کو صیغہ راز میں رکھنے کی حکومت کی کوشش کے باوجود، پولیس کو کسی طرح یہ خبر مل گئی تھی۔ آسنسول میں، میں نے کلکتے کے کچھ صحافیوں اور ساتھ ہی ساتھ الہ آباد کے میاں محمد فاروق کو دیکھا ——— مقامی لوگوں کی ایک بھیڑ بھی جمع ہو گئی تھی۔

آسنسول کے پولیس سپرنٹنڈنٹ نے اسٹیشن پر مجھے اتارا اور ایک ذاتی گزارش کی۔ اس نے کہا کہ اگر میں پبلک سے ملنا چاہتا ہوں، تو وہ مجھے روک تو نہیں سکتا، لیکن اگر میں نے یہ کیا تو حکومت اس کے ساتھ بہت سختی سے پیش آئے گی۔ چنانچہ وہ بہت ممنون ہوگا اگر میں اوپری منزل پر ایک کمرے میں چلا جاؤں اور پبلک کو ٹال دوں ——— میں نے اسے یقین دلایا کہ میں اسے نقصان پہنچانا یا حکومت کی ناراضگی کا شکار بنانا نہیں چاہتا، سو میں اس کے ساتھ اوپری منزل کے ایک کمرے میں چلا گیا۔

پولیس سپرنٹنڈنٹ ڈھاکا کے نواب کا رشتے دار تھا۔ وہ اور اس کی بیوی دونوں میری دیکھ بھال کر رہے تھے اور اس کی بیوی کا اصرار تھا کہ میں ایک آٹوگراف بک پر دستخط کر دوں۔ انھوں نے مجھے آرام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

اب مجھے پتہ چلا کہ مجھے بنکورا لے جایا جا رہا ہے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر چار بجے کے قریب آئی اور اس کے تھوڑی دیر بعد مجھے اپنے ڈبے میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت تک پلیٹ فارم پر خاصا بڑا مجمع اکٹھا ہو چکا تھا۔ مقامی لوگوں سے قطع نظر کلکتے، الہ آباد اور لکھنؤ سے بھی بہت لوگ آئے تھے ——— پولیس سپرنٹنڈنٹ اور اس کا انسپکٹر، دونوں اس تشویش میں بری طرح مبتلا تھے کہ میں کسی سے ملنے نہ پاؤں۔ دھوپ تیز تھی اور وہ میرے لیے ایک چھتری لائے تھے۔ اسے انسپکٹر نے سنبھال رکھا تھا، لیکن اس فکر میں کہ مجمع سے میں چھپا رہوں وہ چھتری کو جھکاتا گیا، یہاں تک کہ وہ میرے سر پر ٹک گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ میرا چہرہ نہ دیکھ پائیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس طریقے سے، لوگوں کو متوجہ کیے بغیر،

وہ مجھے کمپارٹمنٹ تک پہنچادیں گے۔

مجھے کسی سے ملنے کی کوئی خاص خواہش نہیں تھی لیکن جب مَیں نے دیکھا کہ لوگ کلکتے الٰہ آباد اور لکھنؤ سے صرف میرے دیدار کے لیے آئے ہیں، تو مجھے یہ بات بہت نامناسب لگی کہ انھیں ایک جھلک تک نہ دکھائی جائے ——— چنانچہ میں نے انسپکٹر کے ہاتھ سے چھتری لے لی اور اسے بند کر دیا۔ اب لوگ میری طرف دوڑ پڑے، لیکن مَیں نے انھیں رُک جانے کو کہا۔ ظاہر ہے کہ میرے لیے فرداً فرداً سب سے ملنا ناممکن تھا، پھر بھی میں نے عمومی طور پر ان سے باتیں کیں اور ہنستے ہوئے کہا، "پولیس سپرنٹنڈنٹ اور انسپکٹر ہر لمحے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پریشان ہوتے جارہے ہیں اور مَیں نہیں چاہتا اس سخت گرمی میں، سر درد میں مبتلا ہو جاؤں۔"

لوگوں کی طرف (خدا حافظ کہنے کے انداز میں) ہاتھ ہلا کر مَیں اپنے ڈبے میں چلا گیا۔ لیکن بھیڑ چاروں سمت سے اُمڈ پڑی۔ پلیٹ فارم پر موجود لوگوں سے قطع نظر، پلیٹ فارم کے اطراف بھی کافی لوگ جمع ہو گئے اور دوسری جانب سے میرے ڈبے تک آگئے۔ جلدی ہی ٹرین چل پڑی اور سات بجے ہم بنکورا پہنچ گئے۔ بنکورا کے پولیس سپرنٹنڈنٹ اور دو دیگر عہدیداروں نے مجھے اتارا اور شہر کے باہر ایک دو منزلہ بنگلے تک میرے ساتھ آئے۔

یہ اپریل کی شروعات تھی اور دن گرم ہوتے جارہے تھے۔ بہر حال، مَیں جب پہلی منزل کے برآمدے میں بیٹھا تو محسوس ہوا کہ شام کی خوشگوار ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے کھیل رہے ہیں۔ صبحیں اور شامیں (یہاں) بُری نہیں ہوتی تھیں، لیکن دن کو گرمی بہت بڑھ جاتی تھی۔ میرے پاس بجلی کا ایک پنکھا تھا اور برف بھی میسّر تھی، مگر دوپہر کے وقت اس قدر گرمی ہوتی تھی کہ ان سے کچھ کام نہیں چلتا تھا۔ کلکٹر ہفتے میں ایک بار ملنے آتا تھا، ایک روز اس نے کہا کہ وہ حکومت کو پہلے ہی لکھ چکا ہے کہ مَیں اب بنکورا میں مزید قیام نہیں کر سکتا۔ اسے جواب کا انتظار تھا اور جیسے ہی یہ (جواب) موصول ہوا وہ مجھے کسی ٹھنڈے مقام پر بھجوا دے گا۔

اچھا باورچی ملنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ بنکورا میں شروع میں کچھ مشکل پیش آئی، مگر جلدی ہی ایک بہت اچھا باورچی رکھ لیا گیا۔ مجھے اس کا کام اتنا پسند آیا کہ رہائی کے بعد میں اسے اپنے ساتھ کلکتے لے آیا۔

بنکورا میں حکومت مجھے (روزنامہ) اسٹیٹسمین کی ایک کاپی فراہم کرتی تھی۔ میں نے حکومت سے کہا کہ میرے لیے امرت بازار پتریکا بھی منگوائے۔ ڈپٹی کمشنر کے چیف سکریٹری سے مشورہ کر لینے کے بعد یہ انتظام ہو گیا۔

میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں کہ قلعۂ احمد نگر میں داخلے کے وقت، میرا ریڈیو سیٹ مجھ سے لے لیا گیا تھا۔ چند روز بعد چھتیاری خان نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا وہ اسے استعمال کر سکتا ہے۔ میں نے خوشی سے اجازت دے دی لیکن احمد نگر سے رخصت ہونے تک مجھے ریڈیو نظر نہیں آیا —— جب میری منتقلی بنگال ہونے لگی تو ریڈیو بھی میرے سامان کے ساتھ رکھ دیا گیا۔ اب جو میں نے اُسے استعمال کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ وہ خراب ہو چکا ہے۔ بنکورا کے ڈپٹی کمشنر نے ایک اور سیٹ میرے لیے منگوا دیا اور کافی عرصے بعد میں دوسرے ملکوں سے براہ راست خبریں سُن سکا۔

اپریل کے اواخر میں، پریس کی خبروں سے مجھے معلوم ہوا کہ آصف علی اپنی بٹالا جیل میں بہت سخت بیمار تھے۔ ایک لمبی مدت تک اُن پر بے ہوشی طاری رہی اور ان کے بچنے کی امید نہیں رہی —— حکومت نے فیصلہ کیا کہ انھیں آزاد کر دیا جائے اور انھیں واپس دہلی بھجوا دیا۔

اپریل یا مئی میں، ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر مزید گفت و شنید کے لیے لارڈ ویول لندن گئے۔ مئی کے اواخر میں وہ ہندوستان واپس آ گئے —— ایک شام دہلی سے نشریہ سنتے وقت، میرے کان میں یہ بات پڑی کہ پچھلی برطانوی یقین دہانیوں کے مطابق، ہندوستانی سیاسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے نئے قدم اٹھائے جائیں گے۔ شملہ میں ایک کانفرنس ہوگی جس میں کانگریس، مسلم لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کے لیڈر مدعو کیے جائیں گے۔ ورکنگ کمیٹی کے صدر اور اراکین کو رہا کر دیا جائے گا تاکہ کانگریس

کانفرنس میں شریک ہو سکے۔

اگلے روز میں نے سُنا کہ میری اور میرے ساتھیوں کی رہائی کے احکامات جاری کر دیے گئے ہیں ——— یہ خبر مَیں نے نو بجے کے قریب سُنی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی یہ نشریہ سُنا اور دس بجے میرے پاس یہ پیغام بھی بھیجا کہ گرچہ اس نے نشریہ تو سن لیا تھا لیکن کوئی سرکاری احکام ابھی اسے موصول نہیں ہوا تھا۔ جیسے ہی یہ احکام اسے موصول ہوں گے وہ مجھے مطلع کرے گا ——— چنانچہ آدھی رات کو جیلر آیا اور مجھے خبر دی کہ رہائی کے احکامات آ گئے ہیں۔ اتنی دیر گئے کوئی کارروائی کی نہیں جا سکتی تھی، اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اگلے روز صبح سویرے مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ اس نے رہائی کا آرڈر پڑھ کر سنایا اور مجھے بتایا کہ کلکتہ ایکسپریس بنکورا سے صبح کے پانچ بجے روانہ ہو چکی ہے۔ میرے لیے اسی ٹرین میں ایک فرسٹ کلاس کوپے مخصوص کیا جا رہا تھا۔

کچھ گھنٹوں کے اندر کلکتے سے اخباری نامہ نگار مجھ سے ملاقات کے لیے آ پہنچے۔ مقامی لوگ بھی ہزاروں کی تعداد میں آئے۔ ساڑھے تین بجے سہ پہر کو، مقامی کانگریس کمیٹی نے ایک میٹنگ کا اہتمام کیا جس میں مَیں نے شرکت کی اور مختصراً خطاب کیا۔ پھر ایکسپریس کے ذریعے میں کلکتے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اور اگلی صبح ہوڑہ پہنچا۔

ہوڑہ اسٹیشن اور پلیٹ فارم پر انسانوں کا ایک سمندر امڈ پڑا تھا۔ سخت ترین مشکل کے ساتھ مَیں اپنے ڈبے سے اتر کر اپنی کار میں داخل ہو سکا۔ بنگال کانگریس کے صدر مسٹر لابانیہ پربھا دت اور کئی دیگر مقامی لیڈر کار میں میرے ساتھ تھے۔ ہم چلنے والے ہی تھے کہ میں نے دیکھا، میری کار کے ٹھیک سامنے ایک بینڈ بج رہا تھا۔ مسٹر دت سے مَیں نے پوچھا کہ یہ بینڈ کیوں لے آئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ میری رہائی کا جشن منانے کے لیے تھا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا اور مَیں نے ان سے کہا کہ یہ خوشی منانے کا موقع نہیں ہے۔ مانا کہ مجھے رہا کر دیا گیا تھا لیکن ابھی میرے ہزاروں دوست اور ساتھی جیل میں تھے۔

میری درخواست پر بینڈ روک دیا گیا اور ہٹا دیا گیا ——— کار جس وقت ہوڑہ پُل کو پار کر رہی تھی، میرا ذہن گزرے ہوئے دنوں کی سمت چل پڑا۔ مجھے وہ دن یاد آیا،

جب تین برس پہلے، ورکنگ کمیٹی اور اے، آئی، سی، سی کی میٹنگوں میں شرکت کی غرض سے میں بمبئی کے لیے روانہ ہوا تھا۔ میری بیوی، مجھے رخصت کرنے کے لیے گھر کے دروازے تک آئی تھیں۔ اب تین برس بعد میں لوٹ رہا تھا، لیکن وہ اپنی قبر میں تھیں اور میرا گھر خالی تھا۔ مجھے ورڈز سورتھ کے یہ مصرعے یاد آ گئے:

لیکن وہ، اپنے مدفن میں ہے، اور، آہ

میرے لیے دنیا کتنی بدل چکی ہے!

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کار موڑ لیں کیونکہ گھر جانے سے پہلے میں اُن کی قبر پر حاضری دینا چاہتا تھا۔ کار میں پھولوں کے گجرے بھرے پڑے تھے۔ میں نے ایک اٹھایا اور ان کی قبر پر رکھ دیا اور خاموشی سے فاتحہ پڑھی۔

⑨

شِملہ کانفرنس

جنگ کی شروعات سے ہی، امریکی رائے عامہ یہ دباؤ ڈال رہی تھی کہ برطانیہ ہندستان کو اس کی آزادی عطا کر دے۔ پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے بعد یو، ایس، اے، براہِ راست طور پر جنگ میں ملوث ہو گیا ——— صدر روزویلٹ نے چرچل کے سامنے بار بار یہ سوال اٹھایا اور شاید انگریز اب سوچنے لگے کہ امریکی مطالبات کی تکمیل کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ جس وقت کرپس مشن آیا، بی۔ بی سی کی اوورسیز سروس سے بار بار نشر کیا گیا کہ اب ہندستان کو اپنی آزادی جیتنے اور جنگ کے بارے میں آزادانہ فیصلہ کرنے کا موقعہ ہاتھ آ گیا ہے۔ صدر روزویلٹ کا ایک ذاتی نمائندہ ہندستان بھی آیا اور میرے لیے ان کا ایک خط لایا۔ اس خط میں، صدر نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ ہندستان کرپس کی پیشکش کو قبول کر لے گا اور اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں شامل ہو جائے گا۔ بہر نوع، کرپس مشن ناکام رہا —— اور صورت حال جوں کی توں بنی رہی۔

اگست ۱۹۴۲ء میں جب ہم گرفتار کیے گئے تھے۔ اس نے یو۔ ایس۔ اے میں ایک ناخوشگوار ردِّ عمل پیدا کیا تھا۔ اس وقت ہمیں یہ پتہ نہیں چلا تھا، مگر بعد کو معلوم ہوا کہ لوگوں نے برطانوی اقدام کے تئیں شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ سینٹ (SENATE)

اور ہاؤس آف ریپرزینٹیٹوز ——— (HOUSE OF REPRESENTATIVES) میں اس معاملے پر بحث ہوئی تھی اور کچھ سخت تقریریں کی گئی تھیں۔

یورپ میں جیسے جیسے جنگ کی صورت حال بہتر ہوتی گئی، امریکی ہندستانی سیاسی مسئلے کے حل کے لیے از سرِ نو باؤ ڈالنے لگے۔ ہو سکتا ہے، یہ بھی ایک سبب رہا ہو جس کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ لارڈ ویول اور سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندستان کے مابین گفتگو کے نتیجے میں، ایک گول میز کانفرنس طلب کی جائے۔ یورپ میں جنگ عملاً اپریل میں ختم ہو چکی تھی، لیکن ایشیا میں اس کے جلد خاتمے کے آثار ناپید تھے ——— جاپان کے قبضے میں ابھی بھی وسیع علاقے تھے اور اس کی اپنی سرزمین کو کسی نے عملی طور پر ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ جنگ کے یورپی تھیٹر میں امریکی اسلحوں کا پہلے سے زیادہ بوجھ استعمال کر کے دیکھا جا چکا تھا، مگر اس کے نتیجے میں تاحال جاپانی شکست کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا یونائٹڈ اسٹیٹس کے لیے بہر حال جاپان کی شکست جرمنی کی شکست سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ امریکیوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہندستان کی پوری حمایت حاصل ہو جائے تو جاپان کو شکست دینا بہت آسان ہو جائے گا ——— جاپان (اس وقت) برما، سنگاپور اور انڈونیشیا پر قابض تھا۔ ان تمام علاقوں میں، سب سے زیادہ مدد ہندستان دے سکتا تھا۔ گو کہ ہٹلر کو یورپ میں کچلا جا چکا تھا، مگر جاپان کو جلد ہرانے کے لیے ہندستانی تعاون ضروری تھا۔ یہ ایک خاص وجہ تھی جس کی بنا پر ہندستانی حمایت کی حصولیابی کے لیے امریکی دباؤ اتنا مستقل تھا۔

کلکتہ اُن دنوں مشرق میں امریکی فوج کے سب سے بڑے مراکز میں سے ایک تھا۔ چنانچہ وہاں امریکی اخباری نامہ نگار اور فوجی افسر بھرے پڑے تھے۔ انھیں مجھ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ سو کلکتے پہنچنے کے اگلے روز، ان میں سے بعض میرے پاس ملاقات کے لیے آئے ——— فضول باتیں کیے بغیر، وہ براہ راست اصل مسئلے پر آ گئے۔ انھوں نے مجھ سے سوال کیا کہ وائسرائے جو پیش کش لے کر آئے ہیں اس کے سلسلے میں کانگریس کا ردِ عمل کیا ہوگا ——— میں نے جواب دیا کہ جب تک مجھے اس پیشکش کی تفصیلات نہ معلوم ہو جائیں میں کوئی قطعی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ جب تک ہندستان برطانیہ کے سیاسی اقتدار کا تابع رہے گا، یہ امر واضح ہے کہ وہ جنگ کے سلسلے میں کسی جوش و خروش کا احساس نہیں کر سکتا۔ وہ شخص جس کے ہاتھ پاؤں

بندھے ہوئے ہوں، بھلا کیونکر ان ہی لوگوں کے دشمن سے لڑائی کے لیے پُرجوش ہو سکتا ہے، جنھوں نے اُسے باندھا تھا؟

اس جواب کو انھوں نے یہ سوال کرتے ہوئے مسترد کر دیا کہ اٹلانٹک چارٹر کے ذریعہ ہندستان کی آزادی کی ضمانت نہیں دی گئی تھی۔ میں نے جھٹ یہ جواب داغا کہ میں نے کہیں بھی اُس چارٹر کو لکھا ہوا نہیں دیکھا اور مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیا شے ہے اور کہاں ہے۔

میں نے مزید کہا کہ غالباً ان کا اشارہ اس معروف بیان کی طرف ہے جو صدر روزویلیٹ نے چرچل سے اپنے مذاکرات کے بعد جاری کیا تھا ——— صدر نے کہا تھا کہ جنگ کے بعد تمام ملکوں کو، حقِ خود رائی کے اصول کے مطابق، اپنے مستقبل کے فیصلے کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ جب مسٹر چرچل سے پارلیمنٹ میں یہ سوال کیا گیا کہ کیا ہندستان کے مستقبل کا فیصلہ اسی بیان کی بنیاد پر کیا جائے گا، تو انھوں نے زور دیتے ہوئے بہت قطعیت کے ساتھ کہا تھا کہ نہیں! ——— انھوں نے ایک بار نہیں بلکہ تین بار یہ اعلان کیا تھا کہ اس نام نہاد چارٹر کا اطلاق ہندستان پر کبھی نہیں ہو گا اور یہ بات واضح کر دی تھی کہ صدر کا بیان ہندستان پر منطبق نہیں ہو گا۔ جب مسٹر روزویلیٹ کی توجہ مسٹر چرچل کے بیان کی جانب مبذول کرائی گئی تو صدر نے اعتراف کیا کہ برطانوی وزیر اعظم سے ان کی گفتگوؤں کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے، چنانچہ چرچل کے لیے ان کا بیان کوئی سیاسی قدر و قیمت نہیں رکھتا اور نہ ہی ان پر عاید ہوتا ہے۔

امریکی نامہ نگار ان حقائق سے بے خبر نہیں تھے۔ اسی لیے، جب میں نے کہا کہ چارٹر کیا شے ہے اور کہاں ہے تو وہ صرف مسکرا دیے ——— ان نامہ نگاروں میں ایک خاتون بھی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے سوال کیا کہ چارٹر کے وجود سے متعلق میرے اس خطیبانہ استفسار کا اشارہ، صدر کے اس اعتراف کی جانب تو نہیں ہے کہ مسٹر چرچل سے ان کی مصالحت کا کوئی تحریری ریکارڈ نہیں ملتا۔

میں نے کہا، بے شک یہی بات میرے ذہن میں تھی! آخری سوال جو نامہ نگاروں نے مجھ سے پوچھا، یہ تھا کہ اگر ویول کی پیشکش کانگریس نے منظور کر لی، تو کیا میں (فوج میں) ہندستانیوں کی جبریہ بھرتی کی حمایت کروں گا۔

میں نے جواب دیا کہ اگر ہندستان کو اس کی آزادی کا یقین دلا دیا جائے، تو وہ رضامندانہ طور پر جنگ میں شامل ہو جائے گا۔ اس وقت ہمارا پہلا فرض تمام تر قومی طاقت کو بروئے کار لانا ہوگا اور ہم جبریہ بھرتی کی حمایت کریں گے۔

نامہ نگار کو میں نے اپنا وہ بیان یاد دلایا، جو بہت پہلے ۱۹۴۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے میں نے دیا تھا ——— میں نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر ہندستان کا سیاسی مسئلہ حل ہو جاتا ہے، تو وہ نہ صرف یہ کہ اپنی مرضی سے جنگ میں شامل ہو جائے گا، بلکہ جبریہ بھرتی کی حمایت بھی کرے گا اور ہر تنومند نوجوان مرد کو محاذ جنگ پر بھیج دے گا۔ اس وقت میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہماری کوشش محض زندہ رہنا نہیں ہے بلکہ جمہوریت کی خاطر جان دے دینا بھی ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے، میں نے مزید کہا، کہ انگریزوں نے ہمیں شان کے ساتھ مرنے کا موقع نہیں دیا اور میری پیشکش مسترد کر دی۔

۱۴ رجون ۱۹۴۵ء کو سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندستان، مسٹر ایل، ایس، ایمیری نے ہاؤس آف کامنز میں ایک بیان دیا جس میں انھوں نے یہ اعلان کیا ہندستان کو ایک آزاد ملک کے طور پر، جنگ کے بارے میں فیصلے کا پورا اختیار دیا جائے گا۔ مزید اس سوال پر کہ کیا انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈروں کو حکومت چلانے کی آزادی ہوگی، مسٹر ایمیری بولے کہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں سے حکومت تشکیل دینے کی درخواست کر رہے ہیں۔ اس طرح، کانگریس کو بشمول مولانا آزاد اور پنڈت نہرو، اپنی پسند کے مطابق کوئی سے بھی نمائندے منتخب کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔

اس بیان نے ہندستان میں یہ عام تاثر پیدا کیا کہ آخر کار ہندستانی سیاسی مسئلہ اب حل ہونے کے قریب ہے۔ لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ اب ایک سبب موجود ہے جس کی بنیاد پر کانگریس پیش کش کو منظور بھی کر سکتی ہے۔ مجھے ہر روز سینکڑوں کی تعداد میں ٹیلی گرام اور خط ملنے لگے جن میں مجھ پر یہ دباؤ ڈالا جاتا تھا کہ کانگریس کو پیش کش قبول کر لینی چاہیے۔

میں نے جب ملک میں یہ ماحول دیکھا تو پریس کو ایک مختصر بیان بھیج دیا ——— میں نے اس امر کی نشاندہی کی کہ کانگریس نے ذمے داری سے کبھی پہلو تہی نہیں کی ہے بلکہ ہمیشہ اس کا

خیر مقدم کیا ہے۔ اگر ہندستان کو یہ موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ اپنی سیاسی اور انتظامی تقدیر کا فیصلہ وہ خود کرے، تو میری تمام تر کوشش یہی ہوگی کہ اس چیلنج کو قبول کر لیا جائے۔ میں نے قطعیت آمیز لفظوں میں یہ اعلان کیا کہ میں آزادی کا ایوان تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔ میرا رویہ تعمیری تھا نہ کہ تخریبی۔

اپنی رہائی کے دوسرے دن، کلکتے میں مجھے وائسرائے کی طرف سے گول میز کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا جو ۲۵ رجون کو شملے کے مقام پر ہونے والی تھی —— میں نے جواب دیا کہ میں نے ۱۲ر جون ۱۹۴۵ء کو بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ طلب کی ہے۔ ورکنگ کمیٹی اس خط پر غور کرے گی اور اپنے نمائندے نامزد کرے گی۔ میں نے انھیں یہ بھی لکھا کہ کانفرنس سے پہلے میں ان سے ملنا چاہوں گا اور یہ پوچھا کہ احمد نگر جیل سے میری جو خط و کتابت ان کے ساتھ ہوئی تھی، اسے جاری کردوں تو انھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔

اس وقت میری صحت بہت خراب تھی۔ میرا وزن چالیس پاؤنڈ سے زیادہ کم ہو گیا تھا اور میں مشکل سے کچھ کھا سکتا تھا۔ مجھ پر ایک ہمہ گیر قسم کی عام نقاہت بھی طاری تھی اور میں خود کو پوری طرح تھکا ہوا محسوس کرتا تھا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ میں وائسرائے سے کانفرنس کو دو ہفتے کے لیے ملتوی کردینے کی درخواست کروں۔ اس طرح مجھے علاج اور صحت کو بحال کرنے کا ایک موقع مل جائے گا۔ میں نے، بہر حال، اسے مناسب نہیں خیال کیا کہ ذاتی صحت کی بنیادوں پر ایک ایسی مہتم بالشان کانفرنس کے التوا کی درخواست کروں۔

میں نے ہمایوں کبیر سے، جو (اس وقت) بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ایک سرکردہ رکن تھے، یہ کہا کہ شملہ کانفرنس کے دوران میرے سکریٹری کے فرائض انجام دیں۔ میں نے ان کو جواہر لال کے نام ایک پیغام کے ساتھ پہلے سے بمبئی بھیج دیا —— جواہر لال سے میں نے یہ کہا تھا کہ ورکنگ کمیٹی کی رسمی میٹنگ سے پہلے انھیں اور مجھے آپس میں مل کر اپنا لائحۂ عمل تیار کر لینا چاہیے —— جواہر لال نے میری تجویز سے اتفاق کیا اور کہا کہ اسی طریقِ کار کا خیال ان کے ذہن میں بھی آیا تھا۔

۱۲ر جون کو میں بمبئی پہنچا۔ حسبِ معمول بھولا بھائی ڈیسائی کے ساتھ قیام کیا ——

یہ وہی کمرہ تھا جہاں سے مجھے ۹ راگست ۱۹۴۲ء کی صبح کو گرفتار کیا گیا تھا۔ جب میں برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا اور دوستوں سے باتیں کر رہا تھا تو مجھے مشکل سے یقین آتا تھا کہ (اس واقعے کو) تین برس گزر چکے ہیں مجھے ایسا لگا جیسے یہ کل ہی کی بات ہے ——— جب میں دوستوں سے باتیں کر رہا تھا اور ۹ راگست کے بعد سے کوئی واقعہ گویا کہ ہوا ہی نہیں۔ جانا پہچانا گردوپیش اور پرانے دوست، سب کچھ وہی تھا ——— میرے سامنے دُور افق تک بحیرۂ عرب پھیلا ہوا تھا۔

گاندھی جی اپنی عام روش کے مطابق برلا ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ وہیں رکھی تاکہ وہ آسانی سے اس میں حصہ لے سکیں۔ میں نے ورکنگ کمیٹی کو اس دعوت نامے کے بارے میں بتایا، جو مجھے شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے موصول ہوا تھا۔ ورکنگ کمیٹی نے خط پر غور کیا اور فیصلہ کیا کہ مجھے گول میز کانفرنس میں کانگریس کی نمائندگی کا اختیار دیا جانا چاہیے ——— یہ اطلاع وائسرائے کو بھجوا دی گئی جنھوں نے بمبئی سے ہمارے سفر کا انتظام کروایا۔ انھوں نے ایک ہوائی جہاز ہمارے لیے وقف کر دیا، جس سے ہم انبالہ گئے۔ وہاں سے ہم شملہ پہنچے ——— یہاں میں یہ اضافہ کرتا چلوں کہ بمبئی سے روانہ ہونے سے پہلے، وائسرائے کی طرف سے مجھے اس خط کا جواب ملا جو میں نے کلکتے سے روانہ کیا تھا۔ انھوں نے کانفرنس سے قبل مجھ سے ملنے پر بخوشی اپنی رضامندی کا اظہار کیا، لیکن خط و کتابت کے جاری کرنے کی بابت یہ کہا کہ چونکہ میں شملہ آ ہی رہا تھا، اس لیے وہ اس مسئلے پر مجھ سے زبانی گفتگو کرنا پسند کریں گے۔

اس روز سخت گرمی تھی اور جب ہم دہلی پہنچے تو میں پوری طرح تھکن سے چُور ہو چکا تھا۔ انبالہ سے کالکا تک موٹر کا سفر اور بھی مشکل ثابت ہوا۔ راستے بھر ہمیں لوگوں کی بھیڑ ملتی رہی۔ لوگ ہماری کار کو گھیر لیتے، سائڈ بورڈ پر کھڑے ہو جاتے اور یہاں تک کہ چھت پر چڑھ جاتے۔ سخت ترین دشواریوں کے ساتھ ہم آگے بڑھ سکے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے لوگ دیوانے ہو گئے ہیں اور وہ کار کو اسی وقت راستہ دیتے تھے جب ہم بار بار ان سے منتیں کرتے تھے کہ ہمیں جانے دیں تاکہ دیر نہ ہونے پائے۔ بالآخر رات کو دس بجے کے

قریب ہم شملہ پہنچے ——— ہم سیدھے سیلوائے ہوٹل گئے۔ جہاں ہمارے لیے کمرے مخصوص کر دیے گئے تھے۔

اگلی صبح دس بجے میں نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ انھوں نے خوش اخلاقی کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور برطانوی حکومت کی طرف سے وہ جو تجویزیں لائے تھے، مختصر طور پر ان کی وضاحت کی۔ انھوں نے کہا کہ جنگ کی مدت تک کسی طرح کی دور رس آئینی تبدیلیاں نہیں کی جائیں گی، مگر وائسرائے کی مجلس منتظمہ تمام و کمال ہندستانی ہوگی اور وہ یہ رسم قائم کرنے کی کوشش کریں گے کہ وائسرائے ہمیشہ کونسل (مجلس منتظمہ) کے مشورے پر عمل پیرا ہو۔ انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ حکومت پر بھروسہ رکھوں۔ ان کی مخلصانہ آرزو تھی کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی ہندستان کا مسئلہ حل ہوجانا چاہیے۔ انھوں نے یہ نشان دہی کی کہ جنگ اب اختتام پذیر تھی۔ چنانچہ، ہندستان کے حق میں یہ اچھا ہوگا کہ پیشکش کو قبول کرلے اور جنگ کو ایک فتح مندانہ خاتمے تک لے جانے میں انگریزوں کے ساتھ تعاون کرے۔ اس کے بعد انھوں نے مسلم لیگ کا ذکر کیا اور کہا کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں مصالحت لازمی طور پر ہو جانی چاہیے۔

میں نے ان سے صاف کہا کہ لیگ سے مفاہمت بہت مشکوک نظر آتی ہے۔ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں لیگ کی باگ ڈور ہے، اس تاثر کے تابع دکھائی دیتے ہیں کہ انھیں حکومت کی حمایت حاصل ہے، اور اسی لیے وہ کوئی معقول شرط قبول نہیں کریں گے۔

وائسرائے نے زور دے کر کہا کہ حکومت کی طرف سے لیگ کی حمایت کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اگر مسلم لیگ کے لیڈر اس قسم کا کوئی خیال رکھتے ہیں تو وہ سرے سے غلطی پر ہیں انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ حکومت غیر جانب دار تھی اور غیر جانب دار رہے گی۔

پھر میں نے احمد نگر جیل سے ان کے ساتھ اپنی خط و کتابت کا سوال اٹھایا اور یہ امید ظاہر کی کہ اس کی اشاعت پر انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

وائسرائے نے کہا کہ انھیں اعتراض نہیں ہوگا اگر واقعی میں اس کے لیے بہت مشتاق ہوں، لیکن انھیں ایسا لگتا ہے کہ فی الوقت اس کی اشاعت افسوسناک ہوگی۔ انھوں نے یہ

نشاندہی کی کہ ابھی ہم اس کوشش کے تحت مل رہے ہیں کہ ہندستانی مسئلہ ایک نئے جذبے کے ساتھ حل کیا جائے، اور ان کی خواہش یہ ہے کہ لوگ ماضی کی تلخیوں کو بھلا دیں۔ اگر ایسے وقت میں پرانی یادیں تازہ کی گئیں تو فضا بدل جائے گی اور دوستی اور رفاقت کی جگہ بے اعتباری اور غصے کا رویہ لے لے گا۔ انھوں نے مجھ سے یہ گزارش بھی کی کہ میں اس خط و کتابت کی اشاعت پر اصرار نہ کروں اور کہا کہ میں نے اگر ان کا یہ مشورہ مان لیا تو وہ بہت ممنون ہوں گے۔

میں نے محسوس کیا کہ وائسرائے (اپنے رویے میں) مخلص ہیں اور حقیقتاً یہ چاہتے ہیں کہ فضا میں تبدیلی آ جائے۔ میں نے انھیں بتایا کہ اس آرزومندی میں، میں بھی ان کے ساتھ ہوں کہ ہمیں ایک نیا ماحول پیدا کرنا چاہیے اور اپنا مسئلہ دوستی کے ایک نئے جذبے کے ساتھ حل کرنا چاہیے۔ میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جو اس تبدیلی کے لیے مضر ہو اور اسی لیے مجھے ان کا مشورہ تسلیم ہے۔

وائسرائے نے دوبارہ یہ بات دوہرائی کہ اس رویے پر وہ میرے شکر گزار ہیں۔

اس کے بعد وائسرائے نے اپنی تجویز کی تفصیلات بیان کیں ——— میرا پہلا ردِّ عمل یہ تھا کہ اپنے مواد کے لحاظ سے اس تجویز اور کرپس کی پیشکش میں کوئی فرق نہیں تھا۔ البتہ حالات میں ایک مادی فرق ضرور تھا۔ کرپس کی پیش کش اس وقت سامنے آئی جب انگریزوں کو ہندستانی تعاون کی اشد ضرورت تھی۔ مگر آج یورپ میں جنگ ختم ہو چکی ہے اور اتحادیوں نے ہٹلر پر فتح پالی ہے۔ اس کے باوصف برطانوی حکومت نے ہندستان میں ایک نئی سیاسی فضا پیدا کرنے کے لیے اپنی پچھلی پیش کش دوہرائی ہے۔

میں نے وائسرائے کو بتایا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے مجھے یہ اختیار سونپا ہے کہ اس کی طرف سے جو چاہوں کروں، لیکن اس کے باوجود، کوئی قطعی جواب دینے سے پہلے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہوں گا۔ اسی لیے میں نے شملہ میں ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ طلب کی تھی تاکہ تجویز پر غور کر لیا جائے۔ اس طرح میں کانفرنس کے سامنے کانگریس کا فیصلہ

پیش کر سکوں گا۔ میں نے بہر حال، لارڈ ویول کو یقین دلایا کہ میری کوشش ایک حل تلاش کرنے کی ہوگی نہ کہ دشواریاں پیدا کرنے کی۔

میرے سامنے وائسرائے نے تجویزیں بیان کیں تو میں ان کی صاف گوئی اور خلوص سے متاثر ہوا۔ میں نے یہ دیکھا کہ ان کا رویہ کسی سیاست داں کا نہیں بلکہ ایک سپاہی کا ہے۔ وہ دوٹوک اور براہِ راست انداز میں باتیں کرتے تھے اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھنے کی کسی کوشش کے بغیر اصل نکتے پر آجاتے تھے۔ اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ ان کا رویہ سر سٹیفرڈ کرپس کے رویے سے بہت مختلف ہے۔ کرپس نے اپنی تجاویز کو اس حد تک اچھی روشنی میں دکھانے کی کوشش کی تھی جس حد تک ممکن ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے مضبوط نکات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور دشواریوں کو چھپانے کی کوشش کی۔ لارڈ ویول نے کسی رنگ آمیزی کی کوشش نہیں کی اور بلاشبہ وہ مجھے مرعوب کرنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ انھوں نے بہت برجستہ انداز میں یہ کہا کہ جنگ ابھی جاری ہے اور جاپان ایک طاقت ور حریف ہے۔ اس طرح کی صورت حال میں برطانوی حکومت کوئی دُور رس قدم اُٹھانے پر آمادہ نہیں ہے ایسی باتوں کے لیے جنگ کے خاتمے کا انتظار ضروری ہے۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ دُور رس تبدیلیوں کے لیے اس وقت بنیادیں رکھی جا سکتی ہیں۔ مجلسِ منتظمہ یکسر ہندستانی ہوگی۔ اس طرح ملک کے اعلاترین انتظامات ہندستانی ہاتھوں میں ہوں گے۔ ایک بار یہ ہو جائے تو پھر ایک نئی صورت حال ابھرے گی اور جنگ کے بعد مزید ترقی یقینی ہو جائے گی۔

لارڈ ویول سے میری گفت گو نے شملہ میں ایک نئی فضا پیدا کر دی ——— اس رات وہ ایک سرکاری دعوت کا اہتمام کر رہے تھے اور ایسا لگا کہ کھانے کے دوران میرے بارے میں انھوں نے بہت تعریفی کلمات ادا کیے۔ انھوں نے دوسرے کانگریسی لیڈروں کا تذکرہ بھی کیا اور کہا کہ ان کی سیاسی رائے یا حکومت سے ان کے اختلافات جو بھی ہوں، وہ اچھے لوگ ہیں ——— وائسرائے کا یہ قول شملہ بھر میں پھیل گیا اور اس نے سرکاری و غیر سرکاری، دونوں حلقوں میں ایک نئی لہر دوڑا دی۔ بہت سے لوگ جو اس وقت تک کانگریس کے سلسلے میں سرد مہری کا رویہ اپنائے ہوئے تھے اور جو مشکل سے ہی میرے وجود کو پہچانتے

تھے، اچانک ہمارے لیے ان کے جذبات میں گرمی آگئی۔ وہ میرے لیے بہت سے تحفے لائے اور مجھے یہ باور کرانا چاہا کہ صدق دل سے وہ ہمیشہ کانگریس کے مداح اور حمایتی رہے تھے۔

۴۲ کی بہت سر گوسٹر واڑ ہرنام سنگھ کے مکان پر جہاں گاندھی جی ٹھہرے ہوئے تھے، ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ میں نے وائسرائے سے اپنے انٹرویو کی مختصر روداد پیش کی، اور اس رائے کا اظہار کیا کہ ہرچند ان کی پیشکش کرپس کی پیشکش سے مختلف نہیں تھی، لیکن ہمیں اسے منظور کر لینا چاہیے۔ اپنے موقف کی تائید میں، میں نے بدلے ہوئے حالات کی طرف اشارہ کیا ——— یورپ میں جنگ اب ختم ہو رہی تھی اور جاپان بھی اب زیادہ دنوں تک ٹھہر نہیں سکے گا۔ ایک بار جنگ ختم ہو جائے تو پھر انگریزوں کے پاس ہمارے تعاون کی تلاش کا کوئی خاص سبب نہیں رہ جائے گا۔ اس لیے یہ بات ہمارے لیے مناسب نہیں تھی کہ ویول کی پیش کش کو مسترد کر دیا جائے۔ ہمیں اس کانفرنس میں اس خیال کے ساتھ شریک ہونا چاہیے کہ اگر شرطیں ہمارے لیے مناسب ہوئیں تو ہم انھیں قبول کر لیں گے۔

ایک طویل بحث ہوئی، لیکن اخیر میں ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ کانفرنس میں ہمیں مندرجہ ذیل نکات پر زور دینا چاہیے:

۱۔ وائسرائے سے مجلس منتظمہ کے تعلق کے سلسلے میں ہمارے پاس ایک واضح بیان ہونا چاہیے۔ اگر مجلس منتظمہ (کونسل) کسی متفقہ فیصلے تک پہنچتی ہے تو کیا اس کا فیصلہ وائسرائے کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا یا وائسرائے کو ایسے معاملات میں فیصلے کو کالعدم قرار دینے کا اختیار ہوگا ——— ؟

۲۔ فوج کی حیثیت کا بھی تعین ہو جانا چاہیے۔ اس وقت فوج اور عوام کے درمیان ایک دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ اسے بدلنا چاہیے تاکہ ہندستانی لیڈروں کو فوج سے رابطہ قائم کرنے کا موقع مل سکے۔

۳۔ برطانوی حکومت نے ہندستانی رائے عامہ سے مشورے کے بغیر ہندستان کو جنگ میں ڈھکیل دیا تھا۔ کانگریس نے اس پوزیشن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر کوئی مفاہمت ہو گئی تھی اور ایک نئی مجلس منتظمہ کی تشکیل کر دی گئی تھی تو اسے اس کا حق ہونا چاہیے کہ جنگ میں ہندستان کی شرکت کے سوال کو وہ ہندستانی لیجیسلیٹو اسمبلی کے سپرد کر دے۔ جاپان کے خلاف جنگ میں ہندستان محض برطانوی فیصلے کے نتیجے میں شریک نہیں ہوگا، بلکہ اپنے ہی نمائندوں کی رائے سے ہوگا۔

گاندھی جی جو پوری میٹنگ کے دوران موجود رہے، اس فیصلے میں شریک تھے، اس موقعے پر انھوں نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ جنگ میں شرکت کا مطلب یہ ہے کہ کانگریس عدم تشدد سے دست بردار ہو رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ایک لمحے کے لیے بھی انھوں نے تشدد یا عدم تشدد کا سوال نہیں اٹھایا۔ ورکنگ کمیٹی کے وہ اراکین جو اسی مسئلے پر پہلے مستعفی ہو چکے تھے، وہ بھی اتنے ہی خاموش رہے۔

وائسرائے کے اعلان کے مطابق، کانفرنس میں انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے صدور کے علاوہ، شیڈولڈ کاسٹ اور سکھوں کے نمائندوں نے بھی شرکت کی — سنٹرل اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر اور مسلم لیگ کے ڈپٹی لیڈر، کونسل آف اسٹیٹ میں کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ کے لیڈر اور اسی کے ساتھ اسمبلی میں نیشنلسٹ پارٹی اور یورپین گروپ کے لیڈروں کو بھی مدعو کیا گیا۔ دوسرے شرکا، وہ تھے جو اس وقت صوبائی حکومت کے سربراہ تھے یا حال تک سربراہ رہ چکے تھے۔ ہندو مہاسبھا نے مدعو کیے جانے کی کوشش کی لیکن وائسرائے نے اس کے دعوے کو تسلیم نہیں کیا۔

ہم سے کہا گیا تھا کہ کانفرنس کی شروعات کے معینہ وقت سے ذرا پہلے آجائیں — وائسریگل لاج کے سبزہ زار پر وائسرائے نے ہمارا استقبال کیا جہاں ہمارا رسمی تعارف بھی

ان سے کرایا گیا۔ میں اس وقت بہت کمزور تھا اور چند منٹوں سے زیادہ دیر تک کھڑے رہنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری سر ایوان جینکنس سے میں نے اس کا ذکر کیا اور وہ مجھے ایک کونے میں لے گئے جہاں ایک صوفہ رکھا ہوا تھا۔ میرے چند منٹ وہاں بیٹھے رہنے کے بعد وہ ایک خاتون کے ساتھ واپس آئے اور مجھ سے ان کا تعارف ایک لائق عربی اسکالر کے طور پر کرایا۔ میں نے ان سے عربی میں گفتگو کی کوشش کی، مگر اندازہ ہوا کہ خاتون کی عربی دانی 'نعم' (ہاں) اور 'لا' (نہیں) سے آگے نہیں جاتی۔ پھر میں نے انگریزی میں دریافت کیا کہ پرائیویٹ سکریٹری انھیں عربی بولنے میں رواں دواں کیونکر سمجھا تھا ——— انھوں نے کہا کہ بغداد میں چند ماہ انھوں نے گزارے تھے اور پچھلی رات کی ڈنر پارٹی میں، بعض مدعوئین سے انھوں نے یہ بتایا تھا کہ عرب جب کبھی حیران ہوتا ہے تو عجیب عجیب کہتا ہے۔ انھوں نے ہنستے ہوئے مزید کہا کہ مہمان ان کی اس بات سے صاف طور پر مرعوب دکھائی دیتے تھے اور ان پر یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ وہ عربی اسکالر ہیں۔

چند منٹوں بعد لارڈ ویول آئے اور بولے کہ اب کانفرنس روم میں چلنے کا وقت آگیا ہے۔ نشستیں اس طرح ترتیب دی گئی تھیں کہ وائسرائے عین وسط میں تھے۔ خاص حزب مخالف کے طور پر کانگریس وائسرائے کے بائیں طرف تھی، لیگ ان کے دائیں طرف ——— یہ شاید غیر شعوری طور پر اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ (مسلم لیگ) حکومت کی حامی ہے۔ دن بھر بحثیں چلتی رہیں، بیچ میں صرف کھانے کا وقفہ ہوا۔ کانفرنس نجی نوعیت کی تھی اور پریس کو مدعو نہیں کیا گیا تھا ——— پہلی نشست کے بعد میں نے لارڈ ویول سے کہا کہ ہماری گفتگو کے بارے میں زبردست قیاس آرائیاں کی جائیں گی تاوقتیکہ سرکاری طور پر اخباروں کو کچھ بتا دیا جائے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ایک پریس رپورٹ جاری کر دی جائے لیکن وہ ایسی ہونی چاہیے جس پر پارٹیاں متفق ہو سکیں۔ انھوں نے کہا کہ ہر نشست کے بعد ایک سرکاری بیان تیار کیا جائے گا اور جاری کیے جانے سے پہلے کانفرنس اس کی تصدیق کرے گی ——— چنانچہ اسی شام مجھے ایک ڈرافٹ (مسودہ) موصول ہوا۔ اور ایک دو ضمنی ترمیموں کے ساتھ میں نے اسے واپس بھیج دیا۔ پریس کو دیے جانے سے

پہلے بیان میں یہ ترمیمات شامل کرلی گئیں۔ اسی طریقِ کار پر پوری کانفرنس کے دوران عمل کیا جاتا رہا۔

کانفرنس شروع ہونے کے بعد جلدی ہی، کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کھل کر سامنے آگئے۔ دوسرے دن تک، چند خاص اصولوں مثلاً اقلیتوں کی نمائندگی، جنگی تیاری کی پورے دل سے حمایت اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت نو تشکیل مجلس منتظمہ کو برقرار رکھنے پر کانفرنس کا اتفاق تھا۔ مگر مجلس منتظمہ کی تشکیل کے مسئلے پر اختلافات بھی اُٹھ کھڑے ہوئے —— مسٹر جناح کا مطالبہ یہ تھا کہ کانگریس تمام ہندو اراکین کو نامزد کرسکتی تھی لیکن مسلمان اراکین کی نامزدگی مسلم لیگ کی طرف سے ہونی چاہیے۔ میں نے یہ نشاندہی کی کہ کانگریس اس قسم کے مطالبے کو کبھی تسلیم نہیں کرسکتی۔ اس نے تمام سیاسی مسئلوں کے سلسلے میں ایک قومی نقطۂ نظر کا رویّہ اختیار کیا تھا، اور سیاسی مسئلوں پر ہندو مسلمان کی تقسیم قبول نہیں کی تھی۔ یہ کسی بھی حالت میں صرف ایک ہندو تنظیم ہونے کو تیار نہیں تھی۔ اس لیے، میں نے اصرار کیا کہ کانگریس کو اپنی پسند کے کسی بھی ہندستانی کو نامزد کرنے کی آزادی ہونی چاہیے، اس حقیقت سے بے نیاز ہوکر کہ وہ ہندو تھا یا مسلمان یا عیسائی یا پارسی یا سکھ، کانگریس یا تو ہندستانی قومیت کی بنیاد پر شریک ہوگی یا پھر سرے سے شریک ہی نہیں ہوگی —— جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق تھا، یہ فیصلہ خود اسے کرنا تھا کہ اس کے نمائندے کون ہوں۔

۲۶ جون کی صبح کو کانفرنس پھر سے یکجا ہوئی، لیکن دن کے کھانے سے پہلے ہی برخاست ہوگئی، تاکہ مندوبین آپس میں بات چیت کرسکیں۔ مسٹر جناح نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ کانگریس سے ایک غیر رسمی گفتگو کریں گے۔ میں نے اس مقصد کے لیے پنڈت گووند بلبھ پنت کو نامزد کیا جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ مسٹر جناح سے مذاکرات کے لیے موزوں ترین شخص ہوں گے۔ ان کی گفتگو کئی روز تک چلتی رہی، مگر آخیر میں لاحاصل ثابت ہوئی۔ خضر حیات خاں، جو سربراہ پنجاب کی حیثیت سے کانفرنس میں شریک تھے۔ اس مدت کے دوران کئی مرتبہ مجھ سے ملے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تمام سوالات پر انھوں نے ایک انتہائی

معقول رویہ اپنایا تھا، اور جیسے جیسے مسئلے اُٹھتے گئے، انھیں حل کرنے میں وہ بہت معاون اور مددگار ثابت ہوئے۔

ہندستان کی سیاسی تاریخ میں شملہ کانفرنس ایک حدفاصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب مذاکرات، ہندستان اور برطانیہ کے مابین بنیادی سیاسی مسئلے کو لے کر نہیں بلکہ مختلف ہندستانی گروہوں کو تقسیم کرنے والے فرقہ وارانہ مسئلے کی بنیاد پر ناکام ہوئے۔

اس تبدیلی کو سمجھنے کے لیے مسلم لیگ کی تاریخ پر پیچھے مڑ کر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ سیاسی مسئلوں کی جانب مسلم لیگ کے رویے میں تین مرحلوں کی نشاندہی صاف طور پر کی جا سکتی ہے۔

مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں، کرسمس کے دوران مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے بعد ڈھاکہ کے مقام پر عمل میں آیا تھا۔ اس کا آغاز، نواب مشتاق حسین کی کوششوں کے طفیل ہوا۔ اس اجلاس میں، میں موجود تھا اور لیگ کے قیام کے لیے جو دو وجہیں پیش کی گئی تھیں، مجھے یاد ہیں۔ یہ کہا گیا تھا کہ لیگ کے مقاصد میں سے ایک یہ ہوگا کہ ہندستان کے مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے لیے وفاداری کے ایک احساس کو تقویت اور ترقی دی جائے ——— دوسرا مقصد تاج برطانیہ کے تحت ملازمتوں کے سلسلے میں ہندوؤں اور دوسرے فرقوں کے بالمقابل مسلمانوں کے حقوق کو فروغ دیا جائے اور اس طرح مسلم مفادات اور حقوق کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ لیگ کے لیڈران، فطری طور پر، کانگریس کے ذریعے اٹھائے جانے والے سیاسی آزادی کے مطالبے کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمان ایسے کسی مطالبے میں شامل ہو گئے تو تعلیم اور ملازمتوں میں، انگریز اُن کے خصوصی مراعات کے دعووں کی حمایت نہیں کریں گے۔ دراصل، وہ کانگریس کو باغیوں کی ایک بے وفا تنظیم کا نام دیتے تھے اور گوکھلے یا سر فیروز شاہ مہتہ جیسے اعتدال پسند سیاسی لیڈروں کو بھی انتہا پسند خیال کرتے تھے۔ اس مرحلہ میں برطانوی حکومت نے مسلم لیگ کو کانگریس کے مطالبات کو بے اثر بنانے کے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا۔

اپنی سرگرمیوں کے دوسرے مرحلے میں مسلم لیگ اس وقت داخل ہوئی جب اس نے

دیکھا کہ کانگریس کے دباؤ کے نتیجے میں حکومت چند اصلاحات پیش کرنے پر مجبور ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ کانگریس قدم بہ قدم اپنا مقصد حاصل کرتی جا رہی ہے تو وہ کسی قدر پریشان ہوئی ——— لیگ ابھی تک سیاسی جدوجہد سے لاتعلق تھی، لیکن جیسے ہی کوئی پیش رفت ہوتی، وہ مسلمانوں کے فرقے کی طرف سے کوئی دعوا پیش کر دیتی۔ مسلم لیگ کا یہ منصوبہ حکومت کو اچھی طرح راس آتا تھا۔ واقعتاً ایسے اسباب موجود ہیں جن کی بنا پر یہ سوچا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ انگریزوں کی خواہشوں کے مطابق عمل کر رہی تھی۔ مورلے منٹو اصلاحات اور اسی کے ساتھ ساتھ صوبائی خود مختاری کی مونٹفورڈ اسکیم کے دوران یہی رویّہ لیگ نے اختیار کر رکھا تھا۔

اس کے بعد، دوسری عالمی جنگ کے دوران لیگ کے منصوبے کا تیسرا مرحلہ سامنے آیا۔ کانگریس نے زبردست وقار اور طاقت حاصل کر لی تھی ——— اب یہ واضح ہو چلا تھا کہ برطانوی حکومت کو ہندستان کی آزادی تسلیم کرنی پڑے گی۔ مسٹر جناح اب مسلم لیگ کے لیڈر بن گئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ انھیں کانگریس اور حکومت کے مابین ہر اختلاف سے لازماً فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ جب بھی کبھی اقتدار کی منتقلی کے سلسلے میں کانگریس اور حکومت کے مابین بحثیں ہوئیں، شروع میں مسٹر جناح خاموش رہتے۔ اگر مذاکرات ناکام ہو جاتے تو مسٹر جناح دونوں پارٹیوں کی مذمت میں ایک کمزور سا بیان جاری کر دیتے۔ یہ کہتے ہوئے کہ چونکہ کوئی سمجھوتا نہیں ہوا اس لیے برطانوی پیشکش پر مسلم لیگ کو کوئی رائے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے اگست ۱۹۴۰ء کی پیشکش اور ۱۹۴۲ء میں کرپس کی تجاویز کے دوران یہی کچھ کیا۔ البتہ شملہ کانفرنس نے انھیں ایک ایسی صورت حال سے دوچار کیا جس سے ان کا سابقہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، سیاسی مسئلوں پر کانگریس اور حکومت کے مابین تمام بحثیں اب تک ناکام ثابت ہو چکی تھیں۔ کانگریس ایسے کسی حل کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھی جو ہندستان کی آزادی کا یقین نہ دلاتا ہو۔ اسی لیے گفت و شنید سیاسی مسئلوں پر ہی دم توڑ دیتی تھی اور کبھی کبھی فرقہ وارانہ سوال تک نہیں پہنچتی تھی۔ شملہ کانفرنس میں، میں نے کانگریس

ورکنگ کمیٹی کو لارڈ ویول کی پیش کش قبول کرنے پر راضی کر لیا۔ اب جب کہ ہندستان اور برطانیہ کے مابین سیاسی مسئلہ حل ہوتا نظر آنے لگا تھا، نئی مجلسِ منتظمہ میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے سوال پر کانفرنس دم توڑ بیٹھی۔

یہ وضاحت میں پہلے ہی کر چکا ہوں کہ اس سوال پر کانگریس نے ایک قومی موقف اختیار کیا تھا جب کہ مسلم لیگ یہ مطالبہ کرتی تھی کہ کانگریس اپنے قومی کردار کو ترک کر دے اور ایک فرقہ پرست تنظیم کے طور پر کام کرے۔ مسٹر جناح نے یہ عجیب وغریب دعوا کیا کہ کانگریس مجلسِ منتظمہ کے صرف ہندو اراکین کو نامزد کر سکتی ہے۔ میں نے کانفرنس کے سامنے یہ سوال رکھا کہ کانگریس کسے نامزد کرے، اس سلسلے میں احکام جاری کرنے کا حق مسٹر جناح یا مسلم لیگ کو کیونکر پہنچتا ہے؟ ——— اگر کانگریس مسلمانوں، پارسیوں، سکھوں یا عیسائیوں کے نام پیش کرتی ہے تو اس سے ہندو نمائندوں کی تعداد گھٹے گی، مگر اس سے مسلم لیگ کو کیا لینا دینا؟ لارڈ ویول سے میں نے گزارش کی کہ قطعیت آمیز لفظوں میں بتائیں کہ کیا مسلم لیگ کے موقف کو معقول قرار دیا جا سکتا ہے۔

لارڈ ویول نے دوٹوک جواب نہیں دیا، مگر جو کچھ انھوں نے کہا اس سے یہ مطلب نکلتا تھا کہ مسلم لیگ کے موقف کو وہ معقول تسلیم نہیں کر سکتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ معاملہ ایسا ہے جس کا فیصلہ کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین ہو جانا چاہیے۔ اور حکومت کے لیے یا بہ حیثیت ایک فرد خود ان کے لیے یہ مناسب نہیں ہوگا کہ کسی بھی پارٹی پر اپنا فیصلہ تھوپ دیں۔

مجلسِ منتظمہ کی تشکیل کے بارے میں یہ اختلافات، سیاسی مسئلے پر مفاہمت کی منزل تک پہنچ جانے کے بعد کھل کر سامنے آئے۔ جب عام خاکہ منظور کر لیا گیا تو پارٹیوں کی جانب سے اپنے نمائندوں کے نام تجویز کرنے کا وقت آیا۔ ظاہر ہے کہ کانگریس کی فہرست میں پہلا نام کانگریس صدر کا تھا۔ ہم نے جواہر لال اور سردار پٹیل کے نام بھی شامل کر لیے۔ دوسرے دو ناموں کی بابت ہم میں، اس سے پہلے کہ ہم کچھ طے کر پاتے، خاصی بحثیں ہوئیں۔ میں ایک پارسی اور ایک عیسائی کو شامل کرنے کے حق میں تھا۔

مختصراً یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں نے اقلیتوں کے ان نمائندوں کی شمولیت پر زور کیوں دیا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں جب ہم گرفتار کیے گئے، اس وقت برطانوی حکومت نے بعض اقلیتوں کو کانگریس کے خلاف اکسانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک اقلیت پارسیوں کی تھی۔ یہ ایک بہت چھوٹا سا فرقہ ہے لیکن اپنی تعلیم، دولت اور لیاقت کی وجہ سے قومی زندگی میں اس نے ایک اہم مقام حاصل کر رکھا ہے ——— میرا خیال تھا کہ جب نریمان کو نظر انداز کر کے بی، جی، کھیر کو بمبئی کا وزیرِ اعلا منتخب کیا گیا تھا، اس وقت اس فرقے کے ایک فرد کے ساتھ ناانصافی برتی گئی تھی۔ اس واقعے کی طرف اشارہ میں پہلے ہی کر چکا ہوں ——— ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے ایک فیصلے سے بھی پارسی متاثر ہوئے تھے۔ شراب پر جب تمام کانگریسی صوبوں میں پابندی عاید کی گئی تھی تو اس قانون کا اثر دوسرے فرقوں کی بہ نسبت پارسی تاجروں پر زیادہ پڑا تھا۔ شراب کی تجارت پر ان کا تقریباً اجارہ تھا اور شراب بندی کی وجہ سے ان کا کروڑوں روپے کا کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا۔ مگر، ان واقعات سے، بہ طور ایک فرقے کے، پارسی متاثر نہیں ہوئے کیوں کہ انھوں نے انگریزوں کے ہاتھ میں کھلونا بننے سے انکار کر دیا ——— ایک بیان میں، جس پر اس فرقے کے تقریباً تمام اہم اور معتبر لیڈروں نے دستخط کیے، صاف لفظوں میں یہ اعلان کیا گیا کہ دوسرے معاملات میں اپنے اختلافات کے باوجود، ہندستان کی آزادی کے مسئلے پر وہ کانگریس کے ساتھ تھے اور ساتھ رہیں گے۔

جب میں نے احمد آباد جیل میں یہ بیان پڑھا تو میں بہت متاثر ہوا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ بیان جاری کر کے پارسیوں نے ہندستان کی اچھی خدمت کی ہے۔ میں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ ہمیں اس حسنِ سلوک کا مناسب اعتراف کرنا چاہیے۔ گرچہ پارسیوں کا فرقہ تعداد کے لحاظ سے بہت مختصر ہے، لیکن میرا خیال تھا کہ ہندستان کی آئندہ حکومت میں انھیں جگہ ضرور ملنی چاہیے ——— چنانچہ، جس وقت ہم مجلسِ منتظمہ کے لیے نامزد کیے جانے والے کانگریسیوں کی فہرست تیار کر رہے تھے، میں نے اصرار کیا کہ کانگریس کی طرف سے داخل کی جانے والی فہرست میں ایک پارسی نام ضرور ہونا چاہیے۔ بہر حال، وہ اس پر رضامند ہو گئے کہ آئندہ حکومت میں ایک پارسی کے لیے جگہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ مگر اس سے میں اتفاق

نہیں کر سکتا تھا۔ مَیں نے کہا کہ مستقبل غیر یقینی ہے، اب، جب کہ ہمیں اپنی پسند کے لوگوں کو نامزد کرنے کا موقع ملا ہے، ہمیں اپنی فہرست میں ایک پارسی شامل کرنا ہی چاہیے۔ دو روز کی بحث کے بعد، بالآخر میری بات مان لی گئی۔

مَیں نے کانگریس کی فہرست میں ایک ہندوستانی عیسائی کی شمولیت پر بھی زور دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس فرقے کا کوئی نمائندہ کسی اور ذریعے سے نہیں آسکتا تھا (مجلس منتظمہ میں) سکھوں اور شیڈولڈ کاسٹ کی نمائندگی تو ہر حال میں ہو جائے گی، لیکن جب تک کانگریس کی طرف سے ضمانت نہ دی جائے، حکومت میں کسی سکھ کو جگہ نہیں مل سکے گی۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ ہندوستانی عیسائی فرقہ ہمیشہ کانگریس کے ساتھ رہا ہے اور ہمارے تمام سیاسی مسئلوں میں اس نے ایک قومی رویّہ اختیار کیا ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کی پیش کردہ فہرست میں صرف دو ہندو نام شامل تھے۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا، اگر اس قسم کے کسی ثبوت کی ضرورت تھی، کہ کانگریس ایک ہندو تنظیم نہیں ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندو، جو ہندوستان کی سب سے بڑی اکثریت تھے، اس تجویز پر معترض ہو سکتے تھے، لیکن ان کی تعریف میں یہ بات جاتی ہے کہ ہندوستان کی ہندو اکثریت مضبوطی کے ساتھ کانگریس کے پیچھے کھڑی رہی اور اس وقت بھی، جب اس نے دیکھا کہ کانگریس کی پانچ افراد پر مشتمل فہرست میں سے تین مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں کے نمائندے ہیں، اس کے رویّے میں کوئی فرق نہیں آیا —— ہندو مہا سبھا نے کانگریس کے اس فیصلے سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، مگر سب کو پتہ ہے کہ وہ کس بُری طرح ناکام ہوئی۔ یہ قسمت کی کیسی انوکھی ستم ظریفی ہے کہ مہا سبھا ہی کی طرح، مسلم لیگ نے بھی اس کی مخالفت کی تھی کہ کانگریس اپنی فہرست میں کوئی مسلمان نام شامل کرے۔

دس برس بعد، ان واقعات کی طرف مُڑ کر دیکھتے ہوئے، مَیں آج بھی یہ سوچ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ مسلم لیگ کے رویّے کی وجہ سے کتنی عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ وہ فہرست جو خود لارڈ ویول نے تیار کی تھی۔ اس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے پانچ پانچ نام اور

کے علاوہ، مزید چار نام شامل تھے۔ ان میں سے ایک سکھوں کا نمائندہ تھا، دو شیڈولڈ کاسٹ کے اور چوتھا نام خضر حیات خاں کا تھا جو اس وقت پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ جناح نے اس تجویز پر کہ مجلس منتظمہ میں دو ایسے مسلمان بھی ہوں جن کی نامزدگی خود جناح کی طرف سے نہ کی گئی ہو، بہت شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ خضر حیات خاں مجھ سے ملاقات کے لیے آئے تو میں نے انھیں یقین دلایا کہ کانگریس ان کی شمولیت پر اعتراض نہیں کرے گی ــــــ میں نے یہی بات لارڈ ویول کے سامنے بھی دہرائی۔ اس لیے، اگر کانفرنس جناح کی مخالفت کے سبب سے ناکام نہ ہوئی ہوتی، تو نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمان جن کی آبادی کا تناسب ہندستان میں صرف پچیس فی صدی کے قریب ہے، چودہ اراکین کی کونسل (مجلس منتظمہ) میں ان کے سات نمائندے ہوتے ــــــ یہ کانگریس کی سخاوت کا ثبوت ہے اور اس سے مسلم لیگ کی حماقت پر بہت تیز روشنی پڑتی ہے۔ لیگ کو مسلم مفادات کا سرپرست سمجھا جاتا تھا، تاہم یہ اس کی مخالفت کا ہی نتیجہ تھا کہ غیر منقسم ہندستان کی حکومت میں، ہندستان کے مسلمان ایک معقول حصّہ پانے سے محروم رہے۔

کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد میں نے پریس سے خطاب کیا اور کانفرنس میں کانگریس کی شمولیت کے راستے میں جو دشواریاں تھیں، ان کی وضاحت کی۔ ہمارے سامنے تجویزیں اچانک پیش کی گئی تھیں ــــــ ۱۵ جون کو مجھے اور میرے ساتھیوں کو رہا کیا گیا تھا، اور ہمیں اس منصوبے پر فی الفور کوئی فیصلہ کرنا تھا* ہم ایک نئی دنیا میں پھینک دیے گئے تھے اور مشکلات کے باوجود ورکنگ کمیٹی نے کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کیا تھا۔ ہمیں یہ احساس تھا کہ بین الاقوامی میدان میں وسیع تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں اور بلاشبہ ان تبدیلیوں کا اثر ہندستان کے مسئلے پر پڑ رہا تھا۔ ان تبدیلیوں کا ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ ہندستان کی آزادی اور دوسرے ایشیائی ممالک کی آزادی کے سوال کو سب سے نمایاں جگہ دی جائے۔*

میں نے پریس کو بتایا کہ وائسرائے سے اپنی گفتگو کے دوران، میں نے کانگریس کے قومی کردار پر زور دیا تھا۔ میں نے وائسرائے پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ موجودہ تعطل کو دور کرنے کے لیے، کانگریس ورکنگ کمیٹی ہر معقول طریقے سے اپنا تعاون دینا چاہتی تھی۔ چنانچہ، خراب حالات کے باوجود، کانفرنس میں شرکت کے لیے کانگریس شملہ آئی تھی لیکن

ورکنگ کمیٹی خواہ کچھ بھی فیصلہ کرے، اس کی تصدیق و توثیق آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی طرف سے بھی مطلوب ہوگی۔

جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں کے بارے میں اپنے مشاہدات کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے یہ بھی کہا کہ اگر شملہ کانفرنس کامیاب ہو جاتی تو جاپان کے خلاف جنگ، جاپان کے خلاف صرف برطانیہ کی جنگ بن کر نہ رہ جاتی، بلکہ جاپان کے خلاف ہندستان کی جنگ بھی بن جاتی ـــــــ جہاں تک جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کو آزاد کرانے کا سوال ہے، اس سلسلے میں دو رائیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ ہندستان کی نئی حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ جاپان کے خلاف جنگ اس وقت تک جاری رکھے جب تک کہ یہ تمام ملک آزاد نہ ہو جائیں۔ بہر نوع، نئی ہندستانی حکومت اس تجویز میں حصہ دار نہیں بن سکتی تھی کہ یہ ممالک پھر سے اپنے سابق یورپین حکمرانوں کے حوالے کر دیے جائیں۔ ہم جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں میں صورت حال کو بدستور قائم رکھنے کے لیے نہ تو اپنا ایک بھی ہندستانی فوجی جانے دیں گے، نہ ہی اس مقصد پر اپنا ایک پیسہ خرچ ہونے دیں گے۔

میں نے پریس کو یہ بھی بتایا کہ ہندستانی ہاتھوں میں اقتدار کی منتقلی کے بنیادی مسئلے پر جب متفقہ فیصلہ ہو گیا تو کانفرنس نے نئی مجلس منتظمہ (کونسل) کی تشکیل اور تعداد اراکین پر غور کرنا شروع کیا۔ پھر کانفرنس ملتوی کر دی گئی تھی تاکہ کسی سمجھوتے تک پہنچنے کے لیے فریقین میں نجی اور غیر رسمی سطح پر بھی کچھ گفتگو ہو سکے۔ میں نے اس وقت جو بیان جاری کیا تھا، اب اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کرتا چلوں:

> گفتگو کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی۔ اس غیر رسمی بات چیت کے دوران مسٹر جناح کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے نئی مجلس منتظمہ میں مسلم لیگ کو مسلم اراکین نامزد کرنے چاہئیں۔ کانگریس کا خیال تھا کہ اس طرح کا موقف اس کے بنیادی قومی کردار سے ہم آہنگ نہیں ہوگا۔ آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے (ہمارے لیے) یہ محض نشستوں کا

سوال نہیں ہے بلکہ (یہ سوال) ہمارے اساسی اصولوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہم بعید ترین امکانی حد تک مسلم لیگ سے مفاہمت کے لیے تیار تھے، لیکن مسٹر جناح نے ایک غیر مصالحتی رویہ اختیار کر لیا۔

* وائسرائے نے مختلف گروہوں سے ناموں کی فہرستیں داخل کرنے کو کہا جن میں سے ہز ایکسی لینسی کو پارٹی لیڈروں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد مجلس منتظمہ (کے اراکین) کا انتخاب کرنا تھا۔ ۱۲ر جولائی کو ہز ایکسی لینسی سے میری جو گفت گو ہوئی، اس میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جہاں تک مسلم نشستوں کا تعلق ہے، انھوں نے ایک فہرست تیار کرنے کی سعی کی تھی اور اسے مسٹر جناح سے منظور کروانا چاہتے تھے۔ وائسرائے نے مزید کہا کہ انھوں نے بس بھر کوشش کی، لیکن مسٹر جناح کو قائل کرنے میں ناکام رہے ہیں، جن کا اصرار تھا کہ تمام مسلم اراکین کی نامزدگی لیگ ورکنگ کمیٹی کی جانب سے ہونی چاہیے۔ وائسرائے یہ ماننے پر راضی نہیں تھے اور ان کا خیال تھا کہ فی الوقت اس تجویز کے ساتھ کوئی قدم اٹھانا مفید مطلب نہ ہوگا۔ *

موجودہ صورت حال سے دو نکات ابھرتے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ کانفرنس کی ناکامی کی ذمے داری مسلم لیگ کے رویے پر عائد ہوتی ہے۔ دوسرا نکتہ جو مسلم لیگ کے انکار سے برآمد ہوتا ہے یہ ہے کہ اب لارڈ ویول کو فیصلہ کرنا ہے کہ آگے جانا چاہیے یا نہیں۔ ہز ایکسی لینسی نے طے کیا ہے کہ سر دست کوئی قدم نہیں اٹھانا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے کانفرنس میں جو کچھ کہا تھا، اسے دوہرانا ضروری ہے۔ برطانوی حکومت اپنے آپ کو یہاں کے فرقہ وارانہ مسئلے کی ذمے داری سے لاتعلق نہیں کر سکتی چاہے آج یا کل، اسے انصاف اور دیانت داری کی بنیاد پر ایک مضبوط موقف اپنانا پڑے گا۔ اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اور ایک بار فیصلہ کر لیا جائے تو پھر ہمیں آگے بڑھنا ہی ہے۔ وہ لوگ جو آگے بڑھنے پر آمادہ ہیں، انھیں آگے بڑھنے

کی اجازت ہونی چاہیے، اور جو چھوڑ دیے جانا چاہتے ہیں انھیں چھوڑ دیا جانا چاہیے۔ یقین محکم کے بغیر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ڈانواڈول ذہن اور لڑکھڑاتے ہوئے قدم ہمیں ترقی کے راستے پر کبھی بھی نہیں لے جائیں گے۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں سوچنا چاہیے، لیکن ایک بار فیصلہ ہو جائے تو جھجک، ہچکچاہٹ خوبی نہیں، بلکہ یقینی طور پر کمزوری کی علامت بن جاتی ہے۔

میں نے پریس کے نمائندوں سے کہا کہ کانفرنس میں کانگریس کے موقف پر مجھے کسی بھی طرح کا افسوس نہیں ہے۔

ہم وہاں تک گئے جہاں تک جا سکتے تھے تاکہ مسٹر جناح کی خواہشوں کا لحاظ کیا جا سکے، لیکن ان کا یہ دعوا ہم تسلیم نہیں کر سکتے تھے کہ ہندستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور مختار تنظیم مسلم لیگ ہے۔ ان صوبوں میں، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے، کوئی لیگ وزارت نہیں تھی۔ صوبۂ سرحد میں کانگریس کی وزارت تھی۔ پنجاب میں یونینسٹ وزارت تھی۔ سندھ میں سر غلام حسین کا دارومدار کانگریس کے تعاون پر تھا اور آسام میں بھی یہی پوزیشن تھی چنانچہ یہ دعوا نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی نمائندہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا حلقہ ایسا تھا جسے لیگ سے کچھ بھی لینا دینا نہیں تھا۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میں ہندستان چھوڑو تحریک کے نتائج میں سے ایک کی جانب اشارہ کرنا چاہوں گا۔ اسی دور میں ہندستانی منظرنامے پر کچھ نئی شخصیتیں نمودار ہوئیں۔ انھیں نئی صورت حال کے مطالبات نے ابھارا تھا۔ انھی میں مسز آصف علی تھیں۔ میں پہلے ہی یہ ذکر کر چکا ہوں کہ ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کو بمبئی کے پلیٹ فارم پر انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھیں گی۔ ہماری گرفتاری کے بعد انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا اور برطانوی جنگی تیاری کے خلاف مزاحمت کے لیے لوگوں کو منظم کرتی رہیں۔ وہ تشدد اور عدم تشدد کے امتیازات کی بابت پریشان نہیں تھیں اور ہر وہ طریقہ اپنانے پر آمادہ تھیں جو ان کے نزدیک کارآمد ہو۔

کچھ عرصہ بعد، وہ حکومت کی نظروں میں آگئیں اور انھیں گرفتار کیے جانے کی کوشش ہوئیں۔ مگر وہ روپوش ہوگئیں اور اس طرح گرفتاری سے بچی رہیں ——— اس سلسلے میں انھیں ہندستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد سے مدد ملتی رہی۔ ان میں بہت سے سرکاری عہدیدار یا صنعت کار تھے جنھیں بالعموم حکومت کا وفادار حمایتی سمجھا جاتا تھا۔ بمبئی اور کلکتے کے کچھ تاجروں نے بھی ان کی مدد کی۔ حتیٰ کہ انھوں نے انڈین سول سروس اور ہندستانی فوج کے بعض افسروں کے گھروں پر قیام بھی کیا۔ انھیں (اپنی سرگرمیوں کے لیے) جتنی رقم درکار ہوتی تھی وہ بآسانی جمع ہوجاتی تھی اور وہ ہماری پوری نظربندی کے دوران سرگرم رہیں۔

جب مجھے ۱۹۴۵ء میں رہا کیا گیا، وہ چھپ کر مجھ سے ملاقات کے لیے آئیں۔ میں نے لارڈ ویویل سے ان کے بارے میں بات کی تو انھوں نے کہا کہ وہ ان کی گزشتہ سرگرمیوں کی بنیاد پر انھیں گرفتار نہیں کریں گے۔ لیکن آئندہ کیا ہوگا؟ ——— میں نے لارڈ ویویل سے کہا کہ سیاسی صورت حال بدل چکی ہے اور اب اس کا امکان بہت کم باقی رہ گیا تھا کہ وہ اپنی تخریبی سرگرمیاں جاری رکھیں گی۔ جب مجھے اطمینان ہوگیا کہ انھیں گرفتار نہیں کیا جائے گا تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ اب (روپوشی سے) نکل آئیں ——— چنانچہ ۱۹۴۵ء کے نصف آخر میں انھوں نے یہی کیا۔

ان کی سرگرمیاں اتنی معروف ہو چکی تھیں کہ وائسرائے نے ایک تقریر میں ان کی مثال دیتے ہوئے عدم تشدد کے سوال پر کانگریس کے موقف کی بابت اپنے شک کا اظہار کیا ——— وائسرائے نے کہا کہ جب ورکنگ کمیٹی کے ایک رکن کی بیوی تشدد آمیز سرگرمیوں میں ملوث ہے تو حکومت بھلا کس طرح کانگریس کے ان اعلانات پر یقین کر سکتی ہے جو عدم تشدد سے متعلق ہیں؟ ہمیں احمد نگر جیل میں جب ان واقعات کا پتہ چلا تو میں نے دیکھا کہ آصف علی متفکر ہونے لگے ہیں۔ انھیں اپنی قید کی فکر نہیں تھی مگر وہ ان خطرات کی طرف سے فکرمند تھے جن سے ان کی بیوی دوچار تھیں۔ میں نے یہ کہتے ہوئے انھیں ڈھارس دینی چاہی کہ انھیں فکرمند نہیں ہونا چاہیے، بلکہ برخلاف اس کے، فخر کرنا چاہیے کہ ایک اعلا مقصد کی خاطر، وہ (مسز آصف علی) ایسے حوصلے اور پیش قدمی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

۱۰

عامِ انتخابات

شملہ کانفرنس کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے سختی کے ساتھ تاکید کی کہ تبدیلِ آب و ہوا کے لیے کشمیر چلا جاؤں۔ میری صحت ابھی تک کمزور تھی اور بڑی مشکل سے میں صدر کانگریس کے عام فرائض تک ادا کر پاتا تھا۔ جواہر لال کو بھی (آب و ہوا) کی تبدیلی کی ضرورت تھی اور انھوں نے بھی کشمیر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جولائی اور اگست کے مہینے میں نے گلمرگ میں گزارے۔ میں وہیں پر تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ برطانوی عام انتخابات میں لیبر پارٹی کو غیر معمولی کامیابی ملی ہے۔ فوراً ہی میں نے ایٹلی اور کرپس کے نام مبارک باد کا خط بھیجا۔ میں نے یہ امید ظاہر کی کہ اب کہ لیبر پارٹی اقتدار میں آ چکی ہے، وہ اُن وعدوں کو پورا کرے گی جو اس نے ہندستان سے ہمیشہ ان برسوں میں کیے تھے جب اُسے حزبِ مخالف کی حیثیت حاصل تھی۔ اپنے جواب میں ایٹلی نے کہا کہ ہندستانی مسئلے کے ایک مناسب حل تک پہنچنے کے لیے لیبر پارٹی حتی الامکان کوشش کرے گی۔ کرپس نے (اس مضمون کا) تار بھیجا کہ انھیں امید ہے کہ ہندستان کو مایوسی نہیں ہوگی ——— یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ گاندھی جی اور جواہر لال کو ہمارے درمیان تاروں کا یہ تبادلہ پسند نہیں آیا۔ ان دونوں کو ہندستان کی طرف لیبر پارٹی کے رویّے پر اعتبار نہیں تھا۔ مجھے، بہرحال، یقین تھا کہ لیبر پارٹی ہندستانی مسئلے کا جائزہ ایک

نئے زاویے سے لے گی اور میں اس کے نتیجے کے سلسلے میں پُراُمید تھا۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد وائسرائے نے اعلان کیا کہ اگلی سردیوں میں ہندستان کے عام انتخابات ہو جانے چاہئیں۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوگیا کہ ورکنگ کمیٹی اور اے۔آئی۔سی۔سی کی میٹنگیں طلب کی جائیں۔ کانگریس کے لیے یہ فیصلہ کرنا ضروری تھا کہ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد اب وہ کیا رویہ اختیار کرے۔ کچھ ایسے تھے جو ایک نئی تحریک شروع کرنے کے حق میں تھے۔ دوسروں کا خیال یہ تھا کہ اگر کوئی تحریک شروع نہ کی جائے تو کانگریس کو انتخابات کا بائیکاٹ کرنا چاہیے ——— میرا اپنا خیال یہ تھا کہ ان دونوں تجویزوں کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اگر شملہ کانفرنس ناکام ہوگئی تھی تو اس میں انگریزوں کی غلطی نہیں تھی۔ اس ناکامی کا سبب فرقہ وارانہ تھا نہ کہ سیاسی۔

میں ابھی گلمرگ ہی میں تھا کہ جب عالمی تاریخ میں ایک نئی اور غیر معمولی صورت حال پیدا ہوئی۔ امریکیوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرا دیے۔ ان بموں کے استعمال سے پہلے، عام اندازہ یہ تھا کہ جاپانی مزاحمت کو توڑنے میں کم سے کم دو برس لگ جائیں گے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے صورت حال یکسر بدل گئی تھی۔ جاپانیوں کے پاس اس نئے اور ہولناک ہتھیار کا کوئی جواب نہیں تھا اور وہ غیر مشروط شکست تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ یورپ میں جنگ پہلے ہی ختم ہو چکی تھی ——— چند ہفتوں کے اندر، امریکی فوج نے جاپان کی سرزمین پر قدم رکھا اور ٹوکیو پر قابض ہوگئی ——— عملاً جنرل میک آرتھر جاپان کے حکمراں بن گئے۔

میں اب تک اس یقین پر قائم ہوں کہ جاپان پر بم گرانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا اسلحہ تھا جو دشمن کے حوصلوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیتا تھا۔ دراصل، اس کی طرف سے دُنیا کی بربادی کا خطرہ لاحق تھا۔ جب پہلی عالمی جنگ میں جرمنوں نے انگریزوں کے خلاف زہریلی گیس استعمال کی تو عالمی رائے عامہ نے کھلے لفظوں میں ان کی مذمت کی۔ اگر اس وقت جرمن انسانیت سوزی کے قصوروار تھے، تو اب امریکیوں کو اسی الزام سے کیوں کر بری قرار دیا جاسکتا تھا؟ میرا خیال تھا کہ ایٹم بم کا استعمال تخریب کے جائز حدود سے آگے

چلا جاتا ہے اور اس سے اتحادیوں کے وقار اور ان کی شجاعت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی افسوس ہوا کہ اتحادیوں نے اس واقعے کا خیر مقدم ایک شاندار فتح کے طور پر کیا اور احتجاج کا ایک لفظ بھی مشکل سے سنائی دیا۔

میری صحت ابھی تک کمزور تھی، جولائی اور اگست کا موسم کشمیر کے لیے مناسب نہیں ہے اور میں نے اپنے قیام سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا تھا ——— ستمبر ایک انتہائی خوشگوار تبدیلی لے کر آیا اور میری حالت تیزی سے سدھرنے لگی۔ میری بھوک بڑھ گئی اور میں اس لائق ہو گیا کہ ورزش کر سکوں۔ اگر میں ایک مہینہ اور رک سکتا تو مجھے یقین ہے کہ میری صحت پوری طرح بحال ہو گئی ہوتی ——— بہرنوع، حالات کا تقاضا یہ تھا کہ میں کشمیر کو خیرباد کہوں۔ ورکنگ کمیٹی اور اے۔ آئی۔ سی۔ سی کو میری موجودگی کی ضرورت تھی۔ جب میں (پہاڑ سے) میدانوں میں واپس آیا تو میری صحت میں عارضی بہتری کے آثار بھی غائب ہو گئے۔

ان مہینوں کے دوران آرام اور تفریح کی غرض سے، امریکی اپنے فوجی افسروں کو بڑی تعداد میں کشمیر بھیج رہے تھے۔ ہر دو ہفتے کے بعد افسروں کا ایک نیا جتھا بذریعہ ہوائی جہاز سری نگر پہنچا دیا جاتا۔ ان میں سے کچھ افسر مجھ سے ملاقات کے لیے میرے گھر آئے۔ جب انھوں نے سنا کہ میں دہلی واپس جانے والا ہوں، تو انھوں نے امریکی کمانڈر کے خصوصی طیارے سے مجھے بھجوانے کی پیش کش کی۔ ۔ ۲ستمبر کو میں اُن کے ہوائی جہاز سے دہلی پہنچا اور پونے کے لیے روانہ ہو گیا۔ پونا کے مقام پر ۱۳ستمبر کو ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی اور چند روز بعد اسے بمبئی کے لئے ملتوی کر دیا گیا ——— ورکنگ کمیٹی اور اے۔ آئی۔ سی۔ سی۔ دونوں میں ہماری پالیسی کے نئے رخ پر گرماگرم بحثیں ہوئیں۔ ایک اکثریت کا، جس میں گاندھی جی بھی شامل تھے، خیال یہ تھا کہ ہمیں اپنے آپ کو خالصتاً تعمیری کاموں کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ انھیں یقین تھا کہ سیاسی سطح پر اب زیادہ امید نہیں رہ گئی تھی۔

میں نے یہ دلیل پیش کی کہ لیبر حکومت کی تشکیل کے نتیجے میں برطانیہ میں ایک زبردست تبدیلی آئی تھی۔ ہندستان کے ساتھ لیبر پارٹی کا رویّہ ہمیشہ دوستانہ رہا تھا۔ اس کے پیشِ نظر، مناسب یہ ہو گا کہ ہم اسے اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کا ایک موقع فراہم کریں۔ میرا پختہ یقین

اس بات پر تھا کہ ہمیں کوئی نئی تحریک نہیں شروع کرنی چاہیے بلکہ عام انتخابات میں شریک ہونا چاہیے ۔ میں نے اس امر کی نشاندہی بھی کی کہ ہندستانی مسئلے کو حل کرنے کے لیے شملہ کانفرنس ایک سنجیدہ کوشش تھی ۔ گرچہ یہ کوشش ناکام ہوئی تھی ، مگر ہمیں اس جذبے کی تعریف کرنی چاہیے جس کا مظاہرہ لارڈ ویول نے کیا تھا اور اب ، جبکہ لیبر پارٹی اقتدار میں آچکی ہے تو ہمیں آگے رونما ہونے والے واقعات کا انتظار کرنا چاہیے ——— خاصی بحث کے بعد میری رائیں آخرکار مان لی گئیں ۔

اب میں نے ضروری سمجھا کہ سیاسی قیدیوں کا سوال اٹھایا جائے ۔ حکومت ہند نے (ورکنگ کمیٹی کے) اراکین کو تو رہا کر دیا تھا مگر کانگریس کے ہزاروں عام ممبر ابھی تک جیل میں تھے ۔ شملہ کانفرنس کے وقت مجھ پر یہ واضح نہیں تھا کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے ۔ اسی لیے کانفرنس میں تمام سیاسی قیدیوں کی عام معافی کا سوال میں نے نہیں اٹھایا ۔

کانفرنس کے بعد دو بڑے تغیرات نے پورے منظر نامے کو بدل کر رکھ دیا ۔ پہلا واقعہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی مکمل فتح تھی اور دوسرا ایٹم بم کا گرایا جانا اور جنگ کا ختم ہو جانا تھا ۔ اب سیاسی نقشہ ، قومی بھی اور بین الاقوامی بھی پہلے سے کہیں زیادہ صاف دکھائی دینے لگا ۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ہمیں ایک دوہری پالیسی پر چلنا چاہیے ۔ ایک طرف تو ہمیں ہندستانی عوام میں جدوجہد کے جذبے کو قائم رکھنا چاہیے ، اور دوسری طرف ہمیں جلد بازی میں کوئی قدم اٹھانے سے گریز کرنا چاہیے ۔ جنگ کے ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد ، لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ ہندستان میں عام انتخابات کرائے جائیں گے ۔ جیسے ہی میں نے یہ اعلان سُنا ، میں نے سمجھ لیا کہ سیاسی قیدیوں کی رہائی کا سوال اٹھانے کا وقت اب آگیا ہے ——— ایک بار جب عام انتخابات کا اعلان ہو گیا تو پھر انھیں جیل میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہو گا ۔ میں نے گلمرگ سے لارڈ ویول کو خط لکھا اور کہا کہ میں نے شملہ میں سیاسی قیدیوں کا سوال اس وجہ سے نہیں اٹھایا تھا کہ وہ وقت اس کے لیے مناسب نہیں تھا ۔ اب صورت حال تبدیل ہو چکی تھی ۔ چونکہ جنگ ختم ہو گئی اور عام انتخابات کا اعلان کر دیا گیا ، اس لیے اب عام معافی ہونی چاہیے ۔ ہندستانی عوام اور حکومت ، دونوں کے مفاد میں یہ اقدام ضروری ہے ۔

جہاں تک خود قیدیوں کا تعلق ہے، وہ جیل میں برسوں سے تھے اور مزید چند ماہ رُکے رہنے پر وہ تیار رہیں گے۔ نظربندی کا باقی رہنا انھیں نقصان نہیں پہنچائے گا، لیکن اس سے کسی مفاہمت کا امکان کم ہو جائے گا۔ حکومت اگر نئی سیاسی فضا پیدا کرنا چاہتی ہے تو اسے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دینا چاہیے۔

لارڈ ویول نے جواب میں مجھے تار بھیجا۔ انھوں نے کہا کہ میری رایوں سے انھیں اتفاق ہے اور وہ سیاسی قیدیوں کی رہائی کے احکامات جاری کر رہے ہیں، مگر، بہرحال، انھوں نے عام معافی کے احکامات نہیں جاری کیے ——— نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریسی قیدیوں کی اکثریت تو باہر آ گئی، لیکن بائیں بازو کے کانگریسی کارکنوں کا ایک چھوٹا سا گروہ جیل میں رہ گیا۔ اس (گروہ) میں جے پرکاش ترائن، رام منوہر لوہیا اور کئی دوسرے شامل تھے۔

میں اپنی مداخلت کے اس نتیجے سے مطمئن نہیں تھا۔ مجھے یہ عقل کی بات نہیں لگتی تھی کہ بائیں بازو والوں کا ایک مختصر حلقہ جیل میں پڑا رہے جب کہ باقی سب رہا کیے جا رہے تھے۔ حکومت ہند کو ان کے خلاف شبہات تھے، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ ہندستان چھوڑو تحریک میں حصہ لینے والے دوسرے کانگریسی کارکنوں کی بہ نسبت اُن کا طرزِ عمل مختلف تھا۔ ستمبر میں بمبئی کے مقام پر اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی میٹنگ کے بعد میں نے لارڈ ویول کے نام ایک طویل اور مفصل خط لکھا۔ میں نے کہا کہ اگر یہ مٹھی بھر قیدی آزاد نہیں کیے گئے تو ملک پر اس کا اثر بہت برا پڑے گا۔ اگر لارڈ ویول ملک میں ایک مناسب ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں تو انھیں عام معافی پر رضامند ہو جانا چاہیے اور انھیں رہا کر دینا چاہیے۔ بالآخر لارڈ ویول راضی ہو گئے اور سبھوں کو رہا کر دیا گیا۔

اے۔ آئی۔ سی۔ سی نے فیصلہ کیا تھا کہ ورکنگ کمیٹی کو ایک انتخابی منشور تیار کرنا چاہیے اور اسے اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے سامنے، غور کرنے اور منظور کیے جانے کی غرض سے پیش کر دینا چاہیے۔ اس نے ورکنگ کمیٹی کو یہ اختیار بھی دیا کہ جنرل الیکشن کمیٹی کی طرف سے وہ ایک تمہیدی منشور جاری کر دے۔ عام انتخابات چونکہ سر پر تھے اس لیے وسیع تر منشور پر غور کرنے کے لیے، اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی کوئی میٹنگ طلب کرنا ممکن نہیں رہ گیا تھا چنانچہ

ورکنگ کمیٹی نے خود اپنی ذمے داری پر حسب ذیل منشور جاری کر دیا :

انتخابی منشور

ساٹھ برس سے قومی کانگریس ہندستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرتی رہی ہے۔ برسوں پر پھیلی اس مدت میں، اس کی تاریخ ہندستانی عوام کی تاریخ رہی ہے جو اپنی غلامی کی زنجیروں سے زور آزمائی کر رہے تھے اور ہمہ وقت اپنے آپ کو اس سے چھڑانے کے لیے کوشاں تھے۔ چھوٹی سی شروعات سے، رفتہ رفتہ، یہ اس وسیع ملک میں پہنچی اور پھیلتی گئی اور اس نے ہماری شہری آبادیوں کے ساتھ ساتھ دور دراز کے گاؤں تک آزادی کا سندیسہ پہنچایا۔ انہی عوام سے اس نے طاقت اور توانائی اخذ کی اور ایک طاقت ور تنظیم بنتی گئی جو آزادی اور خود مختاری کے لیے ہندستان کے جذبے کی جیتی جاگتی اور متحرک علامت ہے۔ نسل در نسل اس نے خود کو اسی پاکیزہ مقصد کے لیے وقف رکھا ہے اور اس کے نام پر اور اس کے پرچم کے سائے میں ہمارے بے شمار ہم وطن مردوں اور عورتوں نے اپنی جانیں قربان کر دی ہیں، اور جو عہد انھوں نے کیا تھا، اسے پورا کرنے کے لیے صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ خدمت اور قربانی کے ذریعہ اس نے ہمارے عوام کے دلوں میں جگہ بنائی ہے، اور ہماری قوم کو بے توقیر کرنے کی کسی بھی کوشش کے سامنے جھکنے سے انکار کر کے اس نے بیرونی تسلط کے خلاف مزاحمت کی ایک طاقت ور تحریک کی تعمیر کی ہے۔

کانگریس کی پوری زندگی عوام کی فلاح کے لیے تعمیری کوشش اور آزادی کی حصولیابی کے لیے غیر مختتم جدوجہد سے عبارت رہی ہے۔ اس جدوجہد میں اس نے بے شمار بحرانوں کا سامنا کیا ہے اور ایک عظیم سلطنت کی مسلح طاقت سے بار بار براہ راست ٹکر لی ہے۔ پر امن طریقوں کی اطاعت کرتے ہوئے، نہ صرف یہ کہ اس نے ٹکروں کو جھیلا ہے، بلکہ ان سے ایک نئی طاقت حاصل کی ہے۔ حالیہ

تین برسوں کی غیر معمولی عوامی اتھل پتھل، اور دبائے جانے کی بے رحمانہ اور ظالمانہ کوششوں کے بعد، کانگریس اب ہمیشہ سے زیادہ مضبوط تر اور ان عوام میں محبوب تر ہے جن کے ساتھ یہ ابتری اور تناؤ کی ہر گھڑی میں کندھے سے کندھا ملائے رہی ہے۔

کانگریس ہندستان کے ہر شہری کے لیے وہ مرد ہو یا عورت، مساوی حقوق اور مواقع کا مطالبہ کرتی رہی ہے۔ یہ تمام فرقوں اور مذہبی گروہوں کے اتحاد اور ان میں باہمی رواداری اور خیر سگالی کی نقیب رہی ہے۔ اس نے مجموعی طور پر تمام لوگوں کے لیے، اپنی مرضی اور اپنے جوہر کے مطابق آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے مکمل مواقع کی خاطر آواز اٹھائی ہے، اس نے ملک کے اندر رہتے ہوئے ہر علاقے اور ہر گروہ کی آزادی، اور ایک وسیع تر فریم ورک میں اپنی مخصوص زندگی اور ثقافت کو فروغ دینے کی حمایت کی ہے، اور اس مقصد کے لیے ایسے علاقائی رقبوں اور صوبوں کی حد بندی، جہاں تک ممکن ہو سکے، ایک لسانی اور ثقافتی بنیاد پر کی جانی چاہیے۔

کانگریس کی نظر میں ایک آزاد اور جمہوری ریاست کا نقشہ ہے جہاں آئین میں اس کے تمام شہریوں کو بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کی ضمانت دی گئی ہو۔ یہ آئین، اس کے خیال میں وفاقی نوعیت کا ہونا چاہیے جس میں اس کی اکائیوں اور قانون ساز شعبوں کو، جو آفاقی بالغ حق رائے دہندگی کے تحت منتخب کیے گئے ہوں، خاصی بڑی حد تک خود مختاری دی جانی چاہیے۔

ڈیڑھ سو اور اس سے زیادہ کے غیر ملکی تسلط نے ملک کی ترقی پر روک لگا دی ہے اور ایسے لاتعداد اہم مسئلوں کو جنم دیا ہے جو فوری حل کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اس عرصے میں ملک اور عوام کے شدید استحصال نے لوگوں کو بے بسی اور فاقہ کشی کی گہرائیوں میں سمیٹ دیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ملک کو سیاسی طور پر محکوم اور ذلیل کیا گیا ہے، اس نے معاشی، سماجی، ثقافتی اور روحانی انحطاط کے صدمے بھی

پہے ہیں۔ جنگ کے برسوں میں، اور آج بھی، غیر ذمے دارانہ اقتدار کے ہاتھوں استحصال اور ہندستانی مفادات اور خیالات کو پوری طرح نظرانداز کرنے کا سلسلہ، ایک نئی بلندی تک جا پہنچا ہے! انتظامیہ کی نااہلی کے سبب سے ہمارے عوام، ایک بھیانک قحط اور دُور دور تک پھیلی ہوئی بے چارگی سے دوچار ہوئے ہیں ——— ان تمام فوری مسئلوں کا حل سوائے آزادی اور خود مختاری کے کچھ بھی نہیں ہے ——— سیاسی آزادی کا ماحصل اقتصادی اور سماجی، دونوں ہونا چاہیے۔

ہندستان کے مسئلوں میں سب سے اہم اور فوری (مسئلہ) یہ ہے کہ غریبی کے عذاب کو کس طرح دور کیا جائے اور عوام کا معیار (زندگی) کیونکر اوپر اٹھایا جائے۔ کانگریس نے اپنی خصوصی توجہ اور اپنی تعمیری سرگرمیوں کا رُخ انہی عوام کی فلاح اور ترقی کی طرف موڑ دیا ہے۔ ہر تجویز اور ہر تبدیلی کو اس نے عوام کی فلاح اور ترقی کی ہی بنیاد پر پرکھا ہے اور یہ بات واضح کردی ہے کہ ہمارے ملک کے عوام کی فلاح کے راستے میں جو بھی رکاوٹ آئے گی اُسے دُور کرنا ہوگا۔ صنعت اور زراعت، سماجی خدمات اور عوامی بہبود کے کاموں کو بڑھاوا دینے، انھیں جدید شکل دینے اور تیزی سے پھیلانے کی ضرورت ہے تاکہ ملک کی دولت میں اضافہ ہو اور دوسروں پر انحصار کیے بغیر خود کو ترقی دینے کی استعداد پیدا ہو۔ مگر یہ سب کچھ، ہمارے عوام کو فائدہ پہنچانے اور ان کی معاشی، ثقافتی اور روحانی سطح کو اوپر اٹھانے، بے روزگاری کو دور کرنے اور فرد کے وقار میں اضافہ کرنے کے بنیادی مقصد اور اہم ترین فرض کے تحت کیا جانا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہوگا کہ تمام میدانوں میں سماجی ترقی کے منصوبوں میں تال میل پیدا کیا جائے، افراد اور جماعتوں کے ہاتھ میں دولت اور اقتدار کو جمع ہونے سے روکا جائے، ایسی مفاد پرستی کو پنپنے سے روکا جائے جو سماج کے حق میں مضر ہوتی ہے اور معدنی وسائل، آمدورفت کے ذرائع اور پیداوار اور

زمین کی تعلیم کے بنیادی طریقوں، صنعت اور قومی سرگرمی کے دوسرے شعبوں کو سماجی کنٹرول میں رکھا جائے تاکہ آزاد ہندستان امداد باہمی کے اصول پر مبنی ایک دولت متحدہ کی شکل میں فروغ پا سکے۔

بین الاقوامی معاملات میں، کانگریس آزاد قوموں کے ایک عالمی وفاق کے قیام کی حامی ہے۔ اس وقت تک، جب تک کہ اس وفاق کی تشکیل نہ ہو جائے، ہندستان کو تمام اقوام سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے چاہئیں، خاص طور پر مشرق، مغرب اور شمال میں اپنے پڑوسی ممالک سے ——— مشرق بعید میں، جنوب مشرقی ایشیا میں اور مغربی ایشیا میں ہزارہا برسوں سے ہندستان کے ثقافتی اور تجارتی رابطے رہے ہیں اور یہ ناگزیر ہے کہ حصول آزادی کے ساتھ ان رابطوں کی تجدید اور ترقی ہونی چاہیے۔ حفاظتی اسباب اور تجارت کے آئندہ میلانات کا مطالبہ بھی یہ ہوگا کہ ان علاقوں سے اور زیادہ قریبی رابطے استوار ہوں۔ ہندستان، جس نے خود اپنی آزادی کی جدوجہد عدم تشدد کے اصول پر چلائی ہے، ہمیشہ عالمی امن اور امداد باہمی کی حمایت پر زور دے گا۔ وہ دوسری تمام محکوم قوموں اور آبادیوں کی آزادی کے لیے بھی آواز اٹھائے گا کیونکہ اسی آزادی پر، اور ہر جگہ سے شہنشاہیت کو اکھاڑ پھینکنے پر، عالمی امن کا قیام ممکن ہو سکتا ہے۔

۸ اگست ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جو اسی وقت سے ہندستان کی کہانی میں شہرت رکھتی ہے۔ اس (قرارداد) کے مطالبات اور اس کے چیلنج کی حمایت، کانگریس آج بھی کرتی ہے۔ یہ اسی قرارداد کی بنیاد پر اور اسی کے نعرہ نبرد کے ساتھ ہوا ہے کہ آج مرکزی، اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے کانگریس انتخابات کا سامنا کر رہی ہے۔

مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی ایک ایسی تنظیم ہے جس کے پاس کوئی اختیار اور اقتدار نہیں، اور جو عملاً محض ایک مشاورتی تنظیم ہے، جس کے مشوروں کو ہمیشہ

مسترد اور نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ اب مکمل طور پر متروک ہو چکی ہے اور اس کا انحصار ایک بہت ہی محدود حلقۂ انتخاب پر ہے۔ اس کے انتخابی رجسٹر غلطیوں اور فروگزاشتوں سے بھرے پڑے ہیں اور انھیں درست کرنے یا ان میں مطلوبہ اضافے کرنے کا کوئی موقعہ مہیا نہیں کیا گیا ہے۔ ہمارے ہم وطنوں کی بڑی تعداد ابھی بھی جیل میں ہے اور بہت سے ایسے لوگ جنھیں رہا کر دیا گیا تھا، انتخاب میں شریک ہونے کے نااہل قرار دیے گئے ہیں۔ بہت سی جگہوں پر عوامی جلسے کرنے میں رکاوٹیں ڈالنے کا سلسلہ جاری ہے۔ تاہم، ان تمام معذوریوں اور مشکلات کے باوجود کانگریس نے انتخابات میں مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ یہ دکھا دیا جائے کہ انتخابات، چاہے جتنے محدود ہوں، انھیں آزادی کے مسئلے پر رائے دہندگان کے بے پناہ اتفاقِ باہمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اسی لیے، اس انتخاب میں چھوٹے موٹے مسئلوں یا افراد یا فرقہ دارانہ مطالبات کا کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا ——— صرف ایک چیز قابلِ لحاظ ہے، ہماری مادرِ وطن کی آزادی اور خود مختاری، جس سے ہمارے عوام تک دوسری تمام آزادیوں کی لہر پہنچے گی۔

چنانچہ کانگریس ملک بھر کے ووٹروں سے جو مرکزی اسمبلی کے لیے ووٹ دیں گے، یہ اپیل کرتی ہے کہ آئندہ انتخابات میں وہ ہر ممکن طریقے سے کانگریسی امیدواروں کی حمایت کریں، اور اس نازک موڑ پر کانگریس کا ساتھ دیں جو مستقبل کے امکانات سے اس درجہ معمور ہے ——— کتنی بار ہندستان کے عوام نے آزادی کا عہد کیا ہے! ابھی اس عہد کی تکمیل ہونا باقی ہے، اور وہ محبوب نصب العین جس کی خاطر یہ عہد کیا گیا تھا اور جو اکثر ہمیں اپنی طرف بلاتا ہے، آج بھی اس نے ہمیں آواز دی ہے۔ مگر وہ وقت آ رہا ہے جب ہم پوری طرح اس کی تکمیل کریں گے، صرف انتخاب کے واسطے سے نہیں بلکہ اس زندگی کے واسطے سے جو انتخاب کے بعد آئے گی۔ سرِ دست، یہ انتخاب ہمارے لیے ایک چھوٹا سا امتحان ہے، ایک تیاری ہے ان عظیم کاموں کی جو بعد کو کرنے ہیں ——— آئیے، ہم سب جو ہندستان کی آزادی اور خود مختاری کے لیے فکر مند اور اس کے طلب گار ہیں، اپنی پوری طاقت اور اعتماد

کے ساتھ اس امتحان کا مقابلہ کریں اور اپنے خوابوں کے آزاد ہندستان کی جانب ایک ساتھ مل کر آگے بڑھیں۔

جیسی کہ عام طور پر توقع کی جاتی تھی، کانگریس کو سوائے بنگال، پنجاب اور سندھ کے، تمام صوبوں میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ ان تین صوبوں میں پوزیشن الجھی ہوئی تھی بنگال میں مسلم لیگ واحد سب سے بڑی پارٹی تھی اور اس نے تقریباً آدھی نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اور لیگ کی تعداد تقریباً یکساں تھی اور لیگ برابر تھا۔ سندھ میں بھی مسلم لیگ نے بڑی تعداد میں نشستیں جیتیں لیکن اسے اکثریت نہیں مل سکی ——— ان تین صوبوں میں مسلم آبادی اکثریت میں تھی اور مسلم لیگ نے مذہبی عصبیت اور فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے کے لیے پروپیگنڈا اچھالا تھا۔ اس نے سیاسی مسئلوں کو اتنا دھندلا دیا کہ وہ مسلمان جو کانگریس یا کسی دوسرے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے بڑی مشکل سے لوگوں کو اپنی بات سننے پر آمادہ کر پاتے تھے شمال مغربی صوبۂ سرحد میں، جہاں مسلم اکثریت سب سے بڑی تھی، لیگ کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں اور کانگریس حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔

اس موقع پر مناسب ہوگا کہ ایک بار پھر ہندستان کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لے لیا جائے۔ جب دوسری عالمی جنگ چھڑی، تو کمیونسٹوں کو نقصان اٹھانا پڑا کیونکہ ہٹلر اور اسٹالن میں باہمی طور پر عدم جارحیت کا معاہدہ ہو گیا تھا ——— نازی سوویت سمجھوتے تک کمیونسٹ ہٹلر پر حملہ کرنے اور نازی فلسفۂ حیات کی مذمت کرنے میں سب سے آگے تھے۔ ہندستانی کمیونسٹ دل ہی دل میں اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اسٹالن سے زبردست بھول ہوئی تھی لیکن دنیا کے دوسرے حصوں کے کمیونسٹوں کی طرح، اُن میں یہ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس مصالحت کو، اس جنگ کی حدیں سمیٹنے کی ایک کوشش قرار دیا، جسے وہ ایک امپریلسٹ جنگ کہتے تھے۔ (اس معاملے میں) وہ تقریباً لاچار تھے اور ہٹلر کو کم تر بدی (LESSER EVIL) کہہ کر اپنی پوزیشن بچانے کی فکر میں تھے۔ اس واقعے کے پیش نظر، وہ انگریزوں کی کوئی مدد نہیں کر سکے، اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے، دونوں کیمپوں کے درمیان ہندستان کی غیر جانبداری کی پرزور حمایت کی۔ مگر

جب ہٹلر نے روس پر حملہ کر دیا تو کمیونسٹ پوری طرح قلابازی کھا گئے۔ انھوں نے جنگ کو عوام کی جنگ کا نام دے دیا اور انگریزوں کی حمایت میں مکمل طور پر مصروف ہو گئے ——— ہندستان میں وہ کھل کر جنگ کے پروپیگنڈے میں شامل ہوئے اور انھوں نے برطانوی جنگی کوشش میں مدد دینے کی خاطر سب کچھ کیا۔ ایم۔ این۔ رائے نے کھلم کھلا حکومت سے رقم قبول کی اور جنگ کی حمایت میں پروپیگنڈا جاری رکھا۔ کمیونسٹوں نے مختلف طریقوں سے حکومت سے بھی مدد وصول کی۔ کمیونسٹ پارٹی پر جو پابندی عاید تھی، ہٹا دی گئی اور پارٹی کے اراکین نے کئی واسطوں سے جنگی پروپیگنڈا جاری رکھنے میں مدد دی۔

اس کے برخلاف، کانگریس نے ہندستان چھوڑو تحریک شروع کر دی تھی۔ کانگریسیوں کو بڑی تعداد میں گرفتار کیا جا رہا تھا جب کہ کمیونسٹ، جو پہلے جیل میں تھے یا روپوش تھے، اب اپنی پارٹی کی حمایت میں علی الاعلان کام کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ جب شملہ کانفرنس کے بعد کانگریسی رہا کیے گئے تھے، اس وقت بھی کمیونسٹوں کا ذہن اپنے لائحۂ عمل کے بارے میں صاف نہیں تھا اور وہ کانگریس کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔

اس دوران میں ایک انتہائی نمایاں تبدیلی نے تمام پبلک ملازمتوں کا احاطہ کر لیا تھا۔ دفاعی افواج نے جنگ کے زمانے میں ایسے نوجوانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد کو بھرتی کیا تھا جن کا تعلق مختلف صوبوں اور مختلف سماجی طبقوں سے تھا۔ محض مخصوص، اور منتخب گروہوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کرنے کی سابقہ برطانوی روایت جنگی ضرورتوں کے دباؤ کی وجہ سے ترک کر دی گئی تھی۔ وہ نوجوان جو مسلح افواج میں شامل ہو گئے تھے، انگریزوں کے اس قول پر اعتبار کر بیٹھے کہ جنگ کے بعد ہندستان آزاد ہو جائے گا ——— اس یقین نے، مخاصمتوں کے دور میں، ان نوجوانوں کو بڑی جانفشانی کے ساتھ لڑنے پر آمادہ کیا تھا ——— اب کہ مخاصمتیں ٹھنڈی پڑ چکی تھیں تو وہ اس امید میں تھے کہ ہندستان آزاد ہو جائے گا۔

مسلح افواج کی تینوں شاخیں ——— بحری، بری اور فضائی ——— وطن پرستی کے ایک جذبے سے سرشار تھیں۔ ان میں واقعتاً اتنا جوش بھر گیا تھا کہ جب

کبھی ان کی نظر کسی کانگریسی لیڈر پر پڑتی تھی تو وہ اپنے احساسات کو چھپا نہیں پاتے تھے۔
اس دور میں جہاں کہیں میرا جانا ہوا، دفاعی افواج کے نوجوان میرے استقبال کے لیے آئے اور اپنے یورپین افسروں کے ردِ عمل کی پروا کیے بغیر انھوں نے اپنی ہمدردی اور ستائش کا اظہار کیا ——— میں جب کراچی گیا تو بحریہ کے افسروں کا ایک گروپ مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ انھوں نے کانگریس کی پالیسی کی تعریف کی اور مجھے یقین دلایا کہ اگر کانگریس ضروری احکامات دے گی تو وہ میرے پاس آجائیں گے۔ اگر کانگریس اور حکومت کے درمیان کوئی تنازعہ ہوا تو وہ کانگریس کا ساتھ دیں گے، حکومت کا نہیں۔ بمبئی میں بھی بحریہ کے سینکڑوں افسروں نے ایسے ہی احساسات کا اظہار کیا۔
یہ جذبات صرف افسروں میں ہی نہیں، عام فوجیوں میں بھی بہت پھیل گئے تھے۔
وہ بائی وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں، ہوائی جہاز سے میں لاہور گیا۔ ایک گورکھا رجمنٹ جو لاہور میں رکھی گئی تھی، اس کے کوارٹرز ہوائی اڈے کے قریب ہی تھے۔ جب سپاہیوں نے سنا کہ میں اترا ہوں، تو وہ سینکڑوں کی تعداد میں قطاریں باندھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ وہ میرا درشن چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ پولیس والوں نے بھی ایسے ہی احساسات ظاہر کیے۔ ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ میں، پولیس ہمیشہ سے حکومت کی شدید ترین حمایتی رہی ہے۔ دراصل، ان لوگوں (پولیس والوں) کو سیاسی کارکنوں سے بہت کم ہمدردی ہوتی تھی اور اکثر وہ ان کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ اب اُن کے جذبات میں بھی یکسر تغیر آ گیا تھا اور کانگریس سے وفاداری کے معاملے میں، وہ اب کسی دوسرے گروہ سے پیچھے نہیں تھے۔
ایک بار جب میں کلکتے میں لال بازار سے گزر رہا تھا، میری کار ٹریفک کی بھیڑ میں پھنس گئی۔ پولیس کے کچھ کانسٹبلوں نے مجھے پہچان لیا اور اپنی بیرکوں میں، جو قریب ہی تھیں، خبر کر دی۔ چند منٹوں کے اندر کانسٹبلوں اور ہیڈ کانسٹبلوں کے ایک بڑے ہجوم نے میری کار کو گھیر لیا۔ انھوں نے مجھے سلام کیا، کچھ نے میرے پاؤں چھوئے۔ اُن سب نے کانگریس کے لیے اپنے احترام کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ ہمارے احکامات کے مطابق عمل کریں گے ———
ایک اور واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے، بنگال کے گورنر نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

جب میں گورنمنٹ ہاؤس گیا تو ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبلوں نے میری کار گھیر لی اور جیسے ہی میں باہر نکلا، اُن میں سے ہر شخص فرداً فرداً آگے بڑھا اور مجھے سلام پیش کیا۔ ان سب نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرے احکامات کے مطابق عمل کریں گے ——— چونکہ میں گورنر کی دعوت پر گورنمنٹ ہاؤس گیا تھا، میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ وہاں کوئی نعرے لگائے جائیں۔ مگر کانسٹیبل بھلا کب خاموش رہنے والے تھے، چنانچہ انھوں نے میرے اعزاز میں نعرے لگا دیے ——— یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ ان کی ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ تھیں اور اب وہ کھل کر اپنا اظہار کرنے سے ڈرتے نہیں تھے۔ اگر حکومت انھیں کانگریس سے ہمدردی کی سزا دینا چاہتی تھی، تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھے۔

یہ واقعات ظاہر ہے کہ حکام تک پہنچتے تھے۔ حکومت مفصّل رپورٹیں وصول کرتی تھی، اور پھر انھیں سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندستان کی طرف بڑھا دیتی تھی۔ انگریزوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہندستانی تاریخ میں پہلی مرتبہ، پوری قوم میں آزادی کی طلب کا شعلہ بھڑک اٹھا ہے۔ سیاسی آزادی کا حصول اب صرف کانگریس کا ہی نصب العین نہیں رہ گیا ہے، بلکہ عوام کے تمام طبقات کا نصب العین ہے۔ دفاعی افواج کے سپاہی اور افسر علانیہ یہ کہتے تھے کہ انھوں نے جنگ میں اپنا خون محض اس یقین دہانی پر بہایا تھا کہ جنگ کے خاتمے پر ہندستان آزاد ہو جائے گا ——— اُن کا مطالبہ تھا کہ اب اس وعدے کو پورا کیا جائے۔

عام انتخابات کے خاتمے کے بعد، ہر صوبے میں نئی حکومت کے بنانے کا سوال اٹھا۔ میرے لیے ضروری ہو گیا کہ ہر صوبائی راجدھانی کا دَورہ کروں اور وزارتوں کی تشکیل کی نگرانی کروں۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا مگر ہوائی سفر کی وجہ سے مجھے اس مسئلے کو حل کرنے میں مدد ملی۔ جنگ کے دوران تمام ہوائی آمد و رفت حکومت کے کنٹرول میں آ گئی تھی۔ نشستوں کا الاٹمنٹ بھی حکومت کے کنٹرول میں تھا۔ لارڈ ویول نے احکامات جاری کر دیے کہ مجھے ہر سہولت دی جائے اور اسی کی وجہ سے یہ ممکن ہو سکا کہ میں تمام صوبائی راجدھانیوں کا دورہ کر سکوں۔

جب میں حکومت کی تشکیل کے لیے بہار آیا تو میں نے مختلف گروپوں کی باہمی چپقلشوں کے باعث وہاں کی صورتِ حال کو پیچیدہ دیکھا۔ اس میں اہم کانگریسیوں کے نجی مسئلوں کا اضافہ بھی ہو گیا۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد ڈاکٹر سیّد محمود نے میرے خلاف چند ناروا الزامات عاید کیے تھے —— ایک بیان میں، جسے انھوں نے بنارس میں جاری کیا تھا۔ انھوں نے مجھے کانفرنس کی ناکامی کا ذمے دار ٹھہرایا تھا۔ ان کے قول کے مطابق کانگریس ورکنگ کمیٹی مسلم لیگ کے مطالبات کو قبول کرنے پر راضی ہو گئی تھی اور یہ محض میری ضد کی وجہ سے ہوا کہ کانگریس نے اپنی پوزیشن بدل لی اور لیگ کے مطالبات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ (الزام) خاصا غلط تھا —— مجھے افسوس ہوا کہ ڈاکٹر محمود نے اس قسم کا بیان جاری کیا۔ انھیں معلوم تھا کہ ایسا انتہائی مشکلوں کے ساتھ ہی ہوا تھا کہ ۱۹۴۲ء کے بعد میں انھیں ورکنگ کمیٹی میں شامل کر سکا تھا۔ انھوں نے جب معافی مانگ لی اور قلعۂ احمد نگر جیل سے اپنی رہائی حاصل کر لی تو میرے ساتھیوں میں سے کچھ نے مجھ کو طعنے بھی دیے کہ میں ہی انھیں ورکنگ کمیٹی میں لے آیا تھا —— اب ڈاکٹر محمود نے یہ سوچا کہ چونکہ انھوں نے میرے خلاف یہ نامناسب الزامات لگائے تھے اس لیے میں انھیں بہار کی کابینہ میں شامل نہیں ہونے دوں گا۔ ان کو پتہ نہیں تھا کہ اس قسم کے معاملات میں، میں نے کبھی بھی اپنے نجی احساسات کو اپنے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ مجھے وائسرائے سے ان کی معافی طلبی اور اپنے خلاف ان کے بیان پر افسوس ہوا تھا، مگر ملک کے مروجہ ماحول میں، میں نے ان کی کمزوریوں کو قابلِ تسلیم سمجھنے کی گنجائش بھی نکال لی تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں طے کر لیا تھا کہ ہر حال میں مجھے حکومت بناتے وقت صرف لیاقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور مجھے اس کی اجازت نہیں دینی چاہیے کہ ان کے الزامات مجھ پر دباؤ ڈال سکیں۔ جب فہرست بنالی گئی اور میں نے کانگریس اسمبلی پارٹی کے ارکین کے سامنے نام پڑھے تو سیّد محمود اس فہرست میں اپنا نام پاکر صاف طور پر حیرت زدہ اور مسرور نظر آئے ★

میں نے اپنے ذہن کو آمادہ کر لیا تھا کہ وزارتوں کی تشکیل کے معاملے میں ہمیں مسلم لیگ کی طرف ایک فیاضانہ رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ جہاں کہیں ارکین کو اسمبلی کے لیے لیگ کے ٹکٹ پر

کامیابی ملی تھی، میں نے ان کو بلوایا اور صوبائی وزارتوں کی تشکیل میں تعاون کی دعوت دی۔ میں نے ایسا دونوں میں کیا، یعنی کہ ان صوبوں میں جہاں کانگریس کو مکمل اکثریت حاصل تھی اور اسی کے ساتھ ساتھ ان صوبوں میں بھی جہاں یہ واحد سب سے بڑی پارٹی تھی۔ میں جانتا تھا کہ بہت سے صوبوں میں، خاص کر بہار، آسام اور پنجاب میں مسلم لیگ کے اراکین خوشی سے شامل ہوتے، لیکن مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے اراکین کو میری دعوت قبول کرنے کی اجازت نہیں دی۔

پنجاب میں صورت حال بالخصوص مشکل تھی۔ یہ ایک مسلم اکثریتی صوبہ تھا، مگر کسی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہیں تھی۔ مسلم اراکین یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ میں بٹے ہوئے تھے۔ میں نے دونوں گروپوں سے بات چیت کی۔ لیگ نے، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، مسٹر جناح کی ہدایت کے تحت میرا دعوت نامہ قبول نہیں کیا۔ مگر کسی نہ کسی طرح میں مذاکرات کو اس

انداز سے چلانے میں کامیاب ہو گیا
بنانے کا موقع فراہم کر دیا
انھوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے کوئی
کے سربراہ خضر حیات خاں کو حکومت کی تش
یہ پہلا موقع تھا جب پنجاب
ایسی صورت حال تھی جیسے اس وقت
سیاسی حلقوں نے اعلان کیا کہ میں
تشکیل کا راستہ دکھایا، زبردست
آزاد اراکین نے غیر مشروط طور پر مجھے
کا ترجمان ہے، مجھے اس بات پر سراہا
مشکل مسئلے کو حل کیا تھا، اور اس نے
نمٹایا ہے وہ کسی بھی کانگریسی لیڈر
ترین مثالوں میں سے ایک تھا۔

لور زر شخصی طور پر مسلم لیگ کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے، مگر
اور صورت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ یونینسٹ پارٹی
تشکیل کے لیے مدعو کیا جائے۔
ں کانگریس حکومت میں شریک ہوئی تھی۔ یہ ایک
ک تقریباً ناممکن تصور کیا جاتا تھا۔ ملک بھر میں
نے ان مذاکرات میں، جنھوں نے پنجاب وزارت کی
لاحیت اور تدبر کا ثبوت دیا ہے۔ پورے ملک میں
مبارک باد دی۔ نیشنل ہیرالڈ نے، جو یو۔ پی کانگریس
رہ میں نے کس سلیقے کے ساتھ پنجاب کے پیچیدہ اور
ے یہاں تک کہا کہ میں نے جس طرح صورت حال کو
کی طرف سے مذاکرات میں تدبر اور ہوشیاری کی واضح

ئیں ملک میں اس پذیرائی پر خوش تھا لیکن ایک بات ایسی بھی تھی جس نے مجھے افسردہ کیا۔ کانگریس میں اپنی سرگرمیوں کی شروعات سے ہی، جواہرلال اور مَیں آپس میں بہترین دوست تھے۔ ہم ہمیشہ ہم خیال رہے تھے اور ایک دوسرے کو سہارا دیتے تھے۔ ہم میں کسی رقابت یا حسد کا سوال کبھی نہیں اٹھا تھا اور مَیں سوچتا تھا کہ آئندہ بھی نہیں اٹھے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس خاندان سے میری دوستی پنڈت موتی لال نہرو کے زمانے سے تھی۔ ابتدا میں جواہرلال کو ایک بھائی کے بیٹے کی طرح دیکھتا تھا اور وہ بھی مجھے اپنے والد کا دوست سمجھتے تھے۔

جواہرلال طبیعتاً گرم جوش اور فیاض ہیں اور ان کے دماغ میں ذاتی حسد نے کبھی گھر نہیں کیا۔ بہرحال، ان کے بعض اعزّا اور احباب مجھ سے اُن کے قریبی تعلقات پسند نہیں کرتے تھے اور ہمارے درمیان رقابتیں اور مشکلات پیدا کرنا چاہتے تھے ——— * لیکن

ہی کانگریس تنظیم میں، میں سب سے نمایاں پوزیشن حاصل کر لوں گا۔

مجھے پتہ نہیں کہ جواہر لال کے ذہن پر اس تلقین کا اثر کس حد تک پڑا، مگر بمبئی میں
... انھوں نے

کا اظہار کیا۔ تو ورکنگ کمیٹی کے دوسرے تمام اراکین نے بھی میری حمایت کی اور جواہر لال کو بھی رضامند ہونا پڑا۔

اگلا سوال جو ورکنگ کمیٹی کے سامنے آیا کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات کا تھا۔ ابھی تک، جب کبھی حکومت سے کوئی بات چیت ہوئی تھی، تنظیم کی نمائندگی صدر کانگریس نے کی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں جب سٹیفرڈ کرپس آئے، جواہر لال نے خود ہی یہ تجویز کیا تھا کہ کانگریس کی طرف سے تنہا مجھے گفت و شنید کرنی چاہیے۔ شملہ کانفرنس میں بھی میں ہی واحد نمائندہ تھا اور یہاں تک کہ گاندھی جی بھی (گفتگو میں) شریک نہیں ہوئے تھے۔ مگر اس مرتبہ جواہر لال نے ایک مختلف رویہ اختیار کیا۔ انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ کیبنٹ مشن سے گفتگو ایک اکیلے نمائندے کو نہیں بلکہ ورکنگ کمیٹی کی ایک چھوٹی سی ذیلی کمیٹی کو کرنی چاہیے۔

ان کی تجویز نے مجھے حیران کیا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ جواہر لال ایسا کوئی سوال اٹھائیں گے ——— تاہم، مجھے خیال ہوا کہ یہاں سوال اعتماد کا آ پڑا ہے، اسی لیے میں نے ان کی مخالفت کی۔ میں نے یہ نشاندہی کی کہ ابھی تک کانگریس کا صدر ہی تنظیم کا واحد نمائندہ ہوا کرتا تھا اور اب کسی تبدیلی کی کوئی معقول وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر ورکنگ کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ طریق کار میں تبدیلی ضروری ہے، تو اسے یقیناً اس پر عمل درآمد کا پورا حق حاصل ہے، لیکن ایسے کسی فیصلے میں میں شریک نہیں ہوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس (اقدام) کو کانگریس کے صدر کی ذمے داریوں میں ایک تخفیف سے تعبیر کروں گا۔

یہاں ایک بار پھر گاندھی جی نے میری تائید کی۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ ان کے نزدیک تبدیلی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اگر کرپس اور ویویل کے ساتھ گفت و شنید میں صدر کانگریس واحد نمائندہ ہو سکتا تھا تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب یہ روایت بدلی کیوں جائے۔ اب اگر کیبنٹ مشن سے مذاکرات کے لیے کوئی کمیٹی مقرر کی گئی تو اس کا مطلب یہ نکالا جائے گا کہ صدر کانگریس میں اعتماد کی کمی پیدا ہو گئی تھی۔ تجربے نے بھی یہی دکھایا تھا کہ کانگریس کا نمائندہ اس کے صدر سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس منزل پر کمیٹی کا تقرر، اسی لیے مددگار نہ ہوگا بلکہ کانگریس کی عام صفوں اور عام پبلک کے ذہن میں اس سے الجھنیں پیدا

ہوں گی۔*

ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کی صلاح مان لی اور ایک بار پھر کانگریس کا واحد نمائندہ صدر کو مقرر کر دیا گیا۔ جواہر لال نے شاید یہ محسوس کیا کہ معاملہ بہت آگے بڑھ گیا تھا اور مجھ پر اس کا خراب تاثر قائم ہوا ہوگا۔ جیسا کہ میرا عام معمول تھا، میں بھولا بھائی ڈیسائی کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے جواہر لال میرے پاس آئے اور نہایت شفقت اور خلوص کے ساتھ مجھے یقین دلایا کہ ان کی تجویز سے ایک لمحے کے لیے بھی میری قیادت میں اعتماد کی کمی کی طرف کوئی اشارہ نہیں نکلتا تھا۔ اُن کا مقصد صرف میرے ہاتھوں کو مضبوط کرنا تھا کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر میرے کچھ رفقا بھی میرے ساتھ کر دیے جائیں تو میں بہتر طور پر مذاکرات کو آگے بڑھا سکوں گا۔ انھوں نے بے تکلفی کے ساتھ یہ اعتراف کیا کہ ان کا اندازہ غلط تھا، اور انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم اس پورے واقعے کو بھلا دیں۔ میں اُن کی اس صاف بات چیت سے خوش ہوا۔ میں اور وہ آپس میں بہترین دوست رہے ہیں اور اس بات نے مجھے ٹھیس پہنچائی تھی کہ ہمارے درمیان کوئی اختلاف موجود ہو۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہندستانی بحریہ کے بعض افسر مجھے کراچی میں ملے تھے —— دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ، انھوں نے نسلی امتیاز کے سلسلے میں بھی شکایت کی تھی اور کہا تھا کہ اس امتیاز کے خلاف ان کے احتجاج اور درخواستوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ان کی بے اطمینانی بڑھتی گئی اور ایک روز دہلی میں، میں نے اخبارات میں اچانک یہ پڑھا کہ وہ براہ راست کارروائی پر اتر آئے ہیں۔ انھوں نے حکومت کو یہ اطلاع دے دی تھی کہ اگر ایک خاص تاریخ تک ان کے مطالبات تسلیم نہیں کیے گئے تو وہ ایک ساتھ استعفیٰ دے دیں گے۔ یہ تاریخ اب گزر چکی تھی اور انھوں نے اپنے سابقہ فیصلے کی روشنی میں بمبئی کے مقام پر ایک عام جلسہ کیا تھا۔ اس خبر نے ملک میں بجلی کی رَو دوڑا دی اور لوگوں کی ایک بہت بڑی اکثریت فوراً ان کے ساتھ ہو گئی —— حکومت بھی بہت پریشان تھی۔ اس نے برطانوی دستے بلوا لیے اور ہندستانی بحریہ کے تمام جہاز انگریز افسروں اور کارکنوں کے چارج میں دے دیے۔

میرے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ کسی عوامی تحریک یا براہِ راست کارروائی کے لیے وقت ابھی مناسب نہیں ہے۔ ہمیں ابھی واقعات کے سلسلے پر نظر رکھنی چاہیے اور برطانوی حکومت سے مذاکرات جاری رکھنے چاہئیں۔ اسی لیے میں سمجھتا تھا کہ ہندستانی بحریہ کے افسروں کی طرف سے یہ اقدام غلط تھا۔ اگر وہ نسلی امتیاز کے شکار ہوئے تھے تو یہ کوئی ایسی برائی نہیں تھی جو صرف انہی سے مخصوص رہی ہو، اور یہ برائی تو بری فوج اور فضائیہ کے تمام حلقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس تفریق کے خلاف اُن کا احتجاج حق بجانب تھا، مگر براہِ راست کارروائی پر اتر آنا میرے نزدیک ناسمجھی کی بات تھی۔

مسٹر آصف علی نے بحریہ کے افسروں کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کی پرجوش حامی بن گئیں۔ میری تائید حاصل کرنے کے لیے وہ دہلی آئیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ افسروں نے دانشمندی سے کام نہیں لیا تھا اور ان کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ غیر مشروط طریقے سے اپنے کام پر واپس چلے جائیں ——— بمبئی کانگریس نے ٹیلی فون پر مجھ سے صلاح مانگی، اور میں نے جواباً انھیں تار بھیجا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اس وقت بمبئی میں تھے اور انھوں نے بھی مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ بحریہ کے افسروں نے جو قدم اٹھائے، وہ غلط تھے اور انھیں کام پر واپس چلا جانا چاہیے ——— سردار پٹیل نے پوچھا کہ اگر حکومت انھیں اپنے کام پر واپس آنے کا موقع نہ دے تو پھر وہ کیا کریں۔ میں نے جواب دیا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے، میرا اندازہ یہی ہے کہ حکومت انھیں واپس آنے دے گی۔ بالفرض حکومت کوئی دشواری پیدا کرتی ہے تو ہم وہ کچھ کریں گے جو مناسب ہو گا۔

وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں، اگلے روز ہی مجھے لاہور جانا تھا، مگر میں نے اپنا دورہ ملتوی کر دیا اور کمانڈر انچیف سے فوری طور پر ایک ملاقات کی درخواست کی۔ دوسری صبح کو دس بجے لارڈ آکن لک نے پارلیمنٹ ہاؤس میں مجھ سے ملاقات کی۔ میں نے ان کی توجہ کے لیے دو باتیں ان کے سامنے رکھیں:

۱۔ کانگریس نے بحریہ کے افسروں کے اقدام کو پسند نہیں کیا اور انھیں

غیر مشروط طور پر واپس اپنا کام شروع کرنے کو کہا ہے۔ تاہم، کانگریس کو یہ فکر ہے کہ کوئی منتقمانہ کارروائی نہ ہو۔ اگر حکومت نے کینہ پروری کا رویّہ اختیار کیا تو کانگریس ان افسروں کے مسئلے کو اپنا مسئلہ بنا لے گی۔

۲۔ بحریہ کے افسروں کو (حکومت سے) نسلی تفریق کی یا دوسری جو بھی شکایتیں ہیں ان کی چھان بین کی جائے اور انھیں دور کیا جائے۔

لارڈ اٹکن لک نے نہایت دوستانہ جذبے کے ساتھ بات چیت کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن کے لہجے میں میری توقع سے زیادہ گرم جوشی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اگر افسروں نے بلا کسی شرط کے اپنی ڈیوٹی پر واپس آنا منظور کر لیا تو ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ جہاں تک نسلی تفریق کا تعلق تھا، ان کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ اسے پوری طرح ختم کر دیا جائے ——— ان کے جوابات سے مجھے اطمینان ہوا اور میں نے فوراً ایک بیان جاری کر دیا جس میں افسروں سے درخواست کی گئی تھی کہ کام پر واپس آجائیں اور انھیں یہ یقین بھی دلایا گیا تھا کہ ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں ہوگی۔

موجودہ حالات کے سیاق میں بمبئی میں بحریہ کے افسروں کی بغاوت ایک خاص معنویت کی حامل تھی ——— ۱۸۵۷ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب دفاعی افواج کے ایک حلقے نے ایک سیاسی مسئلے کی بنیاد پر انگریزوں کے خلاف کھل کر بغاوت کی تھی۔ یہ بغاوت اپنی قسم کا واحد واقعہ نہیں تھا۔ کیونکہ پہلے بھی سبھاش چندر بوس کی قیادت میں، ہندستان کے جنگی قیدیوں کو لے کر انڈین نیشنل آرمی کی تشکیل کی جا چکی تھی۔ اس فوج نے ۱۹۴۴ء میں ہندستان پر حملہ کیا تھا اور ایک منزل پر تو امفال تقریباً قبضے میں آنے ہی والا تھا۔ جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد، انگریزوں نے پھر سے برما پر قبضہ کر لیا اور انڈین نیشنل آرمی (آئی۔ این۔ اے) کے بہت سے افسر قیدی بنا لیے گئے۔ انھیں اپنے اس فعل پر کہ وہ انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے تھے، کوئی پچھتاوا نہیں تھا اور ان میں سے بعض پر اب غداری کا مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ ان تمام واقعات نے انگریزوں کو باور کرا دیا کہ وہ مسلح افواج پر اب مزید بھروسہ نہیں کر سکتے

تاوقتیکہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ اطمینان بخش طریقے سے حل نہ ہو جائے۔

میں نے ہندوستانی فوج کے افسروں کی خبر پہلے پہل اس وقت سنی جب شملہ کانفرنس [illegible] پنجاب ہائی کورٹ کے ایک جج، مسٹر تارا سنگھ، ایک روز بہت

پیش نظر یہ مظاہرے مکمل طور پر بے محل ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ قیدیوں کا دفاع کریں گے اور انھیں رہا کروائیں گے ——— اس مقصد کے لیے تمام قانونی اور آئینی طریقوں سے کام لیا جارہا تھا، اور بے اجازت مظاہرے ہمارے مقصد میں معاون ہونے کے بجائے اسے نقصان پہنچا رہے تھے۔ ہندستان کا پورا سیاسی مستقبل زیر بحث آیا ——— برطانیہ میں ایک نئی حکومت بنائی گئی تھی جس کے ساتھ پارلیمنٹ میں لیبر پارٹی کو مکمل اکثریت حاصل تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ہندستان کے مسئلے کا ایک حل ڈھونڈ نکالے گی اور اسے ضروری اقدامات کے لیے ایک موقع دینا چاہیے ——— چنانچہ کانگریس نے طے کیا ہے کہ فی الحال کوئی تحریک نہیں ہونی چاہیے۔ اسی لیے، ملک کو انتظار کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ کانگریس کیا ہدایات جاری کرتی ہے۔

میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ ہندستان کے مختلف حصوں میں مظاہرے کیے جارہے تھے۔ ان میں سے کچھ مظاہروں کے دوران کلکتے میں تشدد بھڑک اٹھا ——— دہلی میں لوگوں نے سرکاری عمارتوں میں آگ لگانے کی کوشش کی اور سرکاری املاک تباہ کر دیں۔ جب میں دہلی واپس آیا تو لارڈ ویول نے ان واقعات کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ (واقعات) کانگریس کی اس یقین دہانی سے مطابقت نہیں رکھتے کہ ہندستان کا سیاسی مسئلہ ایک پرامن ماحول میں حل کیا جائے گا ——— میں یہ اعتراف کرنے کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا کہ شکایت حق بجانب تھی۔ میں نے دہلی کے تمام کانگریسی کارکنوں کو بلوایا اور انھیں بتایا کہ ایک گمبھیر بحران کانگریس کے سامنے ہے۔ تمام قومی تحریکوں میں ایک منزل آتی ہے، جب لیڈروں کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ انھیں عوام کی قیادت کرنی چاہیے یا ان کے پیچھے پیچھے چلنا چاہیے ——— ایسا لگتا ہے کہ ہندستان میں ہم اس منزل تک پہنچ گئے تھے۔ اگر کانگریس یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ ہندستان کا مسئلہ صرف پرامن ذرائع سے حل کیا جاسکتا ہے، تو کانگریسیوں کو عوام تک یہ پیغام لے جانے اور خود بھی اس کے مطابق عمل کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں نے ان سے کہا کہ کم از کم میں اس کے لیے آمادہ نہیں تھا کہ سہل ترین مزاحمت کا راستہ اپناؤں۔ دہلی میں جو

کچھ ہوا تھا، میری رائے میں غلط تھا۔ میں نے کہا کہ میں رائے عامہ کو ایک سمت دینے اور راہ پر لگانے کی کوشش کروں گا اور محض ہجوم کی خواہشات کے سامنے سر نہ جھکاؤں گا۔ اگر لوگ میرے رویے کو پسند نہیں کرتے، تو انھیں اپنی رہنمائی کے لیے کسی اور کو تلاش کرنا ہوگا۔

(11)

برٹش کیبنٹ مشن

فروری ۱۹۴۶ء میں، جیسے ہی مَیں نے ہندستان کی سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لیا مجھ پر حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ ملک ایک مکمل تغیّر کے عمل سے گزرا ہے۔ ایک بالکل ہی نئے ہندستان کا جنم ہو چکا تھا —— عوام، خواہ سرکاری ملازم ہوں یا غیر سرکاری، اُن سب میں آزادی کی ایک نئی امنگ بھری ہوئی تھی۔ انگریزوں کا رویّہ بھی بدل چکا تھا —— جیسی کہ مجھے شروع ہی سے توقع تھی، لیبر کابینہ صحیح جذبے کے ساتھ ہندستان کی صورت حال کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اقتدار میں آنے کے فوراً بعد ہی اس نے ایک پارلیمانی وفد ہندستان بھیجا جس نے ۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء کی سردیوں میں ملک کا دورہ کیا۔ ان سے اپنی بات چیت کے بعد مجھے یہ اطمینان ہوا کہ انھوں نے ملک میں مزاج کی تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔ یہ بات اچھی طرح اُن کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ ہندستان کی آزادی کو اب بہت دنوں تک ٹالا نہیں جا سکتا، اور حکومت کو اُن کی رپورٹ نے، یقینی طور پر لیبر کیبنیٹ کے اس ارادے کو تقویت پہنچائی ہوگی کہ جلد ہی ایک دوستانہ سمجھوتا ہو جانا چاہیے۔

۱۹؍ فروری ۱۹۴۶ء کی رات کو ساڑھے نو بجے مَیں ریڈیو سُن رہا تھا جب مجھے نئے برطانوی فیصلے کی خبر ملی —— لارڈ پیتھک لارنس نے پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا تھا کہ

برطانوی حکومت، ہندستانی آزادی کے سوال پر ہندستان کے نمائندوں سے گفتگو کے لیے، ایک کیبنٹ مشن ہندستان بھیجے گی۔ یہ اعلان اسی تاریخ کو اس پروگرام میں بھی کیا گیا جس کا خاکہ وائسرائے کی تقریر میں شامل تھا۔ اس مشن کو لارڈ پیتھک لارنس سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندستان، سر سٹیفرڈ کرپس پریسیڈنٹ بورڈ آف ٹریڈ اور مسٹر اے۔ وی۔ الیگزینڈر فرسٹ لارڈ آف دی ایڈمیرلیٹی پر مشتمل ہونا تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک نمائندہ آپہنچا اور مجھ سے میرے ردّ عمل کی بابت سوال کیا۔

مَیں نے اس سے کہا کہ مجھے خوشی ہوئی کہ لیبر حکومت نے ایک فیصلہ کن قدم اُٹھایا ہے۔ اس بات سے بھی مَیں خوش تھا کہ جو مشن آرہا تھا اس میں سر سٹیفرڈ کرپس بھی تھے جن سے پہلے بھی ہمارے مذاکرات ہو چکے ہیں اور جو سچ مچ ایک پُرانے دوست ہیں۔

مَیں نے یہ بھی کہا کہ ایک بات میری نظر میں بالکل صاف ہے۔ نئی برطانوی حکومت ہندستانی مسئلے سے جان نہیں بچا رہی ہے بلکہ جرأت مندانہ طور پر اس کا سامنا کر رہی ہے۔ یہ ایک بہت اہم تبدیلی تھی۔

۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو مسٹر اٹیلی نے ہندستان کی صورت حال پر ہاؤس آف کامنز میں ایک بیان دیا ——— ہند برطانوی تعلقات کی تاریخ میں اس بیان کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے بے باکانہ یہ اعتراف کیا کہ صورت حال یکسر بدل چکی تھی اور ایک نئے رویے کا تقاضہ کر رہی تھی۔ ان کے اس اعلان نے کہ پُرانے طریقوں پر جمے رہنے کی ہر کوشش ہمیں کسی حل تک نہیں بلکہ ایک تعطّل تک لے جائے گی، ہندستان میں ایک زبردست تاثر قائم کیا۔

کچھ نکات جو مسٹر اٹیلی نے اپنی تقریر میں اُٹھائے تھے، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ غلطیاں دونوں طرف سے ہوئی ہیں اور کہا کہ ماضی کی باتوں کو دوہراتے رہنے کے بجائے، اب مستقبل کی سمت دیکھنا چاہیے ——— انھوں نے یہ وضاحت کی کہ ماضی کے نسخوں کو موجودہ صورت حال پر منطبق کرنا اچھا نہیں ہوتا کیونکہ ۱۹۴۶ء کا مزاج ۱۹۲۰ء کا ۱۹۳۰ء کا یا ۱۹۴۲ء تک کا مزاج نہیں ہے۔ انھوں نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ وہ ہندستانیوں کے مابین اختلافات پر زور نہیں دینا چاہتے کیونکہ تمام

اختلافات اور دوریوں کے باوجود اپنی آزادی کی آرزو میں ہندستانی متحد ہیں۔ یہ تمام ہندستانی عوام کا اساسی مطالبہ تھا چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا مرہٹے، سیاست داں ہوں یا سرکاری ملازم۔ مسٹر ایٹلی نے بہت صاف گوئی کے ساتھ یہ تسلیم کیا کہ قومیت کا تصور مسلسل مستحکم ہوتا گیا اور ان فوجیوں میں بھی سرایت کر چکا ہے جنھوں نے جنگ میں شاندار خدمات انجام دی تھیں ——— مسٹر ایٹلی نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندستان میں سماجی اور اقتصادی مشکلات تھیں، تو یہ صرف ہندستانیوں کے ذریعے حل کی جا سکتی تھیں۔ انھوں نے اس اعلان کے ساتھ اپنی بات ختم کی کہ کیبنٹ مشن ایک مثبت کیفیت مزاج کے ساتھ، یہ عزم لے کر جا رہا ہے کہ اُسے کامیاب ہونا ہے۔

کیبنٹ مشن ۲۴ مارچ کو ہندستان پہنچا۔ جے، سی، گپتا نے سر سٹیفرڈ کرپس کی میزبانی کے فرائض انجام دیے تھے جب وہ اس سے پہلے ایک موقع پر ہندستان آئے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ کرپس سے ملاقات کے لیے دہلی جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں سر سٹیفرڈ کے نام ایک خط دیا جس میں دوبارہ ہندستان آنے پر ان کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔

میں ۲ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی پہنچا ——— مجھے ایسا لگا کہ اس منزل پر غور و فکر کے لیے اہم ترین موضوع، ہندستان اور برطانیہ کے مابین سیاسی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ ہندستان کی فرقہ وارانہ صورت حال ہے۔ شملہ کانفرنس نے مجھے باور کرا دیا تھا کہ سیاسی سوال حل ہونے کی منزل تک پہنچ گیا ہے۔ فرقہ وارانہ اختلافات ابھی تک حل طلب تھے۔ ایک بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ایک فرقے کی حیثیت سے مسلمان اپنے مستقبل کے بارے میں انتہائی فکر مند تھے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض صوبوں میں انھیں واضح اکثریت حاصل تھی۔ اسی لیے، صوبائی سطح پر ان علاقوں میں انھیں کوئی ڈر نہیں تھا۔ مگر مجموعی طور پر ہندستان میں ان کی حیثیت، بہر حال، ایک اقلیت کی تھی اور انھیں یہ خوف ستا رہا تھا کہ آزاد ہندستان میں ان کی پوزیشن اور ان کا مرتبہ محفوظ نہیں رہے گا۔

میں اس موضوع پر مسلسل اور مضطربانہ غور کرتا رہا۔ بالآخر میں اس نتیجے تک پہنچا کہ ہندستان کا آئین اپنی نوعیت کے اعتبار سے وفاقی ہونا چاہیے۔ مزید براں، اسے یوں

وضع کرنا چاہیے کہ صوبوں کو جتنے زیادہ امور میں یہ ممکن ہو سکے، مکمل خود مختاری کی ضمانت دی جائے۔ ہمیں صوبائی خود مختاری کے دعووں کو قومی وحدت کے ساتھ ہم آہنگ کرنا تھا۔ یہ اس طرح کیا جاسکتا تھا کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان اختیارات اور ذمے داریوں کی تقسیم کا ایک تشفی بخش فارمولا دریافت کر لیا جائے۔ کچھ اختیارات اور ذمے داریاں لازمی طور پر مرکز کے حوالے کی جاسکتی تھیں، کچھ صوبوں کے حوالے اور کچھ ایسی جو باہمی رضامندی کے بعد یا تو صوبائی حکومتوں کو دے دی جاتیں یا مرکزی حکومت کو ——— سب سے پہلے یہ کرنا تھا کہ ایک فارمولا بنایا جائے جس کے ذریعے کم سے کم امور کو لازمی طور پر مرکزی حکومت کی ذمے داری کا حصہ قرار دینا تھا۔ انھیں لازماً یونین گورنمنٹ کے تحت آنا تھا۔ اس کے علاوہ، ایسے امور کی بھی ایک فہرست تیار کرنی تھی جنھیں اگر صوبائی حکومت کا یہی منشا ہوتا، تو مرکز کے حوالے کر دیا جاتا۔ اسے مرکزی حکومت کی اختیاری فہرست کہا جاسکتا تھا اور کوئی بھی صوبہ، اگر یہ چاہتا تو ان تمام یا ان میں سے بعض امور سے متعلق اپنے اختیارات مرکزی حکومت کو تفویض کر سکتا تھا۔

میرے نزدیک یہ بات صاف تھی کہ دفاع، رسل و رسائل اور خارجی امور ایسے معاملات تھے جنھیں مناسب طریقے سے صرف ایک کل ہند سطح پر نمٹایا جاسکتا تھا۔ انھیں صوبائی سطح پر برتنے کی کوئی بھی کوشش ایک وفاقی حکومت کے مقصد کو ناکام بنا دے گی اور اس کی اساس کو بھی منتشر کر دے گی ——— اتنی ہی واضح سطح پر، بعض دوسرے امور صوبائی ذمے داری قرار دیے جائیں گے، مگر امور کی ایک تیسری فہرست بھی ہوگی جس کی بابت صوبائی لیجسلیچر یہ طے کرے گا کہ انھیں صوبائی امور کے طور پر باقی رکھنا ہے یا مرکز کو تفویض کر دینا ہے۔

میں اس مسئلے پر جتنا غور کرتا گیا، مجھ پر یہ واضح ہوتا گیا کہ ہندستانی مسئلہ کسی اور طریقے کو اختیار کر کے حل نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی ایسا آئین وضع کیا جاتا، جس میں یہ اصول شامل ہوتا، تو یہ بات یقینی ہو جاتی کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں، ان تین کے سوا باقی تمام امور خود صوبے کے زیرِ انتظام دیے جا سکتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کے ذہن سے ہندوؤں کے تسلط کے تمام اندیشے رفع ہو جائیں گے۔ ایک بار ان اندیشوں کو دور کر دیا گیا تو، عین ممکن تھا کہ

صوبے اسی میں اپنا فائدہ دیکھتے کہ بعض دوسرے امور بھی مرکزی حکومت کی تحویل میں دے دیے جائیں ——— مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ فرقہ وارانہ مصلحتوں سے قطع نظر ہندستان جیسے ملک کے لیے یہ بہترین سیاسی حل تھا۔ ہندستان ایک وسیع ملک ہے جس کی کثیر آبادی کم و بیش یکساں اکائیوں میں بٹی ہوئی ہے جو مختلف صوبوں میں رہتی ہیں۔ صوبوں کو آئینی معقولیت اور عملی انتظام کی عام مصلحتوں کے لحاظ سے بھی، خود مختاری کے وسیع ترین ممکنہ ضابطے کا یقین دلانا ضروری تھا۔

یہ تصویر بتدریج میرے ذہن میں بنتی گئی اور کیبنیٹ مشن کے ہندستان آنے کے وقت تک خاصی واضح ہو چکی تھی۔ تاہم، ابھی تک میں نے اپنے ساتھیوں سے اس کے بارے میں گفتگو نہیں کی تھی۔ میں ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا کیونکہ ورکنگ کمیٹی نے کیبنیٹ مشن سے گفت و شنید کے مکمل اختیارات مجھے سونپ دیے تھے۔ میں نے سوچا کہ جب مناسب وقت آجائے، اس وقت صاف اور غیر مبہم لفظوں میں مجھے اپنا موقف بیان کرنا چاہیے۔

کیبنیٹ مشن کے ممبروں سے پہلی بار میں ۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو ملا۔ مشن نے گفتگو کے لیے کچھ سوال مرتب کر لیے تھے۔ ان میں پہلا ہندستان میں فرقہ وارانہ مسئلے سے متعلق تھا۔ جب مشن نے مجھ سے پوچھا کہ فرقہ وارانہ صورتِ حال کو میں کیونکر سلجھاؤں گا تو میں نے اس حل کی جانب اشارہ کیا جو میں نے پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا۔ جیسے ہی میں نے یہ کہا کہ مرکز کے پاس (اس کے زیرِ اختیار) لازمی امور کی ایک چھوٹی سے چھوٹی فہرست، اور اسی کے ساتھ ساتھ اختیاری امور کی ایک فہرست ہونی چاہیے تو لارڈ پیتھک لارنس بولے، "آپ اصل میں فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک نیا حل تجویز کر رہے ہیں۔"

سر اسٹیفرڈ کرپس نے میری تجویز میں خاصی دلچسپی لی اور بڑی تفصیل کے ساتھ مجھ سے جرح کرتے رہے ——— آخر میں وہ بھی میرے نقطۂ نظر سے مطمئن دکھائی دیے۔

ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ۱۲ اپریل کو ہوئی جس میں میں نے کیبنیٹ مشن سے اپنی بات چیت کی تفصیلات پیش کیں۔ میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ فرقہ وارانہ مسئلے کے اس حل

کی وضاحت کی جو میں نے تجویز کیا تھا۔ یہ پہلا واقعہ تھا جب گاندھی جی اور میرے رفقا کو میری اسکیم پر گفت گو کا موقع ملا۔ شروع شروع میں ورکنگ کمیٹی اس حل کی طرف سے کسی قدر مشکوک رہی اور اراکین نے ہر طرح کے شبہات اور دقتوں کا سوال اٹھایا ——— میں نے ان کے اعتراضات کے جواب دیئے اور مشتبہ نکات کی وضاحت کی۔ بالآخر ورکنگ کمیٹی کو تجویز کے محکم ہونے کا یقین آگیا اور گاندھی جی نے اس حل سے اپنے مکمل اتفاق کا اظہار کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ گاندھی جی نے یہ کہتے ہوئے مجھے مبارک باد دی کہ میں نے ایک ایسے مسئلے کا حل دریافت کر لیا ہے جس نے ہر ایک کو اس وقت تک چکرا رکھا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میرا حل مسلم لیگیوں میں متعصب ترین شخص کے وسوسوں کو بھی دور کر دے گا اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ کہ حل فرقہ دارانہ زاویۂ نظر کا نہیں بلکہ قومیت کے ایک احساس کا ترجمان ہے۔ گاندھی جی مُصر تھے کہ ہندستان جیسے ایک ملک میں صرف ایک وفاقی آئین ہی چل سکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی، انھوں نے میرے (مجوزہ) حل کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ گرچہ اس میں کوئی انوکھا اصول پیش نہیں کیا گیا ہے، مگر ہندستان کے سیاق میں وفاقیت کے مضمرات کو یہ حل صفائی کے ساتھ سامنے لایا ہے۔

سردار پٹیل نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مرکزی حکومت (اپنے اختیار میں) صرف تین امور تک محدود رہے گی۔ انھوں نے کہا کہ بعض اور ایسے امور بھی ہیں، مثلاً سکہ اور مالیات جنھیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے مرکز کے دائرے میں ہونا چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ تجارت اور صنعت کو صرف ایک کل ہند سطح پر فروغ دیا جا سکتا ہے اور یہی بات کاروبار سے متعلق پالیسی پر بھی صادق آتی ہے۔

مجھے ان کے اعتراضات کا جواب نہیں دینا پڑا۔ گاندھی جی نے میرے نقطۂ نظر کو اپنا لیا اور سردار پٹیل کو جواب دینے لگے۔ انھوں نے کہا کہ یہ فرض کر لینے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ سکے یا محصولات کے جیسے مسئلوں میں کوئی صوبائی حکومت مرکز سے اختلاف کرے گی۔ یہ اُن کے اپنے مفاد میں ہوگا کہ ان معاملات میں ایک متفقہ پالیسی رکھی جائے۔ اسی لیے یہ اصرار ضروری نہیں کہ سکے اور مالیات (کے شعبوں) کو مرکزی امور کی لازمی فہرست

میں شامل کر لیا جائے۔

مسلم لیگ نے اپنی لاہور کی قرارداد میں پہلی مرتبہ ہندستان کی ممکنہ تقسیم کا ذکر کیا تھا۔ بعد میں یہی قرارداد پاکستان ریزولیوشن کے نام سے جانی گئی۔ میں نے جو حل تجویز کیا تھا اس سے مسلم لیگ کے اندیشوں کو رفع کرنا مقصود تھا۔ اب جب کہ میں اپنے ساتھیوں اور کیبنیٹ مشن کے ممبروں سے اس اسکیم پر گفت گو کر چکا تھا، میں نے محسوس کیا کہ اب ملک کے سامنے اسے پیش کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو میں نے ایک بیان جاری کیا جو مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مطالبات سے متعلق تھا۔ اب کہ ہندستان کی تقسیم ایک حقیقت ہے اور اسے دس برس گزر چکے ہیں، میں دوبارہ اس بیان پر نظر ڈالتا ہوں اور معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ بات جو میں نے کہی تھی آخر کار ہو کر رہی۔ چونکہ یہ بیان ہندستانی مسئلے کے حل کی بابت میرے سوچے سمجھے خیالات پر مشتمل ہے، میں سوچتا ہوں کہ اسے مکمل طور پر نقل کر دینا چاہیے۔ یہی وہ کچھ ہے جو میں نے اس وقت کہا تھا، اور اب بھی کہوں گا:

> میں نے ہر ممکنہ نقطۂ نظر سے پاکستان کی اس اسکیم پر غور کیا ہے جسے مسلم لیگ نے تشکیل دیا ہے۔ ایک ہندستانی کی حیثیت سے، میں نے مجموعی طور پر ہندستان کے مستقبل کے لیے اس کے مضمرات کا جائزہ لیا ہے (اور) بہ حیثیت ایک مسلمان کے، میں نے ہندستان کے مسلمانوں کے مستقبل پر اس کے امکانی اثرات کی جانچ پرکھ کی ہے۔
>
> اسکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد، میں اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ یہ مجموعی اعتبار سے ہندستان کے لیے ہی نہیں مسلمانوں کے لیے خاص طور پر مضرت رساں ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ جتنے مسئلے حل کرتی ہے، اس سے زیادہ مسئلے پیدا کرتی ہے۔
>
> مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ پاکستان کی اصطلاح ہی میری

طبیعت کے خلاف ہے۔ اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے ناپاک ہیں، جب کہ کچھ پاک ہیں۔ پاک اور ناپاک میں علاقوں کی یہ تقسیم غیر اسلامی ہے اور راسخ العقیدہ برہمنیت سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے جو انسانوں اور ملکوں کو مقدس اور نجس میں بانٹتی ہے ——— ایک ایسا بٹوارہ جو اسلام کی روح کے ہی منافی ہے۔ اسلام ایسی کسی تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ اور رسولؐ نے فرمایا تھا، "اللہ نے پوری دنیا کو میرے لیے مسجد بنایا ہے۔"

مزید یہ کہ ایسا لگتا ہے، پاکستان کی اسکیم ہزیمت زدگی کی ایک علامت ہے اور یہودیوں کے قومی مسکن کے مطالبے جیسے قیاس پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ اس کا اعتراف ہے کہ ہندستانی مسلمان مجموعی طور پر پورے ہندستان میں خود کو سنبھال نہیں سکتے اور ایک ایسے کونے میں خود کو سمیٹ لینے پر قانع ہو جائیں گے جسے ان کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہو۔

اس طرح کے قومی مسکن کے لیے یہودیوں کی آرزو مندی سے ہمدردی کی جا سکتی ہے کیونکہ وہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے ہیں اور کسی بھی علاقے میں ان کے انتظامیہ کی کوئی موثر آواز نہیں ہو سکتی۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کی صورت حال خاصی مختلف ہے۔ اپنی نو کروڑ سے زیادہ کی آبادی کے پیش نظر، کمیت اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے ہندستانی زندگی میں اتنے اہم عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں کہ انتظامیہ اور پالیسی سے متعلق تمام سوالات پر فیصلہ کن اثر ڈال سکتے ہیں۔ قدرت نے بھی ان کی مدد یوں کی ہے کہ بعض علاقوں میں انھیں بڑی تعداد میں یکجا کر دیا ہے۔

اس قسم کا کسی سیاق میں، پاکستان کا مطالبہ ساری طاقت

کھو بیٹھتا ہے۔ بطور ایک مسلمان کے، کم سے کم میں ایک لمحے کے لیے اس پر تیار نہیں ہوں کہ پورے ہندستان کو اپنا علاقہ سمجھنے اور اس کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کی (تعمیر اور) تشکیل میں حصّہ لینے کے حق سے دست بردار ہو جاؤں۔ میرے نزدیک یہ بزدلی کی یقینی علامت ہے کہ اپنے آبائی ورثے کو چھوڑ دوں اور اس کے محض ایک ٹکڑے پر قانع ہو جاؤں۔

جیسا کہ اچھی طرح جانا جاتا ہے، مسٹر جناح کی پاکستان اسکیم ان کے دو قومی نظریے پر مبنی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ہندستان بہت سی ایسی قومیتوں پر مشتمل ہے جن کی بنیاد مذہبی اختلافات ہیں۔ ان میں دو بڑی قومیتوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک دوسرے سے الگ قوم ہونے کی حیثیت سے، الگ الگ ریاستیں بھی ہونی چاہئیں۔ ڈاکٹر ایڈورڈ ٹامسن نے ایک مرتبہ مسٹر جناح سے جب یہ کہا کہ ہندستان کے ہزاروں قصبوں، دیہاتوں اور بستیوں میں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے ہیں تو مسٹر جناح نے جواب دیا کہ یہ بات کسی بھی طرح ان کی جداگانہ قومیت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ مسٹر جناح کے نظریے کے مطابق، ہر بستی، ہر گاؤں، ہر قصبے میں دو قومیتیں ایک دوسرے کی مقابل ہیں، اور اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ ان کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

میں اس مسئلے کے تمام دوسرے پہلوؤں سے صرفِ نظر کرنے اور اسے صرف مسلم مفادات کے نقطۂ نظر سے پرکھنے کے لیے تیار ہوں۔ میں اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ اگر یہ دکھایا جا سکتا ہو کہ پاکستان کی اسکیم کسی بھی طریقے سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچائے گی تو میں خود بھی اسے ماننے پر آمادہ ہو جاؤں گا اور دوسروں کو بھی آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر میں خود مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفادات کے نقطۂ نظر سے بھی اس اسکیم کا جائزہ لوں تو، اس نتیجے تک مجھے پہنچنا پڑتا ہے کہ

یہ کسی بھی طرح نہ تو مسلمانوں کو فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ ان کے جائز اندیشوں کو دور کر سکتی ہے۔

آئیے۔ ہم ٹھنڈے دل سے ان نتائج پر غور کریں جو پاکستان اسکیم کو بروئے کار لانے سے برآمد ہوں گے۔ ہندستان دو ریاستوں میں بٹ جائے گا۔ ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی، دوسرے میں ہندوؤں کی۔

ریاست ہندستان میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان اس کی پوری سر زمین پر چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کی شکل میں بکھرے رہیں گے۔ یوپی میں سترہ فی صدی، بہار میں بارہ فی صدی اور مدراس میں نو فی صدی رہ جانے پر وہ ہندو اکثریتی صوبوں میں آج سے بھی زیادہ کمزور پڑ جائیں گے ـــ ان علاقوں میں انھوں نے تقریباً ایک ہزار برس سے اپنا وطن آباد کر رکھا ہے اور یہاں مسلم ثقافت اور تہذیب کے معروف مراکز قائم کیے ہیں۔

ایک صبح اچانک وہ سو کر اٹھیں گے اور دیکھیں گے کہ وہ اجنبی اور غیر ملکی بن گئے ہیں۔ صنعتی، تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے پس ماندہ، وہ ایک خالص ہندو راج کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

دوسری طرف، ریاست پاکستان میں بھی ان کی پوزیشن غیر محفوظ اور کمزور ہوگی۔ پاکستان میں کہیں بھی، ان کی اکثریت ہندستانی ریاستوں میں ہندو اکثریت سے موازنے کے قابل نہیں ہوگی۔

ان کی اکثریت کا تناسب، دراصل اتنا کم ہوگا کہ ان علاقوں میں غیر مسلموں نے اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی لحاظ سے جو برتری حاصل کر لی ہے، وہ ان کی اکثریت کو پس پشت ڈال دے گی۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا اور پاکستان میں غالب آبادی مسلمانوں کی ہوا، جب بھی اس سے ہندستان کے مسلمانوں کا مسئلہ تو حل ہونے سے رہا۔

ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما دو ریاستیں، ایک دوسرے کی اقلیتوں کے مسئلے کا کوئی حل فراہم نہیں کرتیں، بلکہ باہمی طور پر، ایک دوسرے کی اقلیتوں کو یرغمال بنا کر، صرف عتاب اور انتقام کی فضا پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ پاکستان کی اسکیم مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل نہیں کرتی۔ جہاں وہ اقلیت میں ہیں، وہاں وہ ان کے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ نہ ہی پاکستانی شہری کے طور پر انھیں ہندوستان کے یا دنیا کے معاملات میں ایک ایسی حیثیت دلا سکتی ہے جس کا فائدہ وہ انڈین یونین جیسی کسی بڑی ریاست کے شہری رہ کر اٹھا سکتے ہیں۔

یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ اگر پاکستان خود مسلمانوں کے مفادات کے اتنے خلاف ہے، تو پھر مسلمانوں کا اتنا بڑا حلقہ اس کے فریب میں کیونکر بہہ گیا ہے؟ اس کا جواب ہندوؤں کے درمیان بعض فرقہ پرست انتہا پسندوں کے رویے میں مل جائے گا۔ جب مسلم لیگ نے پاکستان کا نام لینا شروع کیا، تو انھیں اس اسکیم میں اتحادِ اسلامی پر مبنی ایک ناپاک سازش نظر آگئی اور انھوں نے اس ڈر سے اس کی مخالفت شروع کر دی کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوستان سے آگے کی مسلمان ریاستوں کے ایک گٹھ بن جانے کا پیش خیمہ ہے۔

ان کی مخالفت نے لیگ کے حامیوں کو اکسانے کا رول انجام دیا۔ ایک سیدھی گرچہ غیر مستحکم منطق کے ساتھ انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ اگر ہندو پاکستان کے اتنے خلاف ہیں تو یقیناً اس میں مسلمانوں کا فائدہ ضرور ہوگا۔ جذباتی ہیجان کی ایک فضا پیدا کی گئی جس نے معقولیت آمیز تجزیے کو ناممکن بنا دیا اور خاص طور پر مسلمانوں میں جو نوجوان یا نسبتاً کچے ذہن کے لوگ تھے۔ انھیں یہ فضا بہا لے گئی۔ مجھے، بہرحال، اس واقعے میں شک نہیں کہ موجودہ ہیجان کے سرد ہو جانے پر، اور غیر جذباتی انداز میں اس مسئلے کی

بابت غور کرنے پر، وہ لوگ جو آج پاکستان کے حمایتی ہیں خود ہی، اسے مسلم مفادات کے لیے مضر ٹھہرا کر مسترد کر دیں گے۔

وہ فارمولا جسے میں کانگریس سے منظور کرانے میں کامیاب ہو گیا ہوں، پاکستان اسکیم میں جو بھی اچھائیاں ہیں انھیں برقرار رکھتا ہے، جب کہ خامیوں کو الگ کر دیا ہے۔ پاکستان کی بنیاد مسلم اکثریتی علاقوں میں مرکز کی مداخلت کا خوف ہے کیونکہ مرکز میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی۔ کانگریس اس خوف کا متبادل یوں کرتی ہے کہ صوبائی اکائیوں کو مکمل خود مختاری دے دی جائے اور باقیات سے متعلق تمام اختیارات بھی صوبوں کو تفویض کر دیے جائیں۔ اس نے مرکزی امور کی دو فہرستوں کا اہتمام بھی کیا ہے۔ ایک لازمی اور ایک اختیاری، تاکہ اگر کوئی صوبائی اکائی یہ چاہے تو گنتی کے چند امور کو چھوڑ کر، جو مرکز کے سپرد کر دیے جائیں گے، باقی تمام امور کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ چنانچہ کانگریس اسکیم، اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ مسلم اکثریتی صوبے جس طرح پسند کریں خود کو ترقی دینے کے لیے اندرونی طور پر آزاد ہوں، مگر اسی کے ساتھ ساتھ ایسے تمام معاملات میں جو مجموعی اعتبار سے ہندستان کو متاثر کرتے ہیں، مرکز پر اپنا اثر بھی ڈال سکیں۔

ہندستان کی صورت حال ایسی ہے کہ ایک ایسی حکومت جو مرکزیت پر مبنی اور وحدانی ہو، اس کا ناکام ہونا یقینی ہے۔ ہندستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کا مقسوم بھی یہی ناکامی ہے۔ اس سوال کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد، میں اس نتیجے تک پہنچا کہ اس کا واحد حل کانگریس فارمولے میں شامل خطوط پر ہی ممکن ہے جو صوبوں، اور پورے ہندستان، دونوں کو ترقی کی گنجائش عطا کرتا ہے۔ کانگریس فارمولا مسلم اکثریتی علاقوں کے اس خوف کو جس کی بنیاد پر پاکستان کی اسکیم بنائی گئی، دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے دوسری طرف، یہ پاکستان اسکیم کی اُن خامیوں سے دامن بچاتا ہے جو مسلمانوں کو ایک خالص ہندو حکومت کی تابع کسی اقلیت کے اسی حال تک پہنچائیں گی

جس میں وہ اس وقت ہیں۔

میں ان لوگوں میں ہوں جو فرقہ وارانہ تلخیوں اور اختلافات کے موجودہ باب کو ہندستانی زندگی کا ایک عبوری مرحلہ تصور کرتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جب ہندستان اپنے مقدر کی ذمے داریاں خود سنبھال لے گا تو یہ کیفیتیں ختم ہو جائیں گی۔ مجھے مسٹر گلیڈ اسٹون کا ایک مقولہ یاد آتا ہے کہ کسی شخص کے پانی سے ڈرنے کا سب سے اچھا علاج یہی ہے کہ اسے پانی میں ڈال دیا جائے۔ اسی طرح اس سے پہلے کہ ڈر اور وسوسے پوری طرح رفع کیے جا سکیں، یہ ضروری ہے کہ ہندستان ذمے داریاں سنبھالے اور اپنے معاملات کا خود انتظام کرے۔

ہندستان جب اپنے مقدر کا مالک ہو جائے گا، وہ فرقہ وارانہ شک و شبہے اور تصادم کے اس باب کو فراموش کر دے گا اور ایک جدید نقطۂ نظر کے ساتھ جدید زندگی کے مسائل کا سامنا کرے گا۔ اختلافات بے شک باقی رہیں گے، مگر وہ اقتصادی نوعیت کے ہوں گے، فرقہ وارانہ نہیں —— سیاسی پارٹیوں میں مخالفت جاری رہے گی، مگر اس کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ اقتصادی اور سیاسی معاملات پر ہوگی۔ فرقہ نہیں بلکہ طبقہ آئندہ جتھے بندیوں کی اساس ہوگا اور اس کے مطابق پالیسیاں تشکیل دی جائیں گی۔ اگر یہ دلیل دی جائے کہ یہ محض ایک عقیدہ ہے جو ضروری نہیں کہ واقعات کی روشنی میں حق بجانب ثابت ہو سکے، تو میں یہ کہوں گا کہ کسی بھی صورت میں مسلمانوں کی نو کروڑ کی آبادی ایک ایسے عنصر کی تعمیر کرتی ہے جسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا، اور چاہے جیسے حالات ہوں وہ اتنے مضبوط تو ہیں ہی کہ آپ اپنی تقدیر کا تحفظ کر سکیں۔

۱۹۴۰ء کی لاہور قرارداد کے بعد سے، جو پاکستان ریزولیوشن کے نام سے معروف ہے۔ لیگ علاحدگی پسندی کے راستے پر اور آگے بڑھ چکی تھی۔ تاہم اس سے یہ نہیں واضح

ہو سکتا تھا کہ واقعتاً اس کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کی زبان مبہم تھی اور اس کی ایک سے زیادہ تعبیر ہو سکتی تھی، مگر اس کا منشا صاف تھا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ مسلم اکثریتی صوبوں کو مکمل خود مختاری حاصل ہونی چاہیے۔ قرارداد کی حمایت میں سکندر حیات خاں نے اس کی یہی تعبیر پیش کی تھی، مگر اب، لیگ کے رہنما اپنے مطالبے کو بہت وسیع معنی پہنا دیے تھے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے لفظوں میں (غیر واضح طور پر) ملک کی تقسیم اور مسلم اکثریتی علاقوں کے لیے ایک آزاد ریاست کے قیام کی باتیں کرنے لگے تھے۔ کیبنیٹ مشن اس مطالبے کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے برعکس، مشن ایک ایسے حل کا حامی تھا جو کم و بیش میرے مجوزہ خطوط پر ہو۔

تقریباً اپریل کے اواخر تک مذاکرات جاری رہے۔ مشن کے ساتھ میٹنگیں ہوتی رہیں اور مشن کے اراکین آپس میں بھی گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران میں مشن نے کچھ دنوں کی مہلت حاصل کی اور کشمیر چلا گیا۔ گرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور دہلی شہر روز بہ روز زیادہ سے زیادہ گرم ہوتا جا رہا تھا۔ میں قدرے آرام کا جویا تھا اور پہلے پہل میں نے کشمیر جانے کا ارادہ کیا تھا ——— واقعہ یہ ہے کہ میں وہاں دوستوں کو مطلع بھی کر چکا تھا لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ مشن بھی کشمیر جا رہا ہے تو میں نے اپنا منصوبہ تبدیل کر دیا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کشمیر میں میرے قیام کا یہ مطلب نکالا جائے کہ میں مشن سے ملاقات کرنا اور اس کے فیصلے پر اثر انداز ہونا چاہتا تھا ——— اسی لیے، بجائے وہاں جانے کے میں مسوری چلا گیا۔

مشن ۲۴ر اپریل کو دہلی واپس آیا اور وائسرائے کے ساتھ مل کر آئینی مذاکرات کا از سرِ نو جائزہ لیا۔ کئی بار کی بحثوں کے بعد، سر اسٹیفرڈ کرپس مجھ سے ملنے آئے تاکہ جو مسئلے اٹھائے گئے تھے، ان پر ایک غیر رسمی بات چیت کی جائے۔ ۲۷ر اپریل کو مشن نے ایک بیان جاری کیا کہ مزید غیر رسمی تبادلۂ خیال، خاص پارٹیوں کے مابین مصالحت کے ذریعہ سمجھوتے کی ایک بنیاد دریافت کرنے میں کارآمد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وفد نے کانگریس اور مسلم لیگ کے صدور کو مدعو کیا کہ شملہ میں وفد سے ملاقات اور مذاکرات کو جاری رکھنے کے

لیے اپنے نمائندے نامزد کریں۔ ورکنگ کمیٹی نے کیبنیٹ مشن سے بات چیت کے لیے نمائندوں کی نامزدگی کے اختیارات میرے سپرد کیے۔ چنانچہ، اپنے ساتھیوں کے طور پر کانگریس کی نمائندگی کے لیے میں نے جواہرلال اور سردار پٹیل کو نامزد کیا ——— شملہ میں ہمارے قیام کا انتظام حکومت نے کیا۔ گاندھی جی باضابطہ طور پر، گفتگو کرنے والی جماعت کے رکن نہیں تھے، مگر مشن نے انھیں شملہ آنے کی دعوت دی، تاکہ مشوروں کے لیے وہ موجود رہیں۔ انھوں نے ان کی درخواست مان لی اور مینورولا میں قیام پذیر ہوئے۔ ہم ورکنگ کمیٹی کی غیر رسمی میٹنگیں وہیں کرتے تھے تاکہ گاندھی جی بھی ان میں شریک ہو سکیں۔ شملہ میں گفتگو ۵ر مئی کو شروع ہوئی اور ۱۲ر مئی تک چلتی رہی۔ رسمی کانفرنس سے قطع نظر، ہم میں بہت سی غیر رسمی بحثیں بھی ہوئیں۔ میں ریٹریٹ (RETREAT) میں ٹھہرا ہوا تھا اور کئی موقعوں پر مشن کے اراکین مجھ سے ملاقات کے لیے وہاں بھی آئے۔

تقریباً دو ہفتے بعد میں دہلی واپس آگیا۔ کیبنیٹ مشن کے اراکین نے آپس میں مزید بات چیت کی اور اپنی تجویزیں مرتب کیں۔ ان کا اعلان ۱۶ر مئی کو لارڈ اٹیلی کے ذریعہ ہاؤس آف کامنز میں ہوا۔ منصوبے پر مشتمل ایک وہائٹ پیپر (WHITE PAPER) بھی جاری کیا گیا اور اس میں یہ بیان کیا گیا کہ ہندستان کے لیے ایک نئے آئین کے جلد سے جلد قیام کو یقینی بنانے کے لیے برطانوی کیبنیٹ مشن برائے ہندستان اس (منصوبے) کو بہترین انتظام خیال کرتا ہے۔ میں نے ضمیموں میں (ضمیمہ ۵) کیبنیٹ مشن پلان شامل کر دیا ہے۔ اور ایسے قارئین جو دلچسپی رکھتے ہیں، اس کا موازنہ اس اسکیم سے کر سکتے ہیں، جو میں نے ۱۵ر اپریل کو اپنے بیان میں مرتب کی تھی۔

میں شملہ میں کیبنیٹ مشن پلان پر اپنی گفتگو کو جاری رکھنے کے حق میں تھا۔ میں نے لارڈ ویول سے کہا، یہ بہتر ہوگا کہ ہم اپنی گفتگو شملہ میں ہی مکمل کر لیں کیونکہ دہلی کا موسم ان اہم مسئلوں پر، جو زیر بحث تھے، ٹھنڈے اور محتاط ذہن کے ساتھ غور و خوض کے

لیے سازگار نہیں تھا۔ لارڈ ویول نے کہا کہ حکومت کا مرکز دہلی میں ہے اور اگر وہ زیادہ دنوں تک وہاں سے باہر رہے تو کام کا نقصان ہو سکتا ہے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ اس سے انھیں تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی کیونکہ وائسریگل لاج ائرکنڈیشنڈ ہے اور وہ کبھی (وہاں سے) باہر نہیں نکلتے۔ مگر کیبنٹ مشن کے اراکین اور ہمارے ساتھ، معاملہ بہرحال مختلف تھا۔ ہم سب اس بھٹی میں جو دہلی شہر بن گیا تھا، کام کرنے میں انتہائی دشواری محسوس کریں گے —— لارڈ ویول نے جواب دیا کہ بس چند دنوں کی تو بات ہے۔

آخر میں، ہوا یہ کہ ہم نے مئی کے باقی دن اور جون کا پورا مہینہ دہلی میں گزارا۔ اس سال موسم معمول سے زیادہ گرم تھا۔ کیبنٹ مشن کے ممبروں نے اسے محسوس کیا، اور سب سے زیادہ لارڈ پیتھک لارنس نے جو ایک روز گرمی کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ اور وائسرائے نے میرے لیے ایک ائرکنڈیشنڈ کمرے کا بندوبست کر دیا تھا اور اس سے یقیناً مدد ملی تھی، مگر موسم اتنا سخت تھا کہ ہر شخص چاہتا تھا کہ گفتگو کا سلسلہ جلد ہی ختم ہو جائے۔ بدقسمتی سے کانگریس اور لیگ کے مابین اختلافات آسانی سے طے نہیں کیے جا سکے اور بحثیں کسی حل کی طرف اشارے میں ناکام رہیں۔

ہم نے کیبنٹ مشن اور اس پلان کے ساتھ خاصی دماغ سوزی کی تھی، مگر ایک نئے سر درد کا اضافہ کشمیر کے واقعات کے سبب سے ہوا۔ شیخ عبداللہ کی قیادت میں نیشنل کانفرنس کشمیری عوام کے سیاسی حقوق کے لیے لڑ رہی تھی۔ اس نے کشمیر چھوڑ دو، کا نعرہ بلند کیا اور اپنا معاملہ کیبنٹ مشن کے سامنے رکھ دیا۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مہاراجہ کشمیر کو مطلق العنانیت ترک کر دینی چاہیے اور حکومت کی باگ ڈور خود عوام کے ہاتھ میں دے دینی چاہیے۔ مہاراجہ کی حکومت نے اس کے جواب میں شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا کو گرفتار کر لیا —— کچھ عرصہ پہلے نیشنل کانفرنس کا ایک نمائندہ حکومت میں لے لیا گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ کوئی سمجھوتا شاید ہو جائے۔ شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا کی گرفتاری نے ان امیدوں کو توڑ کر رکھ دیا۔

جواہر لال نے ہمیشہ سے ایک نمائندہ حکومت کے لیے کشمیر کی جدوجہد میں گہری دلچسپی لی تھی۔ جب یہ نئے واقعات رونما ہوئے تو انھوں نے سوچا کہ انھیں کشمیر جانا چاہیے۔ یہ اس واسطے بھی ضروری خیال کیا گیا تا کہ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے لیے قانونی دفاع کا کچھ انتظام ہو سکے۔ میں نے یہ کام آصف علی کے سپرد کر دیا۔ جواہر لال نے کہا کہ وہ آصف علی کے ساتھ جائیں گے، چنانچہ دونوں رخصت ہو گئے۔ مہاراجہ کی حکومت کو اس فیصلے پر جھنجھلاہٹ ہوئی اور اس نے کشمیر میں ان کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ ——— جب وہ راولپنڈی سے روانہ ہوئے اور کشمیر کی سرحد پر پہنچے تو اُڑی کے مقام پر انھیں روک لیا گیا۔ انھوں نے پابندی کو ماننے سے انکار کر دیا اور کشمیر کی حکومت نے انھیں گرفتار کر لیا ——— اس نے فطری طور پر ملک میں ایک زبردست سنسنی پیدا کر دی۔

میں ان حالات سے بہت خوش نہیں تھا۔ جہاں مجھے حکومتِ کشمیر کی اس کارروائی پر غصہ تھا، وہیں میں یہ بھی سوچتا تھا کہ کشمیر کے مسئلے پر ایک نیا جھگڑا شروع کرنے کا یہ مناسب موقع نہیں تھا۔ میں نے وائسرائے سے بات چیت کی اور کہا کہ حکومتِ ہند کو یہ انتظام کرنا چاہیے کہ میں ٹیلی فون پر جواہر لال سے گفتگو کر سکوں۔ انھیں ایک ڈاک بنگلے میں نظر بند کر دیا گیا تھا، اور میں کچھ دنوں بعد رابطہ قائم کر سکا ——— میں نے جواہر لال سے کہا کہ میرے خیال سے انھیں جتنی جلدی ممکن ہو سکے، دہلی واپس آجانا چاہیے۔ موجودہ صورتِ حال میں، ان کے لیے کشمیر میں داخلے پر اصرار کرنا مناسب نہیں ہوگا ——— جہاں تک کشمیر کے مسئلے کا تعلق ہے، میں نے انھیں یقین دلایا کہ صدر کانگریس کی حیثیت سے میں اس معاملے کو خود اپنے ہاتھ میں لوں گا۔ میں شیخ عبداللہ اور ان کے رفقاء کی رہائی کے لیے بھی کام کروں گا، مگر جواہر لال کو فوراً لوٹ آنا چاہیے۔

پہلے تو جواہر لال نے اعتراض کیا، لیکن کچھ بحث کے بعد، وہ میری اس یقین دہانی پر کہ میں خود کشمیر کے مسئلے کو اٹھاؤں گا، راضی ہو گئے۔ پھر میں نے لارڈ ویول سے گزارش کی کہ جواہر لال اور آصف علی کو واپس لانے کے لیے وہ ایک ہوائی جہاز کا انتظام کر دیں، اس

وقت، جب میں نے یہ درخواست کی تھی، شام کے سات بج رہے ہوں گے، مگر اسی رات انھوں نے ایک ہوائی جہاز بھجوا دیا۔ جہاز سری نگر رات کو دس بجے کے قریب پہنچا اور دو بجے صبح کے وقت جواہر لال اور آصف علی کو ساتھ لے کر دلی واپس آگیا ——— اس پورے معاملے میں لارڈ ویول کا رویہ انتہائی دوستانہ تھا اور میں نے اسے نہایت پسند کیا۔

میں یہ ذکر پہلے ہی کر چکا ہوں کہ کیبنیٹ مشن نے اپنی اسکیم ۱۶؍مئی کو شائع کی۔ بنیادی طور پر، یہ ویسی ہی تھی جس کا خاکہ میں نے اپنے ۱۵؍اپریل کے بیان میں پیش کیا تھا۔ کیبنیٹ مشن پلان کے تحت صرف تین امور لازمی طور پر مرکزی حکومت کے حوالے کیے جانے والے تھے ——— دفاع، بیرونی معاملات اور رسل و رسائل ——— جو میں نے اپنی اسکیم میں تجویز کیے تھے۔ بہرحال، مشن نے اس منصوبے میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کر لیا۔ اس نے ملک کو تین علاقوں میں بانٹ دیا، 'اے'، 'بی' اور 'سی'، کیونکہ مشن کے ممبران کا خیال تھا کہ اس سے اقلیتوں میں اعتماد کا ایک قوی تر احساس پیدا ہوگا۔ سیکشن 'بی' میں پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور برطانوی بلوچستان شامل ہوں گے۔ یہ علاقہ مسلم اکثریت پر مشتمل ہوگا۔ سیکشن 'سی'، جس میں بنگال اور آسام شامل ہوں گے، مسلمانوں کی تعداد دوسروں سے کچھ زیادہ ہوگی۔ کیبنیٹ مشن کا خیال تھا کہ یہ انتظام مسلم اقلیت کے لیے مکمل اطمینان کا موجب ہوگا اور لیگ کے تمام جائز خدشات اس سے رفع ہو جائیں گے۔

مشن نے میرا یہ نظریہ بھی قبول کر لیا تھا کہ بیشتر امور سے صوبائی سطح پر نمٹا جائے گا۔ اس طرح مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمان تقریباً مکمل طور پر خود مختار ہوں گے، باہمی رضامندی کے بعد صرف چند امور نے حلقہ بندی کی سطح پر تعلق قائم کیا جائے گا، یہاں بھی سیکشن 'بی' اور 'سی' میں مسلمانوں کا اکثریت میں ہونا یقینی تھا جہاں وہ اپنی تمام جائز توقعات کو پورا کرنے کے اہل ہوں گے ——— جہاں تک مرکز کا تعلق تھا، صرف تین امور ایسے تھے جن کا انتظام معاملے کی نوعیت کے اعتبار سے صوبائی سطح پر ممکن نہیں تھا۔ چونکہ کیبنیٹ مشن پلان اپنی روح

کے اعتبار سے میرے اپنے منصوبے سے مماثل تھا اور اس میں واحد اضافہ تین حصوں (SECTIONS) کے قیام کا تھا، اس لیے میرا خیال یہ تھا کہ ہمیں اس تجویز کو قبول کر لینا چاہیے۔

پہلے پہل مسٹر جناح مکمل طور پر اس اسکیم کے خلاف تھے۔ مسلم لیگ ایک علاحدہ آزاد ریاست کے اپنے مطالبے میں اس قدر آگے بڑھ چکی تھی کہ اس کے لیے واپس لوٹنا محال تھا۔ مشن نے صاف اور غیر مبہم لفظوں میں یہ بتا دیا تھا کہ وہ کبھی بھی ملک کی تقسیم اور ایک آزاد ریاست کی تشکیل کی سفارش نہیں کر سکتا۔ لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفرڈ کرپس نے بار بار کہا تھا کہ وہ سمجھ نہیں پاتے تھے کہ مسلم لیگ کی نظر میں پاکستان جیسی جو ریاست ہے، وہ زندہ اور پائدار کیونکر ہو سکتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ میرا فارمولا، جو صوبوں کو ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ خود مختاری دیتا ہے اور مرکزی حکومت کے لیے صرف تین امور کو مخصوص کرتا ہے، وہی اس مسئلے کا واحد حل ہے۔ لارڈ پیتھک لارنس نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ کہا کہ میرے فارمولے کو تسلیم کر لینے کا مطلب یہ ہو گا کہ شروع میں مسلم اکثریتی صوبے صرف تین امور مرکزی حکومت کو تفویض کریں گے اور اس طرح اپنے لیے مکمل خود مختاری کو یقینی بنائیں گے۔ دوسری طرف ہندو اکثریتی صوبے اپنے طور پر، کئی اور امور مرکزی حکومت کو منتقل کرنے کے لیے راضی ہو جائیں گے۔ کیبینیٹ مشن نے سوچا کہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ایک سچے وفاق میں، شامل ہونے والی تمام اکائیوں کو یہ طے کرنے کی آزادی ہونی چاہیے کہ کتنے اور کس قسم کے امور مرکزی حکومت کو منتقل کیے جائیں۔

اس سے پہلے کہ وہ کسی فیصلے تک پہنچ سکتی، مسلم لیگ کونسل تین روز تک اجلاس کرتی رہی ——— آخری دن، مسٹر جناح کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اقلیتی مسئلے کا جو حل کیبینیٹ مشن پلان نے پیش کیا تھا اس سے زیادہ منصفانہ حل کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی حالت میں وہ اس سے بہتر شرطیں نہیں منوا سکتے تھے۔ انھوں نے کونسل سے کہا کہ کیبینیٹ مشن کی پیش کردہ اسکیم، جو کچھ وہ حاصل کر سکتے تھے اس کی انتہائی شکل ہے۔ چنانچہ انھوں نے مسلم لیگ کو صلاح دی کہ اسکیم کو منظور کر لے اور کونسل نے اتفاق رائے سے اس

کے حق میں ووٹ دیا۔

ابھی میں مسوری ہی میں تھا جب مسلم لیگ کے بعض اراکین مجھ سے ملے تھے اور اپنی حیرت اور تعجب کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے صاف طور پر کہا کہ اگر لیگ کیبنیٹ مشن پلان کو قبول کرنے پر آمادہ تھی تو اس نے ایک آزاد ریاست کا نعرہ کیوں بلند کیا اور مسلمانوں کو بھڑکایا کیوں؟ ــــــ میں نے اس سوال پر اُن سے مفصل گفتگو کی۔ اخیر میں انھیں یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑا کہ مسلم لیگ کا نظریہ جو بھی ہو، ہندستان کے مسلمان اس سے بہتر شرطوں کی توقع نہیں کر سکتے تھے جو کیبنیٹ مشن پلان میں پیش کی گئی تھیں۔

ورکنگ کمیٹی میں اپنی بحثوں کے دوران میں نے اس امر کی نشاندہی کی کہ کیبنیٹ مشن پلان اساسی طور پر وہی کچھ تھا جو کچھ کہ میں نے اپنی اسکیم میں وضع کیا تھا۔ اس طرح ورکنگ کمیٹی کو، پلان میں شامل خاص سیاسی حل کو قبول کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ مگر بہرحال، دولت متحدہ سے ہندستان کے تعلق کا سوال بھی تھا۔ میں نے مشن سے کہا کہ یہ فیصلہ ہندستان پر چھوڑ دیا جائے ــــــ مجھے یقین تھا کہ تنہا اسی ایک طریقے سے صحیح فیصلے تک پہنچا جا سکتا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ یہ میری رائے تھی کہ اگر یہ سوال ہندستان پر چھوڑ دیا گیا تو یہ ناممکن نہیں ہے کہ ہندستان دولت متحدہ میں اپنی شمولیت کو برقرار رکھنے کے حق میں فیصلہ کرلے ــــــ سر اسٹیفرڈ کرپس نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔ کیبنیٹ مشن پلان میں، یہ سوال آزاد ہندستان کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کی وجہ سے بھی کیبنیٹ مشن پلان کو قبول کرنا آسان بنا دیا۔ طویل مذاکرات کے بعد، ورکنگ کمیٹی نے اپنی ۲۶ جون کی قرار دادمیں، آئندہ کے لیے کیبنیٹ مشن پلان کو تسلیم کرلیا گرچہ اس نے خود کو ایک انٹرم حکومت کی تجویز قبول کرنے سے قاصر سمجھا۔

ہندستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ میں، کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں کی طرف سے کیبنیٹ مشن پلان کا قبول کرلیا جانا، ایک شاندار واقعہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندستان کی آزادی کا مشکل مسئلہ مذاکرات اور مصالحت کے ذریعے طے کیا گیا تھا، تشدد اور تصادم کے طریقوں سے نہیں ــــــ اس سے یہ بھی

ظاہر ہوتا تھا کہ فرقہ وارانہ مشکلات بالآخر پیچھے چھوڑ دی گئیں۔ ملک بھر میں شادمانی کا ایک احساس تھا اور آزادی کے لیے اپنے مطالبے میں، تمام لوگ متحد تھے ——— ہم نے خوشیاں منائیں، مگر اس وقت ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ ہماری خوشی قبل از وقت تھی اور مایوسی کی کڑواہٹ ہماری راہ دیکھ رہی تھی۔

۱۲

تقسیم کا پیش خیمہ

اب، جبکہ سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے، ایسا لگتا تھا کہ حل کیے جاچکے ہیں، ایک نئے معاملے نے اپنی جانب توجہ کا مطالبہ کیا ——— مجھے ۱۹۳۹ء میں کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ کانگریس کے آئین کے مطابق میری مدت کار صرف ایک سال کے لیے تھی۔ عام حالات میں، ۱۹۴۰ء میں نیا صدر چُن لیا جاتا۔ مگر اس امر میں جنگ مانع ہوئی اور کچھ ہی دنوں بعد انفرادی ستیاگرہ کی تحریک شروع ہوگئی۔ معمول کی سرگرمیاں بند کردی گئیں۔ اور ہمیں ۱۹۴۰ء میں، پھر ۱۹۴۲ء میں گرفتار کرلیا گیا۔ کانگریس بھی ایک غیر قانونی تنظیم قرار دے دی گئی۔ ایسی صورت میں، اسی لیے، میری جگہ پر صدر کے انتخاب کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور میں ہی اس پورے عرصے میں صدر رہا۔

اب صورت حال معمول پر آگئی تھی۔ فطری طور پر یہ سوال اٹھا کہ کانگریس کے نئے انتخابات ہونے چاہئیں اور ایک نیا صدر چُنا جانا چاہیے۔ جیسے ہی اخبارات میں یہ ذکر چھڑا ایک عام مطالبہ یہ کیا جانے لگا کہ مجھے پھر سے صدر منتخب کرلیا جائے۔ میرے دوبارہ منتخب کیے جانے کے سلسلے میں خاص دلیل یہ دی جاتی تھی کہ میں ہی کرپس سے، لارڈ ویول سے اور اب کیبنیٹ مشن سے مذاکرات کا نگراں رہا تھا۔ شملہ کانفرنس کے موقعے پر سیاسی مسئلے کا کامیاب

حل تلاش کرنے میں مجھی کو پہلے پہل کامیابی ملی تھی گرچہ یہ کانفرنس فرقہ واریت کے سوال پر بالآخر ٹوٹ گئی تھی۔ کانگریس میں ایک عام احساس یہ تھا کہ چونکہ ابھی تک میں تے مذاکرت چلائے تھے، اس لیے مجھے ہی انھیں ایک کامیاب نقطۂ تکمیل تک لانے اور ان کے مطابق تعمیل کیے جانے کا مرحلہ بھی سونپا جانا چاہیے ——— بنگال، بمبئی، مدراس، بہار اور یوپی کے کانگریس حلقے کھل کر یہ رائے ظاہر کرتے تھے کہ آزاد ہندوستان کو اپنے سفر پر لگانے کی ذمے داری مجھ کو ہی دی جانی چاہیے۔

مَیں نے، بہر حال، یہ محسوس کر لیا کہ کانگریس ہائی کمان کے اندرونی حلقوں میں کچھ اختلاف رائے تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ سردار پٹیل اور ان کے دوستوں کی خواہش یہ تھی کہ انھیں صدر منتخب کر لیا جائے۔ میرے لیے یہ ایک نہایت نازک سوال بن گیا اور پہلے پہل تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مَیں نے توجہ کے ساتھ اس مسئلے پر غور کیا اور آخر کار اس نتیجے تک پہنچا کہ کیونکہ مَیں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک، سات سال کانگریس صدر رہا تھا اس لیے اب مجھے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ اس لیے، مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اپنا نام تجویز کیے جانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

دوسری بات جو مجھے طے کرنی تھی، میرے جانشین کے انتخاب سے متعلق تھی۔ مجھے اس کی فکر تھی کہ اگلا صدر ایسا شخص ہو جو میرے نقطۂ نظر سے اتفاق رکھتا ہو اور اسی پالیسی پر عمل پیرا ہو جو مَیں نے اختیار کی تھی۔ اس کے اداخل اور عواقب کا جائزہ لینے کے بعد مَیں اس نتیجے تک پہنچا کہ موجودہ حالات میں سردار پٹیل کا انتخاب مناسب نہیں ہوگا۔ تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے، مجھے ایسا لگا کہ جواہر لال کو نیا صدر ہونا چاہیے۔ چنانچہ ۲۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو مَیں نے صدارت کے لیے ان کا نام تجویز کرتے ہوئے اور کانگریسیوں سے یہ اپیل کرتے ہوئے کہ انھیں اتفاق رائے سے جواہر لال کو منتخب کرنا چاہیے، ایک بیان جاری کر دیا۔

* مَیں نے حتی الوسع اپنی فہم و فراست کے مطابق قدم اٹھایا، مگر اس وقت سے معاملات نے جو شکل اختیار کی ہے، اس کی بنیاد پر مَیں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ یہ میری سیاسی

زندگی کی شاید سب سے بڑی بھول تھی۔ مَیں اپنے کسی فعل پر اتنا پشیمان نہیں ہوا جتنا کہ اس نازک مرحلے میں کانگریس کی صدارت سے اپنا نام واپس لینے کے فیصلے پر ——— یہ ایک ایسی غلطی تھی جسے گاندھی جی کے لفظوں میں، مَیں، ' ہمالیائی جہات ' والی غلطی کا نام دے سکتا ہوں۔

میری دوسری غلطی وہ تھی جب مَیں نے خود نہ کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اور مَیں نے سردار پٹیل کی حمایت نہیں کی۔ ہم بہت سے معاملات پر اختلافِ رائے رکھتے تھے، مگر مجھے یقین ہے کہ میرے بعد اگر وہ صدر کانگریس ہوتے تو وہ اس کا خیال رکھتے کہ کیبنٹ مشن پلان کا اطلاق کامیابی کے ساتھ کیا جائے۔ وہ جواہر لال والی غلطی کبھی نہ کرتے جس نے مسٹر جناح کو سارا منصوبہ خراب کر دینے کا موقع فراہم کر دیا ——— میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا جب میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ غلطیاں مجھ سے سرزد نہ ہوئی ہوتیں تو پچھلے دس برسوں کی تاریخ شاید مختلف ہوتی۔ *

میرے بیان نے کانگریسیوں کے درمیان، ملک کے طول و عرض میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ کئی اہم لیڈران کلکتے، بمبئی اور مدراس سے سفر کر کے آئے تاکہ مجھے اپنا بیان واپس لینے اور اپنا نام پیش کیے جانے پر مائل کر سکیں۔ اس سلسلے میں اخبارات میں بھی اپیلیں شائع ہوئیں۔ مگر مَیں پہلے ہی ایک فیصلہ کر چکا تھا اور میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ اپنا مؤقف تبدیل کر دوں ——— ایک عنصر جس نے میرے فیصلے کو زیادہ تقویت پہنچائی، گاندھی جی کا نقطۂ نظر تھا۔ وہ مجھ سے متفق تھے کہ مجھے صدر کی حیثیت سے اب کام نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس بات سے وہ پوری طرح خوش نہیں تھے کہ میں نے اپنے جانشین کے طور پر جواہر لال کا نام تجویز کیا تھا۔ شاید وہ سردار پٹیل کی جانب کسی قدر مائل تھے، مگر ایک بار مَیں نے جب جواہر لال کا نام پیش کر دیا تو انھوں نے اپنے خیالات کو عام لوگوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا۔ سردار پٹیل اور آچاریہ کرپلانی کا نام، کچھ لوگوں نے تجویز ضرور کیا، مگر آخیر میں جواہر لال اتفاق رائے سے قبول کر لیے گئے۔

مسلم لیگ کونسل نے کیبنٹ مشن پلان تسلیم کر لیا تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے

بھی یہی کیا تھا۔ تاہم اسے اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی منظوری درکار تھی۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ بس ایک رسمی کارروائی ہو گی کیونکہ اے۔ آئی۔ سی۔ سی نے ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں کی ہمیشہ توثیق کی تھی ——— چنانچہ ۷؍جولائی ۱۹۴۶ء کو اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی میٹنگ بمبئی میں طلب کی گئی۔ ایک بار یہ فیصلہ کر لیا گیا تو میرے لیے دلی میں اپنے قیام کو طول دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ گرمی ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی، سو میں ۳۰؍جون کو کلکتہ واپس آ گیا۔ ۳؍تاریخ کو میں بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا ——— سرت چندر بوس بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ تقریباً ہر اسٹیشن پر بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو جاتے تھے اور ان کا نعرہ یہ ہوتا تھا کہ مجھے کانگریس صدر بنے رہنا چاہیے۔ ہر بڑے اسٹیشن پر سرت بابو میرے کمپارٹمنٹ میں آتے اور یہ دہراتے جاتے، "دیکھیے، پبلک کیا چاہتی ہے اور پھر بھی آپ نے کیا کیا ہے؟"

ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ۶؍جولائی کو ہوئی اور اس نے اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے زیرِ غور لانے کے لیے قرار دادوں کے مسودے تیار کیے۔ پہلی قرارداد کیبنیٹ مشن پلان سے متعلق تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں ہی اسے پیش کروں کیونکہ کانگریس کے بائیں بازو کے گروپ کی طرف سے زوردار مخالفت کا اندیشہ تھا۔

جب اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی میٹنگ ہوئی، میں نے جواہر لال کو دعوت دی کہ کانگریس کی صدارت کا چارج مجھ سے لے لیں۔ پھر میں نے کیبنیٹ مشن پلان پر قرارداد پیش کی اور اس کے خاص پہلوؤں کا مختصراً ذکر کیا۔ بائیں بازو کے لوگوں نے بڑی شدومد کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ کانگریسی سوشلسٹوں نے اس مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کیونکہ یہ ایک سستی ترکیب تھی کہ ایک انتہاپسندانہ پوزیشن اختیار کر لی جائے اور اس طرح مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے ایک غیر حقیقی اداکارانہ رویّہ اپنایا۔ یوسف مہرعلی اس وقت بہت بیمار تھے، مگر وہ انھیں سامعین کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے، ایک اسٹریچر پر ڈال کر لائے۔ انھوں نے بھی کیبنٹ مشن پلان کی مخالفت میں تقریر کی۔

اپنے جواب میں، تفصیل کے ساتھ میں نے وضاحت کی کہ پلان کے مضمرات کیا تھے، اور یہ نشاندہی کی کہ یہ پلان دراصل کانگریس کے لیے ایک عظیم فتح ہے۔ میں نے کہا کہ یہ (پلان) کسی تشدد آمیز اور خون ریز بغاوت کے بغیر آزادی کے حصول کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ایک پُرامن احتجاج اور بات چیت کے نتیجے میں انگریزوں کا ہندوستان کے قومی مطالبے کو تسلیم کر لینا، عالمی تاریخ کا ایک بے مثال واقعہ ہے۔ چالیس کروڑ کی آبادی والی ایک قوم گفت گو اور مصالحت کے ذریعے آزاد ہو رہی تھی، فوجی کارروائی کے نتیجے میں نہیں۔ تنہا اسی ایک نقطۂ نظر سے، ہماری اس جیت کی قدر و قیمت کو کم سمجھنا، محض دیوانگی ہوگی۔ میں نے مزید کہا کہ کیبنیٹ مشن پلان نے کانگریس کے نقطۂ نظر کو اس کے تمام لازمی عناصر کے ساتھ قبول کر لیا تھا، اس نے ہندوستان کی وحدت کی ضمانت دی ہے، گرچہ اسی کے ساتھ ساتھ اس نے اقلیتوں کو ضروری یقین دہانیاں بھی کرائی ہیں۔ کانگریس ہندوستان کی آزادی اور وحدت کی علم بردار تھی، اور تمام انتشار پسند رجحانات کی مخالفت کرتی تھی۔ یہ واقعہ میری فہم سے بعید ہے کہ کانگریسی سوشلسٹوں جیسے لوگ، ایک جیت کو ہار سمجھ رہے ہیں۔

سامعین پر میری تقریر کا ایک فیصلہ کن اثر ہوا۔ جب ووٹ لیے گئے تو قرارداد زبردست اکثریت سے منظور کر لی گئی۔ اس طرح کیبنیٹ مشن پلان کو تسلیم کرتے ہوئے ورکنگ کمیٹی کی قرارداد پر مُہرِ قبولیت ثبت کر دی گئی۔

چند روز بعد لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفرڈ کرپس کی جانب سے مجھے مبارکباد کے تار موصول ہوئے۔ وہ خوش تھے کہ کانگریس نے میری قرارداد منظور کر لی تھی اور مجھے اس بات پر مبارکباد دے رہے تھے کہ میں نے کیبنیٹ مشن پلان کو سلیقے کے ساتھ پیش کیا تھا۔

اب اُن بدنصیب واقعات میں سے، جو تاریخ کا رُخ بدل دیتے ہیں، ایک واقعہ پیش آیا ——— ۱۰ جولائی کو جواہر لال نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس بلائی جس میں انھوں نے ایک حیران کن بیان دیا۔ بعض اخباری نمائندوں نے اُن سے پوچھا کہ کیا اے۔ آئی سی۔ سی کے ذریعہ قرارداد کے منظور کر لیے جانے کے ساتھ کانگریس نے پلان کو، بشمول

انترام حکومت کی تشکیل کے، جوں کا توں قبول کر لیا ہے۔ *

جواب میں جواہر لال نے کہا کہ دستور ساز اسمبلی میں کانگریس یوں داخل ہو گی کہ — "وہ سمجھوتوں سے یکسر آزاد ہو گی اور وہ تمام حالات جو رونما ہو سکتے ہیں، ان کا سامنا اپنی مرضی کے مطابق کرے گی۔"

اخباری نمائندوں نے مزید یہ دریافت کیا کہ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کیبنیٹ مشن پلان میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔

جواہر لال نے پر زور انداز میں جواب دیا کہ کانگریس صرف اس پر رضامند ہوئی تھی کہ دستور ساز اسمبلی میں شرکت کرے گی، اور وہ اپنے آپ کو اس کے لیے آزاد سمجھتی ہے کہ اس کے نزدیک جو مناسب ترین صورت ہو اسی کے مطابق کیبنیٹ مشن پلان کو تبدیل کرے یا اس میں ترمیم کر دے۔

* مسلم لیگ نے دباؤ میں آ کر کیبنیٹ مشن پلان کو قبول کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مسٹر جناح اس سے بہت خوش نہیں تھے۔ لیگ کونسل کو خطاب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں انھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ انھوں نے قبولیت کی سفارش صرف اس لیے کی تھی کیونکہ اس سے بہتر اور کچھ مل نہیں سکتا تھا۔ اُن کے سیاسی حریفوں نے اُن پر یہ کہتے ہوئے تنقید شروع کر دی کہ وہ معاملات کو نمٹانے میں ناکام رہے ہیں۔ انھوں نے اُن پر یہ الزام عاید کیا کہ انھوں نے ایک آزاد اسلامی ریاست کا خیال ترک کر دیا ہے۔ انھوں نے ان پر یہ طنز بھی کیا کہ اگر لیگ کیبنیٹ مشن پلان کو قبول کرنے پر رضامند ہی تھی ——— جو ایک الگ ریاست بنانے کے مسلمانوں کے حق کی نفی کرتا ہے ——— تو پھر مسٹر جناح نے ایک آزاد اسلامی ریاست کے بارے میں اتنا ہنگامہ کیوں برپا کیا تھا؟

سو، مسٹر جناح کیبنیٹ مشن سے گفت و شنید کے نتائج کی بابت بالکل خوش نہیں تھے۔ جواہر لال کا بیان ان کے سر پر ایک بم کی طرح گرا۔ انھوں نے فوراً ہی ایک بیان جاری کر دیا کہ صدر کانگریس کا یہ اعلان پوری صورت حال پر نظرِ ثانی کا تقاضہ کرتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے لیاقت علی خاں سے کہا کہ لیگ کونسل کی ایک میٹنگ طلب کریں۔

اور حسب ذیل مضمون کا ایک بیان جاری کر دیا ـــــ مسلم لیگ کونسل نے دہلی میں کیبنیٹ مشن پلان اس لیے قبول کیا تھا کیونکہ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ کانگریس نے بھی اسکیم منظور کر لی ہے اور یہی پلان ہندستان کے آئندہ آئین کی اساس ہوگا۔ اب جبکہ کانگریس کے صدر نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کے ذریعہ کانگریس اس اسکیم کو بدل سکتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اقلیتیں اکثریت کے رحم و کرم پہ ہوں گی۔ اُن کے خیال میں جواہر لال کے اعلان کا مفہوم یہ تھا کہ کانگریس نے کیبنیٹ مشن پلان کو مسترد کر دیا ہے، اور اس طرح وائسرائے کو اب مسلم لیگ سے، جس نے پلان کو قبول کر لیا تھا، یہ کہنا چاہیے کہ وہی حکومت کی تشکیل کرے۔

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بمبئی میں ۲۷ جولائی کو ہوا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں مسٹر جناح نے پاکستان کا مطالبہ دوہرایا کہ مسلم لیگ کے سامنے صرف یہی ایک راستہ رہ گیا ہے ـــــ تین روز کی بحث کے بعد، کونسل نے کیبنیٹ مشن پلان کو مسترد کرتے ہوئے ایک قرارداد پاس کر دی۔ اس نے پاکستان کے حصول کے لیے براہ راست کارروائی پر اتر آنے کا فیصلہ بھی کیا۔

میں اس نئی صورت حال سے انتہائی پریشان تھا۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ایک اسکیم جس کے لیے میں نے اتنی سخت محنت کی تھی، ہمارے اپنے فعل سے برباد ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ فوراً کی جانی چاہیے تاکہ صورت حال کا جائزہ لیا جائے۔ جواہر لال پہلے تو راضی نہیں تھے، مگر جب میں نے اصرار کیا تو مان گئے۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۸ اگست کو ہوا اور پوری سیاسی صورت حال پر نظر دوڑائی گئی۔ میں نے نشاندہی کی کہ اگر ہم اس صورت حال کو سنبھالنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ واضح کر دینا چاہیے کہ بمبئی کی پریس کانفرنس میں صدر کانگریس کا بیان اُن کی ذاتی رائے تھی اور یہ کانگریس کے فیصلے سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ میں نے اس کی وضاحت کی کہ کانگریس کا نقطۂ نظر اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے ذریعہ منظور کی جاتے والی قرارداد کے توسط سے بیان کر دیا گیا تھا، اور کوئی بھی فرد، حتیٰ کہ صدرِ کانگریس بھی، اُسے

بدل نہیں سکتا تھا ——* جواہر لال نے یہ استدلال پیش کیا کہ انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر ورکنگ کمیٹی اس کا اعادہ کرنا چاہتی ہے کہ کانگریس نے کیبنیٹ مشن پلان کو قبول کرلیا ہے۔ لیکن ان کے خیال سے یہ تنظیم کے لیے خفت کا باعث ہوگا اور شخصی طور پر ان کے لیے بھی، اگر ورکنگ کمیٹی ایک قرارداد پاس کرتی ہے کہ صدر کانگریس کا بیان کانگریس کی پالیسی کی ترجمانی نہیں کرتا۔*

اب ورکنگ کمیٹی ایک مخمصے میں تھی۔ ایک طرف کانگریس کے صدر کا وقار داؤں پر تھا۔ دوسری طرف، وہ سمجھوتہ جو ہم اتنی صعوبتوں کے بعد کر سکے تھے، خطرے میں تھا۔ صدر کے بیان کی تردید تنظیم کو کمزور کردے گی، مگر کیبنیٹ مشن پلان کو ترک کرنے کا مطلب ملک کو برباد کردینا تھا —— بالآخر، ہم نے ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا جس میں جواہر لال کے بیان کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا، مگر جس سے، مندرجہ ذیل لفظوں میں، اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے فیصلے کی توثیق ہوتی تھی:

> ورکنگ کمیٹی کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے، اپنے گزشتہ فیصلے کے برعکس، دستور ساز اسمبلی میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک بیرونی طاقت کی ماتحتی سے مکمل آزادی تک، تیز رفتار تبدیلیوں کے اس دور میں، جب وسیع اور پرپیچ سیاسی اور اقتصادی مسئلوں کا سامنا کرنا ہے اور انھیں حل کرنا ہے، ہندستان کے عوام اور ان کے نمائندوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعاون درکار ہے، تاکہ یہ تبدیلی کا عمل ہموار ہو اور تمام متعلقین کے لیے مفید مطلب ہو۔ کمیٹی اس حقیقت کو پہچانتی ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے نظریوں اور مقاصد میں اختلافات ہیں۔ تاہم، مجموعی طور پر ملک کے اور ہندستان کے لوگوں کی آزادی کے وسیع تر مفاد میں، کمیٹی ان سب سے تعاون کی اپیل کرتی ہے۔ جو آزادی کے اور ملک کی فلاح کے طالب ہیں، اس امید کے ساتھ کہ مشترکہ معاملات میں تعاون، ہندستان کے

بہت سے مسئلوں کے حل کی طرف لے جائے گا۔

کمیٹی کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ مسلم لیگ کی طرف سے اس طرح کی، نکتہ چینی کی گئی ہے کہ ۱۶ رمئی کے بیان میں شامل تجاویز کے سلسلے میں کانگریس کی قبولیت مشروط تھی۔ کمیٹی یہ بات صاف کردینا چاہتی ہے کہ اگرچہ اس نے بیان میں شامل تجاویز کو پسند نہیں کیا تھا، پھر بھی اس نے اسکیم کو اس کی کلیت کے ساتھ قبول کیا ہے۔ اس نے اس کی تعبیر اس مقصد سے کی ہے کہ اسکیم کے مشمولات میں جو تناقضات دکھائی دیتے ہیں انھیں دور کردیا جائے اور جو باتیں سہواً چھوڑ دی گئی ہیں، بیان میں درج اصولوں کے مطابق ان کی خانہ پُری کردی جائے۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ صوبائی خودمختاری کی دفعہ اساسی حیثیت رکھتی ہے اور ہر صوبے کو اس فیصلے کا حق ہے کہ وہ کسی گروپ کی تشکیل کرے یا نہیں، یا کسی گروپ میں شامل ہو کر نہ ہو۔ تعبیر کے سلسلے میں سوالات کا فیصلہ خود بیان میں مندرج طریق کار کے ذریعہ کیا جائے گا اور کانگریس دستور ساز اسمبلی میں اپنے نمائندوں کو یہ صلاح دے کہ وہ اسی کے مطابق عمل کریں۔

کمیٹی نے دستور ساز اسمبلی کی سربراہانہ حیثیت پر زور دیا ہے کہ اسی حیثیت کے مطابق عمل کرنے اور ہندستان کے لیے دستور تیار کرنے کا حق، کسی بیرونی طاقت یا اقتدار کی مداخلت کے بغیر، اسے حاصل ہے۔ لیکن یہ امر فطری ہے کہ اسمبلی نے اپنے اندرونی حدود میں رہتے ہوئے جو اس کی ترکیب میں شامل ہیں اپنے منصب کی ادائیگی کرتی رہے گی۔ چنانچہ آزاد ہندستان کا آئین مرتب کرتے وقت وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں (لوگوں کا) تعاون حاصل کرنا چاہے گی، اس طرح کہ ایسے تمام لوگوں کو، جن کے دعوے اور مفادات حق بجانب ہوں، انھیں زیادہ سے زیادہ آزادی اور تحفظ فراہم کیا جائے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کی خاطر اور

دستور ساز اسمبلی میں کام کرنے اور اسے کامیاب بنانے کی اسی خواہش کے پیشِ نظر، ورکنگ کمیٹی نے ۲۶ جون ۱۹۴۶ء کو اپنی قرارداد منظور کی تھی، جس کی توثیق بعد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۷ جولائی ۱۹۴۶ء کو کردی۔ اے، آئی، سی، سی کے اس فیصلے پر وہ (کانگریس) قائم ہے اور دستور ساز اسمبلی میں اپنا کام وہ اسی کے مطابق جاری رکھنا چاہتی ہے۔

(ورکنگ) کمیٹی کو امید ہے کہ مسلم لیگ اور جملہ متعلقین، ملک کے اور خود اپنے وسیع تر مفاد کی خاطر اس عظیم کام میں شریک ہوں گے۔

ہمیں اُمید تھی کہ ورکنگ کمیٹی کا ریزولیوشن صورت حال کو سنبھال لے گا۔ اب اس میں کوئی شک باقی نہیں رہ گیا ہے کہ کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان کو پورے کا پورا منظور کیا تھا۔ اگر مسلم لیگ ہماری قرارداد کو قبول کر لیتی تو اپنے وقار کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر اپنی پرانی پوزیشن میں واپس جا سکتی تھی۔ مگر کسی وجہ سے مسٹر جناح نے یہ پوزیشن قبول نہیں کی اور اس رائے پر قائم رہے کہ جواہر لال کا بیان کانگریس کے اصل ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر کانگریس اس وقت اتنی مرتبہ تبدیل ہو سکتی ہے جب انگریز ابھی ملک میں ہیں اور اقتدار اس کے ہاتھ میں نہیں آیا ہے تو اقلیتیں بھلا کس طرح اس پر بھروسہ کر سکتی تھیں کہ جب بالآخر انگریز رخصت ہو جائیں گے، اس کے بعد کانگریس پھر بدل نہیں جائے گی اور اسی پوزیشن کو پھر سے اختیار نہیں کرلے گی جسے جواہر لال نے اپنے بیان میں اپنایا ہے؟

کانگریس ورکنگ کمیٹی کی طرف سے کیبنٹ مشن پلان کی غیر مبہم قبولیت کا وائسرائے نے فوراً جواب دیا ——— ۱۲ اگست کو انھوں نے جواہر لال کو مندرجہ ذیل الفاظ میں یہ دعوت دی کہ مرکز میں وہ ایک انٹرم حکومت کی تشکیل کریں:

ہز ایکسیلنسی وائسرائے نے، ہز میجسٹی کی حکومت کی منظوری کے ساتھ، کانگریس کے صدر کو یہ دعوت دی ہے کہ ایک انٹرم حکومت کے فوری قیام کی بابت تجاویز پیش کریں، اور کانگریس کے صدر نے یہ دعوت قبول کرلی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو بہت جلد نئی دہلی آئیں گے تاکہ اس تجویز پر ہز ایکسیلنسی وائسرائے سے گفتگو کرسکیں۔

مسٹر جناح نے اسی روز ایک بیان جاری کیا جس میں انھوں نے کہا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا تازہ ترین ریزولیوشن جو وارد ھا میں ۱۰ راگست کو منظور کیا گیا ہمیں کوئی راستہ نہیں دکھاتا کیونکہ اس میں کانگریس کے اسی موقف کی تکرار ہے جو بالکل شروع سے ہی کانگریس نے اختیار کر رکھا تھا، بس اسے نئے لفظوں میں پیش کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے انٹرم حکومت کے قیام میں جواہر لال کی طرف سے تعاون کی دعوت مسترد کردی۔ بعد میں، ۱۵ راگست کو جواہر لال نے مسٹر جناح سے اُن کے گھر پر ملاقات کی۔ مگر ان کی گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور صورت حال تیزی کے ساتھ ابتر ہوتی گئی۔

جب جولائی کے اختتام پر لیگ کونسل کا اجلاس ہوا اور اس میں براہ راست کارروائی کا فیصلہ کیا گیا، تو اس میں مسٹر جناح کو یہ اختیار بھی سونپا گیا کہ پروگرام کی تکمیل کے لیے جو اقدام مناسب سمجھیں کریں ــــــ مسٹر جناح نے ۱۶ راگست کو براہ راست کارروائی کا دن (DIRECT ACTION DAY) مقرر کیا۔ مگر انھوں نے اس کی وضاحت نہیں کی کہ پروگرام کیا ہوگا۔ عام طور پر یہ سوچا گیا کہ تفصیلات طے کرنے کے لیے مسلم لیگ کونسل کا ایک اور اجلاس ہوگا، مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس، کلکتے میں مَیں نے یہ دیکھا کہ ایک عجیب صورت حال رونما ہو رہی تھی۔ ماضی میں یہ ہوا کرتا تھا کہ خاص دن منانے کے لیے سیاسی پارٹیاں ہڑتالیں کرتی تھیں، جلوس نکالتی تھیں اور میٹنگیں کرتی تھیں۔ لیگ کا براہ راست کارروائی کا دن کچھ اور ہی طرح کا نظر آتا تھا۔ کلکتے میں مَیں نے یہ احساس عام دیکھا کہ ۱۶ راگست کو مسلم لیگ کانگریسیوں پر حملہ کرے گی اور کانگریس

کی املاک لوٹ لے گی۔ مزید سراسیمگی اس وقت پیدا ہوئی جب حکومت بنگال نے ۱۶ راگست کو عام تعطیل کا دن قرار دے دیا۔ بنگال اسمبلی میں کانگریس پارٹی نے اس فیصلے کی مخالفت کی اور جب یہ اقدام غیر مؤثر ثابت ہوا تو حکومت کی اس پالیسی کے خلاف احتجاجًا واک آؤٹ کر گئی کہ اس نے ایک پارٹی کے فیصلے کو نافذ کرنے کے لیے سرکاری وسائل کا استعمال کیا ہے۔ کلکتے میں تشویش کی ایک عام کیفیت تھی جس میں اضافہ اس واقعے نے کیا تھا کہ وہاں حکومت پر مسلم لیگ کا قبضہ تھا ——— اور مسٹر ایچ۔ ایس۔ سہروردی وزیر اعلا تھے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۹ راگست کو ایک پارلیمانی ذیلی کمیٹی مقرر کی تھی جو سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرساد اور مجھ پر مشتمل تھی۔ ۱۳ر تاریخ کو، انٹرم حکومت کے قیام کے سلسلے میں وائسرائے کو پیش کی جانے والی ایک تجویز پر گفت گو کے لیے، ہم نے ایک میٹنگ کی۔ اب جواہر لال نے ۱۷ر تاریخ کو پارلیمانی کمیٹی کی ایک میٹنگ طلب کی۔ چنانچہ ۱۶ر تاریخ کو جہاز سے میں دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔

ہندستان کی تاریخ میں ۱۶ راگست ایک یوم سیاہ تھا۔ عام تشدد نے جس کی کوئی نظیر ہندستان کی تاریخ میں نہیں ملتی، کلکتہ کے عظیم الشان شہر کو خوں ریزی، قتل اور دہشت کے ایک طوفان میں جھونک دیا۔ سیکڑوں جانیں ضائع گئیں، ہزاروں گھائل ہوئے اور کروڑوں روپے کی املاک تباہ کر دی گئی۔ لیگ کی طرف سے جلوس نکالے گئے، جنھوں نے لوٹ مار اور آتش زنی شروع کر دی۔ جلد ہی پورا شہر دونوں فرقوں کے غنڈوں کی گرفت میں آ گیا۔

سرت چندر بوس گورنر کے پاس گئے تھے اور ان سے درخواست کی تھی کہ صورت حال کو قابو میں لانے کے لیے فوری طور پر کچھ کریں۔ انھوں نے گورنر کو یہ بھی بتایا کہ انھیں اور مجھے ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ کے لیے دہلی جانا تھا۔ گورنر نے ان سے کہا کہ ہوائی اڈے تک ہمارے ساتھ وہ ایک فوجی دستہ بھیج دیں گے۔ کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا، مگر کوئی نہیں آیا۔ تب میں اپنے طور پر چل پڑا۔ سڑکیں سنسان تھیں اور شہر سے موت جھانکتی تھی۔ جس

وقت میں اسٹرینڈ روڈ سے گزر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ بہت سے ٹھیلے والے اور چوکیدار ہاتھوں میں لٹھ لیے کھڑے ہیں۔ انھوں نے میری کار پر حملے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ میرے ڈرائیور کے چلا کر کہنے پر کہ یہ صدر کانگریس کی کار ہے۔ انھوں نے مطلق پروا نہ کی۔ بہرحال، ہوائی جہاز کی روانگی کے وقت سے چند منٹ پہلے، بڑی مشکلوں سے میں ڈم ڈم (ہوائی اڈہ) پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ فوج کا ایک بہت بڑا دستہ ٹرکوں میں انتظار کر رہا تھا —— جب میں نے پوچھا کہ امن قائم کرنے میں وہ مدد کیوں نہیں کر رہے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ انھیں بس تیار رہنے کا حکم ملا ہے، کسی کارروائی کا نہیں۔ پورے کلکتے میں فوج اور پولیس کھڑی ہوئی تھی، مگر بے عمل رہی جبکہ معصوم مردوں اور عورتوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔

۱۶ راگست ۱۹۴۶ء صرف کلکتے کے لیے ہی یوم سیاہ نہیں تھا، پورے ہندستان کے لیے تھا۔ واقعات نے جو موڑ اختیار کیا تھا، اس نے کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین کسی پرامن حل کی توقع کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا —— * یہ ہندستانی تاریخ کے عظیم ترین المیوں میں سے ایک تھا اور مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ان واقعات کی ذمے داری کا ایک بڑا حصہ جواہر لال کے سر جاتا ہے۔ ان کے اس بدبختانہ بیان نے کہ کانگریس کیبنیٹ مشن پلان میں ترمیم کے لیے آزاد ہوگی سیاسی اور فرقہ وارانہ سمجھوتے کے پورے سوال کو بھیجے کھول دیا۔ مسٹر جناح نے ان کی اس غلطی کا پورا فائدہ اٹھایا، اور کیبنیٹ مشن پلان کو قبول کرنے کے اپنے پرانے فیصلے سے خود کو نکال لیا۔*

جواہر لال میرے عزیز ترین دوستوں میں ہیں اور ہندستان کی قومی زندگی کو ان کی عطا کسی سے کم نہیں ہے —— * تاہم، افسوس کے ساتھ مجھے یہ کہنا ہوگا کہ یہ پہلا موقع نہیں تھا جب انھوں نے قومی مقصد کو زبردست صدمہ پہنچایا —— انھوں نے ۱۹۳۷ء میں بھی تقریباً ایسی ہی بھول کی تھی جب ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت پہلے انتخابات ہوئے تھے۔ ان انتخابات میں بمبئی اور یوپی کے علاوہ، پورے ملک میں مسلم لیگ کو ایک بہت بڑی ناکامی جھیلنی پڑی تھی* —— بنگال میں صوبے کے گورنر

نے عملاً اپنے ذہن کو لیگ حکومت کی تشکیل کے لیے تیار کر لیا تھا۔ مگر کرشنگ پرجا پارٹی کی کامیابی نے ان کے قیاسات کو درہم برہم کر دیا۔ دوسرے مسلم اکثریتی صوبوں، مثلاً پنجاب، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں، لیگ کو اسی طرح ناکامیاں اٹھانی پڑی تھیں۔ بمبئی میں لیگ نے کئی نشستیں جیت لی تھیں مگر اسے اپنی سب سے بڑی کامیابی یو۔ پی میں ملی، خاص طور پر اس تعاون کی وجہ سے جو جمعیۃ العلماء ہند نے لیگ کو دیا تھا۔ جمعیت نے مسلم لیگ کی حمایت اس تاثر کے تحت کی تھی کہ انتخابات کے بعد، مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرے گی۔

اس وقت یو۔ پی میں چودھری خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل خاں مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ جب حکومت کی تشکیل کے لیے میں لکھنؤ آیا، میں نے ان دونوں سے بات کی انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ کانگریس سے صرف تعاون ہی نہ کریں گے، بلکہ مکمل طور پر کانگریس پروگرام کی حمایت بھی کریں گے۔ انھیں قطعی طور پر یہ توقع تھی کہ نئی حکومت میں مسلم لیگ کا کچھ حصہ ہو گا۔ مقامی صورت حال ایسی تھی کہ دونوں میں سے کوئی بھی حکومت میں تنہا داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ یا تو دونوں کو لیا جاتا یا پھر کسی کو نہیں۔ اسی لیے، مجھے امید تھی کہ دونوں حکومت میں شامل کر لیے جائیں گے۔ اگر وزارت کو صرف سات ارکین پر مشتمل ہونا تھا تو دو مسلم لیگی ہوں گے باقی سب کانگریسی ——— نو افراد کی کابینہ میں، کانگریس کی اکثریت اور بھی زیادہ نمایاں ہو گی۔ مجھ سے گفت گو کے بعد، اس ضمن میں ایک نوٹ تیار کیا گیا کہ مسلم لیگ پارٹی کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرے گی اور کانگریس پروگرام کو قبول کرلے گی۔ نواب اسمٰعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں، دونوں نے دستاویز پر دستخط کیے اور میں لکھنؤ سے پٹنہ کے لیے روانہ ہو گیا ——— کیونکہ بہار میں وزارت کی تشکیل کے لیے میری موجودگی ضروری تھی۔

چند روز بعد، میں الٰہ آباد واپس آیا اور یہ معلوم کرکے مجھے شدید افسوس ہوا کہ جواہر لال نے خلیق الزماں کو اور نواب اسمٰعیل خاں کو یہ لکھ دیا تھا کہ دونوں میں سے بس ایک کو وزارت میں لیا جا سکتا ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ فیصلہ مسلم لیگ کو کرنا تھا کہ کس کو نامزد کیا جائے،

مگر پہلے میں جو کچھ عرض کر چکا ہوں اس کی روشنی میں دونوں میں سے کوئی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ تنہا شامل ہو جائے۔ چنانچہ دونوں نے معذرت کر لی اور کہا کہ جواہر لال کی پیشکش کو قبول کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

یہ ایک انتہائی افسوس ناک واقعہ تھا۔ اگر لیگ کی تعاون کی پیشکش قبول کر لی گئی ہوتی تو عملی مقاصد کے اعتبار سے مسلم لیگ پارٹی کانگریس میں ضم ہو گئی ہوتی۔ جواہر لال کے اس عمل نے یو۔ پی میں مسلم لیگ کو ایک نئی زندگی عطا کر دی ——— ہندستانی سیاسیات کے تمام طالب علم یہ جانتے ہیں کہ لیگ کی تنظیم نو یو۔ پی ہی سے ہوئی۔ مسٹر جناح نے موقعے کا پورا فائدہ اٹھایا اور ایک جارحانہ کارروائی شروع کر دی جس نے انجام کار پاکستان بنوایا۔

مجھے پتہ چلا کہ اس پورے قصے میں پرشوتم داس ٹنڈن نے ایک نمایاں حصہ لیا تھا۔ میرے دل میں ان کے نظریات کی زیادہ عزت نہیں تھی، لیکن جواہر لال کو میں نے اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے موقف میں ترمیم کر لیں۔ میں نے ان سے کہا کہ لیگ کو وزارت میں شامل نہ کر کے انھوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میں نے انھیں خبردار بھی کیا کہ ان کے اس فعل کے نتیجے میں مسلم لیگ میں ایک نئی جان آ جائے گی اور اس طرح ہندستانی آزادی کے راستے میں نئی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ جواہر لال نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا اور اسی پر قائم رہے کہ ان کا فیصلہ درست تھا ——— انھوں نے یہ دلیل دی کہ صرف چھبیس ممبروں کی طاقت پر مسلم لیگ کابینہ میں ایک سے زیادہ نشست کا دعوا نہیں کر سکتی تھی۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ جواہر لال نے ضد پکڑ لی ہے تو میں واردھا چلا گیا اور گاندھی جی سے صلاح مانگی۔ میں نے جب پوری صورت حال ان کے سامنے واضح کی تو وہ مجھ سے متفق ہو گئے اور کہا کہ جواہر لال کو وہ اپنے موقف میں ترمیم کا مشورہ دیں گے۔ مجھے یہ بات ریکارڈ کر دینی ہے کہ جواہر لال نے جب اس معاملے کو دوسرے رنگ میں پیش کیا تو گاندھی جی ان کا کہنا مان گئے اور معاملے پر اس طرح زور نہیں دیا جس طرح انھیں دینا چاہیے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یو۔ پی میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ مسٹر جناح نے صورت حال کا

پورا فائدہ اٹھایا اور پوری لیگ کو کانگریس کے خلاف کر دیا۔ انتخابات کے بعد، ان کے بہت سے حامی اس نقطے تک پہنچ گئے تھے کہ جناح سے الگ ہو جائیں، لیکن اب جناح کو انھیں اپنے حلقے میں شامل کرنے کا دوبارہ موقع مل گیا۔

۱۹۳۷ء کی غلطی خاصی بڑی تھی۔ ۱۹۴۶ء والی غلطی اس سے زیادہ مہنگی ثابت ہوئی۔ جواہر لال کے دفاع میں شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مسلم لیگ کی طرف سے براہ راست کارروائی کی توقع کبھی نہیں کی تھی۔ مسٹر جناح عوامی تحریک کے قائل کبھی نہیں تھے۔ میں نے خود یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ مسٹر جناح میں یہ تبدیلی کیوں کر آئی۔ شاید انھیں یہ امید تھی کہ جب مسلم لیگ نے کیبنیٹ مشن پلان کو مسترد کر دیا تو برطانوی حکومت پورے سوال کا نئے سرے سے جائزہ لے گی اور مزید مذاکرات ہوں گے۔ وہ متفق تھے اور شاید یہ سمجھتے تھے کہ اگر دوبارہ گفت گو ہوئی تو اپنے مطالبات پر زور دے کر وہ کچھ اور فائدہ حاصل کر لیں گے۔ بہر حال ان کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ برطانوی حکومت نے نئی بحثوں کی شروعات کے ذریعے مسٹر جناح کو مرہونِ منت نہیں کیا۔

اس پورے عرصے میں سر سٹیفرڈ کرپس سے میری خط و کتابت ہوتی رہی تھی۔ میں نے انھیں لکھا تھا کہ کیبنیٹ مشن نے کانگریس اور مسلم لیگ کے ساتھ دو مہینے سے زیادہ کی مدت تک گفت و شنید کی تھی اور بالآخر ایک پلان ترتیب دیا تھا جسے کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں نے منظور کر لیا تھا۔ یہ امر افسوس ناک تھا کہ لیگ اپنی پوزیشن سے الگ ہو گئی، مگر اس کی ذمے داری لیگ ہی پر عاید ہوتی تھی۔ پھر بھی اس کا یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہیے کہ سارا سوال پھر سے چھیڑا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ برطانیہ سے ہماری گفت و شنید کبھی بھی حتمی شکل اختیار نہیں کرے گی۔ رائے عامہ پر اس کا اثر نہایت خراب پڑے گا اور نئے مسئلے پیدا ہوں گے۔

سر اسٹیفرڈ کرپس نے جواب دیا کہ وہ مجھ سے متفق ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ حکومت بھی یہی رویّہ اپنائے گی۔ واقعات نے وہی رُخ اختیار کیا جیسی کہ مجھے توقع تھی۔ میں یہ

ذکر پہلے ہی کر چکا ہوں کہ ۱۲ راگست ۱۹۴۶ء کو وائسرائے نے ایک مراسلہ جاری کیا جس میں جواہر لال کو انٹرم حکومت بنانے کی دعوت دی گئی تھی۔

۱۷ راگست کو، ان ہنگاموں کے سائے میں جو کلکتہ اور بعض دوسرے مقامات پر برپا تھے، ہم دہلی میں یکجا ہوئے۔ ہمیں پتہ تھا کہ مسٹر جناح، جواہر لال کی طرف سے حکومت میں شامل ہونے کی دعوت غالباً قبول نہیں کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا جواب جس میں انھوں نے اس دعوت کو نامنظور کر دیا تھا، ۱۶ تاریخ کو ہی موصول ہو چکا تھا۔ جواہر لال نے اپنی تعاون کی پیشکش دوہرائی اور کہا کہ مسلم لیگ کے لیے دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ مگر جناح ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

(۱۴)

اِنٹرم حکومت

مَیں یہ بتا چکا ہوں کہ کانگریس نے انٹرم حکومت کی تشکیل کا کام پارلیمانی کمیٹی کے سپرد کر دیا تھا ——— چنانچہ جواہر لال، پٹیل، راجندر پرساد اور مَیں نے، ۱۷ تاریخ کو دہلی میں ملاقات کی۔ میرے ساتھیوں نے بہت زور دیا کہ مَیں انٹرم حکومت میں شامل ہو جاؤں — گاندھی جی کا خیال بھی یہی تھا۔ میرے لیے یہ ایک نازک سوال تھا۔ مگر توجہ کے ساتھ غور و فکر کے بعد مَیں اسی نتیجے تک پہنچا کہ مجھے (حکومت سے) باہر رہنا چاہیے۔ اسی لیے، مَیں نے یہ صلاح دی کہ آصف علی کو کابینہ میں لے لیا جائے۔ جب آصف علی نے یہ سُنا تو انھوں نے بھی زور دیا کہ مجھے شامل ہو جانا چاہیے، لیکن مَیں راضی نہیں ہوا۔ میرے بہت سے دوستوں کا اس وقت یہ خیال تھا، اور آج بھی ہے، کہ میرا یہ فیصلہ غلط تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ملک کے مفاد، اور ہم جس نازک دَور سے گزر رہے تھے، دونوں اس امر کے طالب تھے کہ مَیں حکومت میں شامل ہو جاؤں۔ اسی وقت سے مَیں اس معاملے پر غور کرتا رہا ہوں اور آج مَیں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔ اگر مَیں حکومت میں شامل ہو گیا ہوتا اور اس سے باہر نہ رہتا تو ہو سکتا ہے کہ مَیں نے ملک کی مدد زیادہ کی ہوتی۔ اس وقت مَیں یہ سوچتا تھا کہ باہر رہ کر مَیں زیادہ خدمت کر سکتا ہوں، لیکن اب مَیں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس وقت حکومت کی رکنیت وسیع تر میدان فراہم کرتی تھی۔

شملہ کانفرنس کے موقعہ پر، مَیں نے کابینہ میں ایک پارسی کی شمولیت پر بہت زور دیا تھا۔ اب، جبکہ کانگریس حکومت بنا رہی تھی، مَیں نے اپنی رائے کو منوانے کے لیے دباؤ ڈالا۔ کچھ بحث کے بعد یہ ساتھی رضامند ہو گئے۔ چونکہ پارسی فرقے کا ارتکاز بمبئی میں تھا، ہم نے سوچا کہ سردار پٹیل پارسی نمائندے کے انتخاب میں مشورہ دینے کی بہتر پوزیشن میں ہیں۔ چنانچہ یہ انتخاب ہم نے انہی پر چھوڑ دیا اور کچھ عرصہ بعد انھوں نے مسٹر سی، ایچ، بھابھا کا نام تجویز کیا۔

بعد کو ہمیں پتہ چلا کہ مسٹر بھابھا سردار پٹیل کے بیٹے کے دوست تھے، اور کسی بھی لحاظ سے انھیں ایک لیڈر، حتیٰ کہ پارسی فرقے کا ایک سچا نمائندہ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ہمارا انتخاب غلط ثابت ہوا اور کچھ عرصے بعد وہ حکومت سے علاحدہ ہو گئے۔

ہم نے یہ بھی طے کیا کہ حکومت کو پہلے ہندستانی ممبر مالیات کی حیثیت سے کسی تجربہ کار ماہر اقتصادیات کو شامل کرنا چاہیے۔ ہم نے ڈاکٹر جان متھائی کا انتخاب کیا اگرچہ وہ کسی بھی معنی میں کانگریسی نہیں تھے ——— واقعہ یہ ہے کہ انٹرم حکومت کی تشکیل کے وقت پارٹی کے لوگوں کی شمولیت پر کوئی بے لوچ اصرار نہیں تھا۔

مسلم لیگ کو نہ صرف یہ کہ مایوسی ہوئی، وہ مشتعل بھی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ انگریزوں نے اسے دھوکا دیا ہے۔ اس نے دلی میں اور بعض دوسرے مقامات پر ایک زبردست مظاہرہ کرنے کی کوشش کی مگر اس کی کوششیں ناکامیاب رہیں ——— غرضیکہ پورے ملک میں تلخی اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور لارڈ ویول یہ سوچتے تھے کہ انھیں لیگ کو حکومت میں شامل ہونے پر آمادہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے مسٹر جناح کو بلوایا، جو دلی آئے اور ان سے کئی ملاقاتیں کیں ——— انجام کار، ۱۵ اکتوبر کو مسلم لیگ نے انٹرم حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا۔

اس عرصے میں، لارڈ ویول سے میں متعدد بار ملا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ تاوقتیکہ لیگ حکومت میں شامل ہو جائے، کیبینیٹ مشن پلان کو جاری رکھنے کا منصوبہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ انھوں نے یہ نشاندہی کی کہ فرقہ وارانہ بدامنی کا سلسلہ قائم ہے اور جب تک لیگ حکومت میں شامل نہیں ہو جاتی، اس کا امکان ہے کہ یہ سلسلہ برقرار رہے گا۔ مَیں نے ان سے کہا کہ

مسلم لیگ کے اشتراک پر کانگریس کی جانب سے کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا ہے۔ دراصل، میں نے متعدد بار لیگ سے حکومت میں آنے کا اصرار کیا تھا۔ جواہر لال نے حکومت میں شامل ہونے سے قبل بھی اور بعد کو بھی، مسٹر جناح کے نام تعاون کی ایک اپیل جاری کی۔

اسی موڑ پر، میں نے ایک اور بیان شائع کیا جس میں یہ نشاندہی کی تھی کہ کیبنٹ مشن کی تجویز نے مسلم لیگ کے تمام جائز اندیشوں کو رفع کر دیا ہے۔ اس نے مسلم لیگ کو دستور ساز اسمبلی میں کام کرنے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی پوری آزادی دی ہے۔ اس لیے، لیگ کے پاس دستور ساز اسمبلی کے بائیکاٹ کا کچھ بھی جواز نہیں ہے۔ جب میں اگلی بار لارڈ ویول سے ملا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ انھیں میرا موقف نہایت پسند آیا تھا اور انھوں نے میرے بیان کی ایک نقل لیاقت علی کو اس گزارش کے ساتھ بھجوائی تھی کہ وہ اسے مسٹر جناح کو دکھا دیں۔ یہ بیان پچھلے باب میں نقل کیا جا چکا ہے۔

مجھے اس موقع پر چند الفاظ اُن لوگوں کے بارے میں کہنے ہیں جنھیں مسٹر جناح نے مجلس منتظمہ (کونسل) کے لیے نامزد کیا تھا، لیاقت علی خاں کے علاوہ، مسلم لیگ کے سب سے اہم اور تجربہ کار لیڈر بنگال کے خواجہ ناظم الدین اور یو۔پی کے نواب اسمٰعیل خاں تھے۔ یہ ایک طے شدہ بات تھی کہ اگر کبھی لیگ نے اقتدار میں آنا قبول کیا تو یہ تین افراد ان لوگوں میں ضرور شامل ہوں گے جنھیں لیگ نامزد کرے گی۔ شملہ کانفرنس کے دَوران بھی وہ نام تھے جن کا ذکر بار بار آتا تھا۔ اب جبکہ لیگ نے کابینہ میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا تھا، مسٹر جناح نے ایک انتہائی عجیب و غریب انداز اختیار کر لیا۔ کانگریس اور لیگ کے جھگڑوں میں خواجہ ناظم الدین اور نواب اسمٰعیل خاں نے کبھی بھی انتہا پسندی کا رویّہ نہیں اپنایا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے جناح ناخوش ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ ہاں میں ہاں ملانے والے نہیں ہوں گے اور اسی لیے انھوں نے ان کو اپنی فہرست سے الگ رکھنے کا فیصلہ کیا۔

اگر اس واقعے کا پتہ پہلے سے چل گیا ہوتا تو بہر حال، لیگ کونسل میں اس کی وجہ سے ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے لیگ کونسل کو ترغیب دی کہ ایک قرارداد منظور کر کے تمام اختیارات انھیں سونپ دیے جائیں۔

جب انھوں نے لارڈ ویول کو اپنی فہرست پیش کی تو جو نام انھوں نے شامل کیے وہ لیاقت علی، آئی۔ آئی۔ چندریگر، عبدالرب نشتر، غضنفر علی اور جوگندر ناتھ منڈل کے تھے۔ مجھے جے۔ این۔ منڈل کے بارے میں ایک بات الگ سے کہنی ہے۔ لیگ کے نامزد شدہ دوسرے تینوں افراد قطعاً غیر معروف تھے۔ ان کی حیثیت (ایک انگریزی محاورے کے مطابق) کالے گھوڑوں کی تھی، جن کے بارے میں لیگ کے اراکین کی اطلاعات بھی بہت محدود تھیں۔ بہر حال، یہ صحیح ہے کہ لیگ نے کبھی کسی سیاسی جدوجہد میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اور اس طرح، قومی اہمیت کے حامل گنتی کے چند لیڈر اس کے پاس تھے۔ تاہم، اس کے اراکین میں خواجہ ناظم الدین اور نواب اسمٰعیل خان جیسے تجربہ کار منتظم ضرور تھے۔ ان سب کو مسٹر جناح کے تین معتمدوں کی خاطر الگ کر دیا گیا۔

۲۵ر اکتوبر کو انٹرم حکومت کے مسلم لیگی اراکین کے ناموں اور اسی کے ساتھ ساتھ اُن کے سپرد کیے جانے والے پورٹ فولیوز کا اعلان کیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین، نواب اسمٰعیل خاں اور دوسرے مسلم لیگی لیڈر امپیریل ہوٹل میں بے چینی کے ساتھ اعلان کے منتظر تھے۔ انھیں اپنی شمولیت کا پورا یقین تھا اور اسی طرح ان کے حامیوں کو بھی تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ کے ممبروں کی ایک بڑی تعداد پھولوں کے ہار اور گلدستے لے کر آئی تھی۔ جب ناموں کا اعلان ہوا اور ان میں سے کوئی بھی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا، تو اُن کی مایوسی اور خفگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسٹر جناح نے ان کی امیدوں پر ٹھنڈا ٹخ پانی انڈیل دیا تھا۔

ایک اس سے بھی زیادہ مضحک بات جو مسلم لیگ نے کی، وہ اس کی فہرست میں جوگندر ناتھ منڈل کی شمولیت تھی ——— * کانگریس نے مجلس منتظمہ میں ہندو، مسلم، سکھ، پارسی، شیڈیولڈ کاسٹ اور عیسائی اراکین نامزد کیے تھے، لیکن وہ حدود جن میں رہتے ہوئے اسے کام کرنا پڑتا تھا، وہ شیڈیولڈ کاسٹ کے صرف ایک نمائندے کو شامل کر سکتی تھی۔ مسلم لیگ نے سوچا کہ شیڈیولڈ کاسٹ کے ایک اور نمائندے کو نامزد کر کے وہ کانگریس کو شرمندہ کر دے گی اور اس طرح یہ ثابت کر دے گی کہ کانگریس کے مقابلے میں وہ شیڈیولڈ کاسٹ والوں کی زیادہ گہری دوست ہے ——— * مسٹر جناح کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اُن کا یہ اقدام

ان کے اس پچھلے دعوے سے مطابقت نہیں رکھتا کہ کانگریس کو صرف ہندو نامزد کرنے چاہئیں اور مسلم لیگ کو صرف مسلمان ——— علاوہ ازیں نامزدگی کے لیے انھوں نے جو انتخاب کیا اس سے لوگ محظوظ بھی ہوئے اور ناراض بھی ——— بنگال میں جب مسٹر سہروردی نے ایک مسلم لیگ وزارت بنائی، تو ان کی وزارت میں شامل ہونے والے واحد غیر مسلم مسٹر جوگندر ناتھ منڈل تھے۔ اس وقت وہ بنگال میں تقریباً غیر معروف تھے اور کل ہند سیاست میں تو خیر ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ لارڈ ویول اس سلسلے میں کیا سوچتے تھے مگر، چونکہ وہ مسلم لیگ کی طرف سے نامزد کیے گئے تھے، انھیں ممبر قانون بنا دیا گیا۔ حکومت ہند کے زیادہ تر سکریٹری انگریز تھے۔ مسٹر منڈل کا بھی ایک انگریز سکریٹری تھا جو تقریباً ہر روز شکایت کرتا تھا کہ مسٹر منڈل جیسے کسی ممبر کے ساتھ کام کرنا محال تھا۔

اب، جبکہ لیگ حکومت میں شامل ہونے پر رضامند ہو گئی تھی، کانگریس کو پھر سے حکومت کی تشکیل کرنی اور لیگ کے نمائندوں کے لیے جگہ نکالنی تھی، ہمیں یہ طے کرنا تھا کہ حکومت سے الگ کون ہو۔ یہ سوچا گیا کہ مسٹر سرت چندر بوس، سر شفاعت احمد خاں اور سید علی ظہیر مستعفی ہو جائیں تاکہ لیگ کے نامزدگان کے لیے گنجائش پیدا کی جا سکے۔ پورٹ فولیوز کے سلسلے میں، لارڈ ویول کی تجویز یہ تھی کہ اہم پورٹ فولیوز میں سے ایک لیگ کے نمائندے کو چلا جانا چاہیے۔ ان کا اپنا مشورہ یہ تھا کہ ہم داخلی امور کے محکمے سے دست بردار ہو جائیں، لیکن سردار پٹیل جو ممبر داخلہ تھے، انھوں نے شد و مد کے ساتھ تجویز کی مخالفت کی۔ میرا خیال یہ تھا کہ قانون اور امن کا مسئلہ اصلاً ایک صوبائی امر تھا۔ کیبنیٹ مشن پلان میں جو خاکہ بنایا گیا تھا، اس کے مطابق اس میدان میں مرکز کو برائے نام ہی کچھ کرنا تھا۔ چنانچہ، نئے نظام میں، مرکز میں وزارت داخلہ کی اہمیت بہت زیادہ نہیں ہوگی۔ اسی لیے میں لارڈ ویول کی تجویز کو قبول کرنے کے حق میں تھا۔ لیکن سردار پٹیل اڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم نے اصرار کیا تو وہ محکمۂ داخلہ کو چھوڑنے کے بجائے حکومت سے دست بردار ہو جائیں گے۔

تب ہم نے متبادل صورتوں پر غور کیا۔ رفیع احمد قدوائی نے تجویز کیا کہ ہمیں مسلم لیگ کو مالیات کے پورٹ فولیو کی پیش کش کرنی چاہیے۔ بے شک یہ سب سے اہم محکموں میں سے

ایک تھا، مگر یہ معاملہ بہت تکنیکی نوعیت کا تھا اور لیگ کا کوئی ممبر ایسا نہیں تھا جو موثر طریقے سے اس کو سنبھال سکے ——— قدوائی کا خیال تھا کہ اس کام کے تکنیکی مزاج کی وجہ سے لیگ اس پیشکش کو نامنظور کردے گی۔ اگر ایسا ہوا تو کانگریس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا ——— برخلاف اس کے، اگر لیگ کے نامزد شدہ رکن نے مالیات کا پورٹ فولیو قبول کرلیا تو جلد ہی وہ اپنے آپ کو بے وقوف بنالے گا ——— دونوں صورتوں میں کانگریس کا ہی فائدہ تھا۔

سردار پٹیل اس تجویز پر اچھل پڑے اور اس کی تائید انتہائی زور و شور کے ساتھ کی ——— میں نے یہ نشاندہی کرنے کی کوشش کی کہ مالیات کا محکمہ حکومت کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے اور اگر اسے لیگ کے اختیار میں دے دیا گیا تو ہمیں بہت بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا ——— سردار پٹیل نے جواب میں یہ کہا کہ لیگ مالیات کو سنبھال نہیں سکے گی اور اسے یہ پیشکش نامنظور کرنی پڑے گی۔ میں نے اس فیصلے پر خوشی نہیں محسوس کی، لیکن چونکہ دوسرے سبھی راضی تھے، میں نے بھی تسلیم کرلیا۔ چنانچہ وائسرائے کو مطلع کردیا گیا کہ مالیات کی پیش کش کانگریس لیگ کے نامزد شدہ رکن کو کرے گی۔

لارڈ ویویل نے جب یہ اطلاع مسٹر جناح کو دی تو انھوں نے کہا کہ وہ اگلے روز اس کا جواب دیں گے ——— ایسا لگتا ہے کہ پیش کش کے بارے میں پہلے پہل مسٹر جناح کو کسی قدر تذبذب تھا۔ انھوں نے کابینہ میں خاص نمائندے کے طور پر لیاقت علی کو نامزد کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن انھیں اس میں شک تھا کہ لیاقت مالیات کو مناسب طریقے سے سنبھال سکیں گے۔ محکمۂ مالیات کے کچھ مسلمان افسروں نے یہ خبر سنی اور انھوں نے فوراً ہی مسٹر جناح سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے اُن سے کہا کہ کانگریس کی یہ پیش کش واقعتاً ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی اور لیگ کی ایک عظیم کامیابی کی نشاندہی کرتی تھی۔ انھوں نے کبھی بھی یہ توقع نہیں کی تھی کہ کانگریس مالیات کا شعبہ مسلم لیگ کے حوالے کرنے پر راضی ہو جائے گی۔ محکمۂ مالیات پر اختیار کے ساتھ، حکومت کے ہر محکمے میں دخیل ہو جائے گی۔ انھوں نے مسٹر جناح کو یقین دلایا کہ انھیں کسی طرح کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ وہ مسٹر لیاقت علی کی ہر طرح مدد کریں گے اور اس کا خیال رکھیں گے کہ وہ اپنے فرائض موثر طور پر انجام دے سکیں۔ مسٹر جناح نے تجویز

منظور کرلی، چنانچہ لیاقت علی ممبر مالیات بن گئے۔ جلد ہی کانگریس نے یہ جان لیا کہ مالیات کو مسلم لیگ کے حوالے کر کے اس نے ایک زبردست غلطی کی ہے۔

تمام ممالک میں مالیات کا نگراں وزیر حکومت میں ایک کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ ہندستان میں اس کی پوزیشن اور بھی زیادہ اہم تھی کیونکہ برطانوی حکومت ممبر مالیات کو اپنے مفادات کا محافظ سمجھتی تھی۔ یہ ایک ایسا پورٹ فولیو تھا جو ہمیشہ کسی انگریز کے اختیار میں رہا جسے اسی مقصد کے لیے خاص طور پر ہندستان لایا جاتا تھا۔ ممبر مالیات ہر محکمے میں مداخلت کر سکتا تھا اور پالیسی طے کر سکتا تھا۔ لیاقت علی جب ممبر مالیات بن گئے تو ایک طرح سے حکومت کی کلیدان کے قبضے میں آگئی۔ ان کے محکمے کو ہر محکمے کی ہر تجویز کی چھان بین کا اختیار تھا۔ مزید براں انھیں کسی بھی تجویز کو نامنظور کرنے کا اختیار بھی تھا۔ کسی شعبے میں ایک چپراسی بھی ان کے محکمے کی منظوری کے بغیر مقرر نہیں کیا جاسکتا تھا۔

سردار پٹیل کو امور داخلہ (ہوم ممبر شپ) اپنے پاس رکھنے کی بڑی فکر تھی۔ اب انھیں یہ احساس ہوا کہ مالیات کی پیش کش کر کے اب وہ لیگ کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ جو بھی وہ تجویز رکھتے، لیاقت علی کے ذریعہ یا تو وہ مسترد کر دی جاتی یا اس میں اتنی ترمیم کر دی جاتی کہ اسے پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ ان کی متواتر مداخلت نے کسی بھی کانگریس ممبر کے لیے مؤثر طور پر کام کرنا مشکل بنا دیا۔ حکومت کے اندر مقامی اختلافات چھڑ گئے اور ان میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ انٹرم حکومت کی پیدائش کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین شک اور بے اعتباری کے ایک ماحول میں ہوئی تھی۔ لیگ کے حکومت میں شامل ہونے سے پہلے ہی کانگریس پر اس کی بے اعتباری نے نئی مجلس منتظمہ کی تشکیل پر اثر ڈالا تھا۔ جب ستمبر ۱۹۴۶ء میں کونسل کا قیام عمل میں آیا، ایک سوال یہ اٹھا کہ دفاع کا چارج کس کے سپرد کیا جائے۔ یہ بات سب کو یاد رہے گی کہ دفاع کے پورٹ فولیو پر اختلاف کرپس مشن کی ناکامیوں کے اسباب میں سے ایک تھا۔ کانگریس چاہتی تھی کہ یہ شعبہ اس کے اپنے بھروسے کے کسی شخص کے ہاتھ میں ہو، لیکن لارڈ ویول کا کہنا تھا کہ اس سے مشکلات پیدا ہونے کا امکان ہے۔

وہ دفاع کو فرقہ وارانہ سیاست سے مکمل طور پر باہر رکھنا چاہتے تھے۔ اگر کسی کانگریسی ممبر کو دفاع کا چارج دے دیا جائے تو اس سے لیگ کو بے بنیاد الزامات عاید کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بات بھی صاف کر دی کہ وہ مسلم لیگ کے کسی رکن کو بھی، خواہ لیگ اقتدار میں آجائے، تب بھی دفاع کا چارج دینے پر راضی نہیں ہوں گے۔ اُن کا مشورہ یہ تھا کہ ممبر دفاع کو تو ہندو ہونا چاہیے نہ مسلمان۔ اس وقت بلدیو سنگھ پنجاب میں وزیر تھے اور لارڈ ویول کی تجویز پر ہم نے یہ مان لیا کہ انہی کو دفاع کا چارج دے دیا جائے۔

یہاں میں ایک اور چھوٹے سے واقعے کا ذکر یہ دکھانے کے لیے کروں گا کہ شک اور بے اعتباری کا احساس مسلم لیگ کے نامزد شدہ لوگوں میں کتنی دُور تک گھر کر چکا تھا۔ انٹرم حکومت کی تشکیل کے بعد یہ طے پایا تھا کہ کابینہ کی رسمی میٹنگوں سے پہلے، تمام ممبر غیر رسمی طور پر ملا کریں گے۔ یہ خیال کیا گیا کہ اگر ممبر آپس میں ہی غیر رسمی گفت و شنید کر لیا کریں گے تو اس رسم کے قائم ہوتے ہیں مدد ملے گی کہ وائسرائے صرف ایک آئینی سربراہ ہے۔ یہ رسمی میٹنگیں باری باری سے کونسل کے مختلف ممبران کے کمروں میں ہوا کرتی تھیں، لیکن اکثر جواہر لال ممبروں کو چائے پر مدعو کیا کرتے تھے۔ عام طور پر دعوت نامے جواہر لال کے پرائیویٹ سکریٹری کے ذریعہ بھیجے جاتے تھے۔ مسلم لیگ کے کابینہ میں شامل ہو جانے کے بعد، پرائیویٹ سکریٹری کی ہی طرف سے یہ عام دعوت نامہ کونسل کے تمام ممبروں کو بھیجا گیا جن میں مسلم لیگ کے نامزد شدگان بھی شامل تھے۔ لیاقت علی کو اس پر سخت اعتراض ہوا اور انھوں نے کہا کہ اس بات پر انھیں اپنی ہتک کا احساس ہوا ہے کہ جواہر لال کا سکریٹری انھیں چائے کے لیے مدعو کرے۔ علاوہ ازیں انھیں اس سے اتفاق نہیں کہ کونسل کے نائب صدر کی حیثیت سے جواہر لال کو اس بات کا کوئی حق پہنچتا ہے کہ وہ اس طرح کی غیر رسمی میٹنگیں کریں۔ گرچہ لیاقت علی نے جواہر لال کو تو یہ حق نہیں دیا، لیکن مسلم لیگ کے نامزد کیے گئے ممبروں کے ساتھ وہ خود اس طرح کی میٹنگیں کرنے لگے۔ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم لیگ کے نمائندے کانگریس کے ساتھ اپنے عدم تعاون میں کتنی دور تک جانے پر آمادہ تھے۔

اکتوبر کے نصف آخر میں، جواہر لال نے ایک ایسا قدم اُٹھایا جو غیر ضروری تھا اور میں نے اس وقت جس کی مخالفت کی تھی۔ بالعموم وہ دوسروں کی بات سننے کے لیے اپنے ذہن کو کھلا رکھتے ہیں، مگر کبھی کبھی تمام پہلوؤں پر غور کیے بغیر وہ کوئی بات طے کر لیتے ہیں۔ ایک بار وہ ایسا کر لیں، تو پھر عواقب کی پروا کیے بغیر وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔

شمال مغربی سرحدی صوبے میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت تھی۔ ۱۹۳۷ء میں اور پھر ۱۹۴۶ء سے وہاں وزارت پر کانگریس کا غلبہ تھا۔ اس خوش آیند صورت حال کے لیے، بالخصوص خان عبدالغفار خاں اور ان کے خدائی خدمت گار ذمے دار تھے۔ دراصل، صوبۂ سرحد سے متعلق تمام معاملات میں ہم خان عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب پر بھروسہ کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ گاندھی جی کبھی کبھی مذاق میں کہتے تھے کہ سرحد سے متعلق سوالات پر اُن کے اپنے (گاندھی جی کے) ضمیر کے نگراں یہی خان برادران ہیں۔

انٹرم حکومت بننے کے بعد جلد ہی، جواہر لال نے جنوبی وزیرستان میں قبائلیوں پر ہوائی بمباری کو روکنے کے احکامات جاری کر دیے ——— اس اثنا میں ان تک یہ سرکاری اطلاعات پہنچ رہی تھیں کہ سرحد کے لوگوں کا بہت بڑا حصہ کانگریس اور خان بھائیوں کا مخالف ہے۔ مقامی دفاتر بار بار یہ کہتے تھے کہ کانگریس مقامی حمایت سے بڑی حد تک محروم ہو چکی ہے اور لوگوں نے اپنی وفاداریاں کانگریس سے ہٹا کر لیگ کو منتقل کر دی ہیں۔ جواہر لال کا خیال تھا کہ یہ اطلاعات صحیح نہیں ہیں اور انھیں انگریز افسروں نے گڑھا ہے جو کانگریس کے مخالف تھے۔ لارڈ ویول جواہر لال سے متفق نہیں تھے، ہر چند کہ انھوں نے سرکاری اطلاعات کو بھی جوں کا توں قبول نہیں کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سرحد، کم و بیش یکساں طور پر خان بھائیوں اور مسلم لیگ کے مابین منقسم ہے۔ کانگریسی حلقوں میں یہ تاثر تھا کہ عوام کی زبردست اکثریت خان بھائیوں کے ساتھ ہے۔ جواہر لال نے کہا کہ وہ سرحد کا دورہ کریں گے اور صورت حال کا خود جائزہ لیں گے۔

جب مَیں نے یہ سُنا تو، مَیں نے جواہر لال سے کہا کہ انھیں کوئی عجلت پسندانہ کارروائی نہیں کرنی چاہیے۔ اس کا پتہ لگانا مشکل تھا کہ صوبۂ سرحد کی واقعی صورت حال کیا ہے۔

ہر صوبے میں گٹ بندیاں تھیں، چنانچہ خان بھائیوں کے خلاف بھی لازمی طور پر ایک حلقہ رہا ہوگا۔ جواہر لال نے حال ہی میں اپنا منصب سنبھالا تھا اور ابھی تک اپنی پوزیشن کو مستحکم نہیں کر سکے تھے۔ اس منزل پر ان کا سرحد کا دورہ مخالف عناصر کو یہ موقع دے سکتا تھا کہ وہ کانگریس کی مخالفت میں لوگوں کو منظم کریں۔ چونکہ سرکاری ملازمین کی اکثریت کانگریس کے خلاف تھی، اس لیے اگر وہ اُن مخالف عناصر کی سرگرم حمایت نہ بھی کرتے، تب بھی ان کی ہمدردیاں تو انہی کے ساتھ ہوتیں ——— چنانچہ بہتر یہی ہوگا کہ وہ ایک مناسب تر وقت تک کے لیے اپنا دورہ ملتوی کر دیں۔ گاندھی جی نے بھی میرے خیال کی تائید کی لیکن جواہر لال مصر رہے اور یہ کہا کہ نتائج جو کچھ بھی ہوں، وہ ضرور جائیں گے۔

خان برادران یہ دعوا کرنے میں بے شک حق بجانب تھے کہ سرحد کے عوام کا ایک بہت بڑا حصہ اُن کی حمایت کرتا ہے۔ تاہم، انھوں نے اپنے اثر کے حدود کے اندازے میں مبالغے سے کام لیا تھا۔ یہ فطری تھا، کیونکہ عام طور پر ہر شخص اپنی بساط کو حقیقت سے زیادہ سمجھتا ہے۔ شاید وہ بھی ہم پر یہ تاثر جمانا چاہتے تھے کہ (ایسے وقت میں) جبکہ دوسرے صوبوں میں اختلافات ہیں، سرحد پوری طرح کانگریس کے ساتھ ہے ——— واقعہ یہ ہے کہ بہر نوع، ایک خاصہ طاقت ور حلقہ خان بھائیوں کا مخالف تھا۔ وزیرِ اعلا کی حیثیت سے ڈاکٹر خان صاحب کے دورِ اقتدار نے اس مخالفت کو مزید تقویت عطا کی تھی۔ انھیں پورے صوبے کو جیتنے کا موقع حاصل تھا، مگر ان سے چند غلطیاں سرزد ہوئیں جنھوں نے ان کے مخالفین کی طاقت بڑھا دی۔

ان میں سے بعض غلطیاں خالصتاً شخصی اور سماجی نوعیت کی تھیں۔ سرحدی پٹھان اپنی میزبانی کے لیے مشہور ہے۔ وہ اپنی روٹی کا آخری ٹکڑا بھی مہمان کے ساتھ بانٹنے پر تیار رہتا ہے اور اس کا دسترخوان سب کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے بھی، خاص طور پر ان لوگوں سے جنھیں معاشرے میں کوئی اونچا مرتبہ حاصل ہو، ایسی ہی میزبانی کی توقع رکھتا ہے۔ کسی پٹھان کو لوگوں سے کوئی چیز اس طرح الگ نہیں کرتی جتنی کہ کنجوسی اور فیاضی کا نہ ہونا۔ بدقسمتی سے یہی وہ معاملہ تھا جس میں خان برادران اپنے مقلدوں کی توقعات سے بہت کم تر ثابت

ہوئے۔

خان برادران دولت مند تھے مگر بدقسمتی سے ان کے مزاج میں کنجوسی تھی۔ وہ مشکل ہی سے کسی کو کبھی کھانے پر مدعو کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر لوگ ان کے یہاں چائے یا کھانے کے وقت آجاتے، تب بھی انھیں کھانے کے لیے رُکنے کو کبھی نہیں کہا جاتا تھا۔ ان کے بخل کا حلقہ ان رقوم تک بھی پھیلا ہوا تھا جو انھیں (قومی کاموں کے لیے) دوسروں سے موصول ہوتی تھیں۔ عام انتخابات کے دوران کانگریس نے ان کے اختیار میں خاصی بڑی رقمیں دے رکھی تھیں، مگر خان بھائیوں نے اس میں سے بھی جتنا کم ممکن ہو سکتا تھا، وہی خرچ کیا۔ بہت سے امیدوار انتخابات میں روپے کی کمی کے باعث مارے گئے۔ بعد کو جب انھیں معلوم ہوا کہ خان بھائیوں کے پاس رقوم بیکار پڑی ہوئی تھیں تو وہ لوگ ان کے سخت دشمن بن گئے۔

ایک موقع پر پشاور سے ایک بہت بڑا وفد الیکشن کی رقوم کے سلسلے میں مجھ سے ملاقات کے لیے کلکتے آیا۔ چونکہ وہ چائے کا وقت تھا، میں نے انھیں چائے اور بسکٹ پیش کیے۔ وفد کے کئی اراکین نے بسکٹوں کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ ایک شخص نے ایک بسکٹ اٹھایا اور مجھ سے اس کا نام پوچھا۔ ایسا لگتا تھا کہ بسکٹ انھیں پسند آئے تھے، اور پھر انھوں نے مجھے بتایا کہ ایسے ہی بسکٹ انھوں نے خان صاحب کے گھر پر دیکھے تھے لیکن انھوں نے ان میں سے کسی کو کبھی یہ بسکٹ حتیٰ کہ چائے کی ایک پیالی بھی پیش نہیں کی تھی۔

۱۹۴۶ء میں حقیقی صورت حال یہ تھی کہ خان بھائیوں کو سرحد میں اتنی حمایت حاصل نہیں تھی جتنی کہ ہم دلی میں (بیٹھے ہوئے) سوچتے تھے۔ جواہر لال جب پشاور پہنچے تو ان پر یہ انکشاف ایک ناخوش گوار صدمے کے ساتھ ہوا —— اس وقت ڈاکٹر خان صاحب صوبے کے وزیر اعلا تھے اور ان کی وزارت ایک کانگریسی وزارت تھی۔ میں یہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ انگریز افسران کانگریس کے خلاف تھے اور اس وزارت کے خلاف انھوں نے عام طور پر لوگوں کو اکسا رکھا تھا۔ جواہر لال جس وقت ہوائی اڈے پر اترے تو انھوں نے دیکھا کہ ہزاروں پٹھان وہاں جمع ہیں اور مخالفانہ نعرے لگا رہے ہیں۔ ڈاکٹر خان صاحب اور دوسرے وزرا، جو جواہر لال کا استقبال کرنے کے لیے آئے تھے، وہ خود پولیس کی حفاظت میں تھے اور پوری طرح غیر موثر ثابت ہوئے۔ جیسے ہی

جواہر لال باہر نکلے، ان کے خلاف نعرے لگائے گئے اور ہجوم میں سے کچھ لوگوں نے اُن کی کار پر حملہ کرنا چاہا۔ ڈاکٹر خان صاحب اتنے پریشان ہوئے کہ انھوں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور گولی چلانے کی دھمکی دی ——— اس دھمکی کی وجہ سے ہی ہجوم نے راستہ دیا اور کاریں پولیس کی حفاظت میں باہر نکل سکیں۔

اگلے روز جواہر لال پشاور سے، قبائلی علاقوں کے دورے کی غرض سے روانہ ہو گئے۔ انھوں نے ہر جگہ لوگوں کے ایک بڑے حصّے کو اپنا مخالف پایا۔ زیادہ تر وزیرستان کے 'ملک' ان کے خلاف مظاہرں کے ذمّے دار تھے۔ بعض مقامات پر، ان کی کار پر پتھر پھینکے گئے اور ایک پتھر جواہر لال کی پیشانی پر آ لگا۔ ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے ساتھی مکمل طور پر بے بس نظر آتے تھے اور جواہر لال نے صورتحال کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ انھوں نے نہ تو کمزوری دکھائی نہ خوف اور انتہائی ہمّت کا مظاہرہ کیا۔ ان کے جرأت مندانہ انداز نے پٹھانوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کی واپسی کے بعد، لارڈ ویول نے اس پورے معاملے پر اظہارِ افسوس کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ افسروں کے رویّے کی ایک انکوائری ہونی چاہیے ——— جواہر لال ان کے خلاف کسی کارروائی پر رضامند نہیں ہوئے۔ اس سے لارڈ ویول انتہائی متاثر ہوئے اور میں نے بھی جواہر لال کے موقف کو سراہا۔

* مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو طویل مدّتی اور کم مدّتی انتظامات، دونوں کی بابت قبول کیا تھا۔ دراصل، مسٹر جناح نے شاید یہ سوچا تھا کہ چونکہ کانگریس نے انٹرم حکومت کی تجاویز مسترد کر دی تھیں، جب کہ مسلم لیگ نے دونوں کو تسلیم کر لیا تھا، اس لیے انھی کو حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی۔ اس لیے، جب وائسرائے نے یہ بیان دیا کہ چونکہ ایک نمائندہ انٹرم حکومت کی تشکیل کے لیے مذاکرات ناکام ہو گئے تھے، اور اب وہ حکومت کے ملازمین پر مشتمل ایک عارضی نگہبان حکومت ترتیب دیں گے اور دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے بعد انٹرم حکومت کی تشکیل کے لیے مذاکرات پھر سے شروع کریں گے، تو انھیں (مسٹر جناح کو) بہت غصّہ آیا ——— وائسرائے نے اس امر پر اپنی خوشی ظاہر کی کہ آئین سازی کا سلسلہ دونوں اہم پارٹیوں، اور ریاستوں کی رضامندی کے ساتھ آگے بڑھ سکتا تھا ——— قارئین کو یاد ہو گا کہ اس کے

بعد جلد ہی، کسی طرح، جواہر لال نے بمبئی میں ایک بیان دیا تھا جس کی وجہ سے جناح کو یہ موقعہ مل گیا تھا کہ وہ کیبنیٹ مشن پلان تمام و کمال مسترد کر دیں۔ اسی کے نتیجے میں لیگ کے ممبروں نے دستور ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اب کانگریس جو کچھ بھی کرتی تھی لیگ عام طور پر اس کی مخالف ہوتی تھی ؎

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے ابتداءً کیبنیٹ مشن پلان منظور کر لیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی (کی تجویز) بھی دونوں نے قبول کر لی تھی۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق تھا، وہ ابھی تک کیبنیٹ مشن پلان کے حق میں تھی۔ کانگریس کی طرف سے واحد اعتراض آسام کے بعض لیڈروں نے اٹھایا۔ ان پر بنگالیوں کا ایک ناقابلِ فہم خوف مسلّط تھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر بنگال اور آسام کو ایک گروپ میں رکھ دیا گیا تو پورے علاقے پر مسلمانوں کا غلبہ ہو جائے گا۔ یہ اعتراض آسام کے لیڈروں نے کیبنیٹ مشن کی طرف سے اس کے پلان کا اعلان ہونے کے فوراً بعد ہی اٹھایا تھا۔ گاندھی جی نے شروع میں پلان کو قبول کر لیا تھا اور اعلانیہ یہ کہا تھا کہ کیبنیٹ مشن پلان کی تجویز میں وہ بیج بھی شامل ہے جو اس ارضِ المحن کو ذیتوں اور آلام سے آزاد سرزمین میں بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ (اپنے اخبار) ہریجن میں انھوں نے مزید کہا کہ برطانوی حکومت کی جانب سے وائسرائے اور کیبنیٹ مشن کے ذریعہ جاری کردہ اعلان نامے پر چار روز کے گہرے غور و خوض کے بعد مجھے یقین ہو چلا ہے کہ یہ بہترین دستاویز ہے جو برطانوی حکومت موجودہ حالات میں تیار کر سکتی تھی۔ آسام کے وزیر اعلا، گوپی ناتھ بردولوئی، بہرحال اپنی مخالفت پر اڑے رہے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کو ایک یادداشت پیش کی جس میں کیبنیٹ مشن کے بیان کے تحت آسام اور بنگال کو ایک گروپ میں رکھنے کی مخالفت کی گئی تھی۔

ورکنگ کمیٹی میں، ہمارا خیال تھا کہ ہمیں گروپنگ کا سوال پھر سے نہیں اٹھانا چاہیے۔ جزوی طور پر اپنے آسام کے ساتھیوں کے اعتراض کو دور کرنے کے لیے، لیکن بالخصوص، اصولوں کی بنیاد پر، ہم نے دستور ساز اسمبلی کے انتخاب میں یورپین ممبروں کے اشتراک کا سوال بہرحال اٹھایا۔ میں نے وائسرائے کو لکھا کہ اگر بنگال اور آسام لیجس لیچر کے ممبروں نے، دستور ساز اسمبلی کے انتخابات میں، خواہ رائے دہندگان کی حیثیت سے، خواہ امیدوار

کی حیثیت سے شرکت کی، تو کانگریس کیبنیٹ مشن کی تمام تجویزوں کو مسترد بھی کر سکتی ہے۔ اس اعتراض کو یوں دور کیا گیا کہ بنگال اسمبلی کے یورپین ممبروں نے یہ اعلان کر دیا کہ مجوزہ دستور ساز اسمبلی میں وہ نمایندگی نہیں چاہیں گے ——— اسی اثنا ءمیں گاندھی جی کے خیالات بہر نوع تبدیل ہو گئے' اور انھوں نے بردولوئی کو اپنا تعاون عطا کر دیا۔ جواہر لال کو مجھ سے اتفاق تھا کہ آسامی لیڈروں کے تحفظات حق بجانب نہیں تھے اور انھوں نے ان لیڈروں کو سمجھانے کی شدید کوششیں کیں۔ بدقسمتی سے انھوں نے جواہر لال کی یا میری بات نہیں مانی، خاص طور پر اس لیے بھی کہ گاندھی جی اب ان کی طرف تھے اور ان کے موقف کی حمایت میں انھوں نے بیانات بھی جاری کیے تھے ——— بہر حال، جواہر لال ثابت قدم رہے اور مجھے اپنا پورا تعاون دیا ———

مَیں یہ پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ لیگ کی طرف سے کیبنیٹ مشن پلان کی نامنظوری نے ہمیں خاصی تشویش میں مبتلا کیا تھا۔ مَیں اس اقدام کا ذکر بھی کر چکا ہوں جو ورکنگ کمیٹی نے لیگ کے اعتراض کو دور کرنے کے لیے کیا تھا۔ ہم نے یہ اس طرح کیا تھا کہ ۱۰ اگست کو ایک قرارداد پاس کی جس میں یہ بات صاف کہی گئی تھی کہ کیبنیٹ مشن پلان میں شامل بعض تجاویز سے اپنی بے اطمینانی کے باوجود ہم اس اسکیم کو تمام و کمال قبول کرتے ہیں*۔ اس نے مسٹر جناح کو، بہر حال، مطمئن نہیں کیا، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ورکنگ کمیٹی نے ابھی تک قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا ہے کہ کیبنیٹ مشن پلان میں جس طرح گروپ پیش کیے گئے ہیں، صوبے ان میں اسی طرح شامل ہو جائیں گے ——— * برطانوی حکومت اور لارڈ ویول نے اس خاص نکتے پر، بالعموم لیگ سے اتفاق کیا۔

* دس برس بعد پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے، (اب) مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا اس میں زور تھا۔ کانگریس اور لیگ، دونوں اس سمجھوتے میں فریق تھیں، اور ایسا مرکز، صوبوں اور گروپوں میں تقسیم کی بنیاد پر ہی ہوا تھا کہ لیگ نے پلان منظور کیا تھا۔ شک کا اظہار کر کے کانگریس نے نہ تو دانش مندی کا ثبوت دیا، نہ ہی وہ حق بجانب تھی۔ اگر وہ ہندستان کے اتحاد کی حامی تھی تو اسے یہ پلان دو رخی باتیں کیے بغیر منظور کر لینا چاہیے

تھا۔ پس و پیش نے ہی مسٹر جناح کو ہندوستان کی تقسیم کا موقع فراہم کیا۔*

میں ہمہ وقت اس کوشش میں تھا کہ گفت و شنید کے ذریعہ اختلافات کو ختم کروں اور لارڈ ویول اس سمت میں میری کوششوں کی پوری حمایت کر رہے تھے۔ یہ ایک وجہ تھی جس کی بنا پر وہ مسلم لیگ کو حکومت میں لانے کے لیے بے چین تھے اور انھوں نے اس بیان کا استقبال کیا تھا جو میں نے اس ضمن میں دیا تھا۔ وہ دل سے یہ بات مانتے تھے کہ ہندوستانی مسئلے کا کوئی بھی حل، کیبنٹ مشن پلان میں پیش کردہ خاکے سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا۔ انھوں نے بار بار مجھ سے یہ کہا کہ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے بھی کوئی بہتر حل ممکن نہیں تھا۔ چونکہ کیبنٹ مشن پلان بیشتر اس اسکیم پر مبنی تھا جو میں نے اپنے ۱۵ را پریل کے بیان میں وضع کی تھی، اس لیے فطری طور پر مجھے ان سے اتفاق تھا۔

مسٹر ایٹلی بھی ہندوستان کے واقعات میں ذاتی دلچسپی لے رہے تھے۔ ۲۶ رنومبر ۱۹۴۶ کو انھوں نے لارڈ ویول اور کانگریس اور لیگ کے نمائندوں کو لندن میں مل بیٹھنے کی دعوت دی تاکہ تعطل کو ختم کرنے کی ایک اور کوشش کی جائے۔ پہلے پہل کانگریس اس دعوت کو قبول کرنے پر رضامند نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جواہر لال نے لارڈ ویول سے کہہ دیا تھا کہ مزید گفتگو کے لیے لندن جانے کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ تمام توجہ طلب مسئلوں پر بار بار گفتگو ہو چکی ہے اور اب پھر سے یہ دروازہ کھولا گیا تو فائدے سے زیادہ نقصان ہوگا۔

لارڈ ویول نے جواہر لال سے اتفاق نہیں کیا اور اس مسئلے پر مزید تفصیل کے ساتھ مجھ سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ اگر مسلم لیگ کا موجودہ رویہ برقرار رہا، تو نہ صرف یہ کہ انتظامیہ کا نقصان ہوگا، بلکہ ہندوستانی مسئلے کا پرامن حل بھی زیادہ سے زیادہ دشوار ہوتا جائے گا۔ ان کا استدلال یہ بھی تھا کہ لندن میں گفت و شنید کا فائدہ یہ ہوگا کہ لیڈران ایک سے زیادہ معروضی اور غیر جذباتی رویہ اختیار کر سکیں گے۔ یہ مقامی دباؤ سے اور اپنے پیروؤں کی مسلسل مداخلت سے وہ آزاد ہوں گے۔ لارڈ ویول نے اس نقطے پر بھی زور دیا کہ مسٹر ایٹلی ہندوستان کے دوست تھے اور گفتگو میں ان کی شرکت ہو سکتا ہے کہ مددگار ثابت ہو۔

میں نے لارڈ ویول کے استدلال کی طاقت محسوس کر لی اور اپنے ساتھیوں کو نقطۂ نظر

بدلنے کی ترغیب دی۔ پھر یہ طے کیا گیا کہ کانگریس کی طرف سے جواہر لال کو جانا چاہیے لیگ کی نمائندگی مسٹر جناح نے اور مسٹر لیاقت علی نے کی، جبکہ بلدیو سنگھ سکھوں کی طرف سے گئے۔ ۳ سے ۶ دسمبر تک بحثیں چلتی رہیں مگر ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

سب سے بڑا اختلاف ان دفعات کی تعبیر کے بارے میں تھا جو کیبنیٹ مشن پلان میں حلقہ بندی (گروپنگ) کے معاملے سے متعلق تھیں۔ مسٹر جناح کا خیال تھا کہ دستور ساز اسمبلی کو پلان کا ڈھانچہ بدلنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ گروپنگ، پلان کا ایک لازمی حصہ تھی اور اس کے سلسلے میں کوئی بھی تبدیلی سمجھوتے کی بنیاد کو بدل کر رکھ دے گی۔ خود پلان میں یہ سہولت رکھی گئی تھی کہ تمام گروپ جب آئین وضع کر لیں گے، اس کے بعد کوئی صوبہ چاہے تو (اپنے گروپ سے) الگ ہو سکتا ہے۔ مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ کوئی بھی صوبہ جو اپنے لیے الاٹ کیے ہوئے گروپ سے متعلق رہنے کا خواہاں نہ ہو، اتنا تحفظ کافی تھا۔ اس کے برعکس، آسام کے کانگریسی لیڈروں کا خیال یہ تھا کہ شروع ہی سے کوئی صوبہ الگ رہ سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سرے سے کسی گروپ میں شامل ہی نہ ہو اور آزادانہ طور پر اپنا آئین بھی وضع کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ صوبوں کو پہلے اپنے گروپ میں شامل ہونا چاہیے، پھر اس کے بعد اگر وہ چاہیں تو الگ ہو سکتے ہیں۔ آسام کے کانگریسی لیڈروں کے مطابق یہ صوبے اپنی شروعات علاحدہ اکائیوں کے طور پر کر سکتے تھے، پھر اس کے بعد اگر وہ چاہتے تو اپنے گروپ میں شامل ہو سکتے تھے۔ کیبنیٹ مشن کا کہنا تھا کہ اس نقطے پر لیگ کی (پیش کردہ) تعبیر درست تھی۔ مسٹر جناح کا استدلال یہ تھا کہ مرکز، صوبوں اور گروپوں میں اختیارات کی تقسیم کی بنیاد پر ہی یہ ہوا تھا کہ انھوں نے لیگ کو پلان قبول کر لینے پر آمادہ کیا تھا۔ آسام کانگریس کے لیڈروں کو اس سے اتفاق نہیں تھا، اور کچھ ہچکچاہٹ کے بعد گاندھی جی نے جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، آسام کے لیڈروں کی مجوزہ تعبیر کی حمایت شروع کر دی۔ دیانت داری کا تقاضہ یہ ہے کہ میں اسے تسلیم کر لوں کہ اس نقطے پر مجموعی اعتبار سے مسٹر جناح کا موقف صحیح تھا۔ انصاف اور مصلحت، دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ کانگریس کو کسی پس و پیش کے بغیر یہ پلان منظور کر لینا چاہیے تھا۔

۶ دسمبر کو برطانوی کابینہ نے ایک بیان شائع کیا جس میں اس نے گروپنگ کے بارے میں مسلم

لیگ کے نقطۂ نظر کو صحیح قرار دیا۔ لیکن اس سے کانگریس اور لیگ کے مابین جو رخنہ پڑ چکا تھا، وہ بھرا نہیں جا سکا۔ دستور ساز اسمبلی کی پہلی میٹنگ ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔ سوال یہ اٹھا کہ اسمبلی کا صدر کس کو ہونا چاہیے۔ جواہر لال اور سردار پٹیل دونوں اس خیال کے تھے کہ کوئی ایسا شخص جو حکومت میں نہ ہو، صدر کے طور پر منتخب کیا جانا چاہیے۔ ان دونوں نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ یہ منصب قبول کر لوں مگر میں ان کی بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ پھر کئی اور نام زیر بحث آئے، لیکن کوئی مجھوتہ نہیں ہو سکا ——— بالآخر ڈاکٹر راجندر پرساد منتخب کر لیے گئے اگرچہ وہ حکومت کے ایک رکن تھے۔

میں یہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جب ستمبر ۱۹۴۶ء میں انٹرم حکومت کی تشکیل ہوئی، گاندھی جی اور میرے ساتھیوں نے دباؤ ڈالا کہ میں اس میں شامل ہو جاؤں ——— میرا بہرحال یہ خیال تھا کہ کم سے کم ایک سینئر کانگریسی لیڈر کو حکومت سے باہر رہنا چاہیے۔ میں نے سوچا تھا کہ اس طرح میں معروضی طور پر صورت حال کا جائزہ لے سکوں گا۔ اسی لیے میں نے آصف علی کو حکومت میں شامل کر دیا۔ لیگ کی انٹرم حکومت میں شمولیت کے بعد مجلس منتظمہ کے اندر نئی مشکلات پیدا ہوئیں۔ چنانچہ حکومت میں میرے شامل ہونے کا سوال پھر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گاندھی جی نے اب کے پہلے سے بھی زیادہ پُر زور طریقے سے دباؤ ڈالا کہ مجھے شامل ہو جانا چاہیے۔ انھوں نے کھل کر مجھ سے کہا کہ میری اپنی رائے اور ذاتی احساسات جو کچھ بھی ہوں، ملک کے مفادات میں، میرا فرض یہ تھا کہ حکومت میں شامل ہو جاؤں۔ انھوں نے کہا کہ میرا باہر رہنا نقصان دہ ثابت ہو رہا تھا۔ جواہر لال کا بھی یہی خیال تھا اور انھوں نے مجھ پر اتنا زور دیا کہ میرے پاس راضی ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ گاندھی جی کی تجویز یہ تھی کہ تعلیم کا شعبہ میرے لیے مناسب ترین ہوگا اور یہ سچے قومی مفاد میں بھی ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ مستقبل کی تعلیم کا نظام آزاد ہندستان کے لیے ایک بنیادی سوال تھا۔ چنانچہ ۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء کو میں نے شری راج گوپال آچاری سے تعلیم کا محکمہ لے لیا جو اس وقت تک ممبر تعلیم تھے۔

تعلیم کے میدان میں، اپنا چارج سنبھالنے کے بعد، میں نے جس پالیسی اور پروگرام کو پیش نظر رکھا وہ ایک الگ مطالعے کا موضوع ہوگا۔ تعلیم سے متعلق مختلف معاملات پر میرے خیالات

یکجا کرکے الگ سے شایع کیے جا چکے ہیں۔ اس لیے، موجودہ کتاب میں، میں اس کی بابت کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ یہاں میں صرف ملک کی عام سیاسی صورت حال سے بحث کروں گا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی اختلافات کی وجہ سے یہ روز بروز زیادہ مشکل اور نازک ہوتی جا رہی تھی۔

میں یہ پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مجلس منتظمہ کے لیگی ممبران ہر قدم پر ہمارے لیے رکاوٹیں پیدا کر رہے تھے۔ وہ حکومت میں تھے۔ تاہم اس کے مخالف بھی تھے۔ دراصل وہ اس پوزیشن میں تھے کہ ہم جو بھی کام کریں اُسے وہ خراب کر کے رکھ دیں۔ ممبر مالیات کے اختیارات کو انتہا تک پھیلا دیا گیا تھا اور جب لیاقت علی کی طرف سے سال آئندہ کا بجٹ پیش کیا گیا، اس وقت ایک نیا صدمہ ہمارا منتظر تھا۔

کانگریس کی یہ علانیہ پالیسی تھی کہ معاشی عدم مساوات کو ختم کیا جائے اور سرمایہ دارانہ سماج کی جگہ ایک سوشلسٹ نظام قائم کیا جائے۔ کانگریس کے انتخابی منشور میں بھی اسی موقف کا ذکر تھا۔ اسی کے ساتھ ہم دونوں یعنی جواہر لال اور میں نے، جنگ کے برسوں میں تاجروں اور صنعت کاروں نے جو منافع کمایا تھا، اس کے بارے میں بیانات جاری کیے تھے۔ یہ بات سب کے علم میں تھی کہ اس آمدنی کا کچھ حصہ چھپا دیا گیا ہے اور انکم ٹیکس کی زد سے بچ گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت کو آمدنی کے بڑے وسائل سے محروم کر دیا گیا تھا اور ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ حکومت ہند کو ان محصولات کی بازیابی کے لیے، جو واجب الادا تھے مگر ابھی تک ادا نہیں کیے گئے تھے، سخت کارروائی کرنی چاہیے۔

لیاقت علی نے ایک بجٹ مرتب کیا جو بظاہر کانگریس کے اعلانات پر مبنی تھا۔ مگر واقعتاً یہ کانگریس کو بدنام کرنے کا ایک ذہانت آمیز طریقہ تھا۔ انھوں نے کانگریس کے دونوں مطالبات کو ایک ناقابل عمل رُخ دے کر پیش کیا۔ انھوں نے ٹیکس کی ایسی تجاویز پیش کیں جو تمام دولت مند لوگوں کو تلاش کر دیتیں اور جن کی وجہ سے تجارت و صنعت کو مستقل نقصان اٹھانا پڑتا۔ ساتھ ساتھ انھوں نے ایک کمیشن کے قیام کی تجویز بھی رکھی تاکہ جو محصولات ادا نہیں کیے گئے ہیں ان کے بارے میں الزامات کی چھان بین اور تاجروں سے ان کی بازیابی کی جا سکے۔

ہم سب کو یہ فکر لاحق تھی کہ دولت کی مساوی تقسیم کے عمل میں تیزی آئے اور یہ کہ ٹیکس کی چوری کرنے والوں کا محاسبہ کیا جائے۔ اسی لیے ہم اصولی طور پر لیاقت علی کی تجویز کے خلاف نہیں تھے۔

جب لیاقت علی نے کابینہ میں یہ سوال اٹھایا، انھوں نے کھلے عام یہ کہا کہ ان کی تجاویز ذمے دار کانگریسی لیڈروں کے اعلانات پر مبنی ہیں۔ انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ اگر جواہر لال نے اور میں نے یہ بیانات نہ دیے ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ ان کا ذہن اس معاملے کی طرف کبھی نہ جاتا۔ بہرنوع انھوں نے تفصیلات نہیں بتائیں۔ چنانچہ عام بنیادوں پر ہم اصولاً ان سے متفق رہے۔ اصولی طور پر ہماری رضامندی حاصل کر لینے کے بعد انھوں نے ایسے خصوصی ضابطے وضع کر ڈالے جو نہ صرف یہ کہ انتہا پسندانہ تھے بلکہ ان میں قومی معیشت کو نقصان پہنچانے کی نیت بھی شامل تھی۔

لیاقت علی کی تجاویز نے ہمارے بعض ساتھیوں کو یکسر حیران کر دیا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو نجی طور پر صنعت کاروں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو ایمانداری سے یہ محسوس کرتے تھے کہ لیاقت علی کی خصوصی تجاویز معاشی نہیں بلکہ سیاسی مصلحتوں پر مبنی تھیں۔ سردار پٹیل اور خاص طور پر شری راجگوپال آچاری ان کے بجٹ کے پرجوش مخالف تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ لیاقت علی کو ملک کے مفادات کی خدمت سے زیادہ صنعت کاروں اور تاجروں کو پریشان کرنے کی فکر تھی۔ ان کا خیال تھا کہ لیاقت علی اصلاً یہ چاہتے تھے کہ تجارت پیشہ طبقے کو نقصان پہنچائیں کیونکہ ان کی اکثریت ہندو تھی۔ راجہ جی نے کابینہ میں کھل کر کہا کہ وہ لیاقت علی کی تجاویز کے خلاف ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ یہ تجاویز فرقہ وارانہ مصلحتوں پر مبنی ہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ تجاویز کانگریس کے اعلان کردہ مقاصد سے مطابقت رکھتی ہیں چنانچہ ہم اصولوں کی مخالفت نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں ان کا جائزہ ان کے اوصاف کی بنا پر لینا چاہیے اور جہاں کہیں وہ ہمارے اصولوں سے ہم آہنگ دکھائی دیں ہمیں ان کی حمایت کرنی چاہیے۔

جیسا کہ میں نے کہا تھا، صورت حال مشکل اور نازک تھی۔ مسلم لیگ نے کیبنیٹ مشن پلان کو پہلے منظور کیا تھا پھر مسترد کر دیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس چل رہا تھا مگر لیگ نے اس حقیقت کے باوجود کہ پورا ملک اپنی آزادی کے مطالبے میں متحد تھا، اس (اجلاس) کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ ایک طرف لوگ آزادی کی حصولیابی کے لیے بے صبر ہو رہے تھے۔ دوسری طرف، ہماری بدنصیبی یہ تھی کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ واحد حل کی پیشکش کیبنیٹ مشن پلان نے کی تھی اور پھر بھی اپنے اختلافات کو دور کرنے کے لیے ہم مسئلے کو گرفت میں

نہیں دے سکے۔

برطانیہ میں لیبر حکومت کا خیال تھا کہ وہ ایک کشمکش و پیچ سے دوچار تھی۔ اسے موجودہ صورت حال کو جاری رہنے دینا چاہیے یا خود اپنی ذمہ داری پر پیش قدمی کرنی چاہیے ؟ مسٹر ایٹلی کا نظریہ یہ تھا کہ وہ منزل آچکی تھی جہاں تعطّل انتہائی ناپسندیدہ تھا۔ صاف اور دوٹوک فیصلہ کرنا ضروری تھا، سو انھوں نے طے کیا کہ ہندستان سے برطانوی اقتدار کو واپس لینے کے لیے برطانوی حکومت ایک تاریخ مقرر کرے گی۔ لارڈ ویول کسی تاریخ کے اعلان کی تجویز سے متفق نہیں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کیبنیٹ مشن پلان پر قائم رہا جائے کیونکہ ان کے خیال میں ہندستانی مسئلے کا صرف یہی ممکنہ حل تھا۔ اُن کا خیال یہ بھی تھا کہ فرقہ وارانہ سوال کو حل کرنے سے پہلے ہی اگر برطانوی حکومت نے سیاسی اقتدار منتقل کر دیا تو وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں ناکام رہے گی ——— ہندستان میں جذبات اس حد تک مشتعل کیے جا چکے تھے کہ ذمہ دار لوگ بھی ان کی رَو میں بہہ جاتے تھے۔ ایسے ماحول میں برطانوی اقتدار کو واپس لے لینے سے، اُن کے خیال میں چاروں طرف فسادات اور ہنگامے بھڑک اٹھتے۔ اسی لیے، انھوں نے یہ صلاح دی کہ صورت حال جوں کی توں برقرار رکھی جائے اور دونوں بڑی جماعتوں کے مابین اختلافات کو سنوارنے کی ہر طرح سے کوشش کی جائے۔ انھیں پختہ یقین تھا کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ میں پہلے سے مصالحت کرائے بغیر انگریز اقتدار سے دست کش ہو گئے تو یہ خطرناک بھی ہو گا اور ان کی نااہلی کا اظہار بھی۔

مسٹر ایٹلی متفق نہیں ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک بار تاریخ کی حد مقرر ہو جائے تو ذمہ داری ہندستانیوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے گی۔ جب تک یہ نہیں کیا جاتا، یہ مسئلہ کبھی بھی حل نہیں ہو سکے گا۔ مسٹر ایٹلی کو ڈر تھا کہ اگر صورت حال بدستور رہی تو برطانوی حکومت میں ہندستانیوں کا اعتماد ختم ہو جائے گا۔ ہندستان میں حالات ایسے تھے کہ انگریز اپنا اقتدار جوکھم اٹھائے بغیر قائم نہیں رکھ سکتے تھے مگر انگریز عوام اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ اب متبادل صورتیں صرف یہ رہ گئی تھیں کہ یا تو سختی کے ساتھ حکومت کر کے ہنگاموں کو دبا دیا جائے، یا پھر اقتدار ہندستانیوں کو منتقل کر دیا جائے۔ حکومت اپنے آپ کو برقرار رکھ سکتی

تھی مگر اس کے لیے جدو جہد ضروری تھی جو برطانیہ کی تعمیر نو کے کام میں خلل انداز ہوتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اقتدار کی منتقلی کے لیے ایک تاریخ طے کر دی جائے اور اس طرح پوری ذمے داری ہندستانیوں کے کندھوں پر ڈال دی جائے۔

لارڈ ویول قائل نہیں ہوئے۔ وہ اب بھی دلیل دیتے تھے کہ اگر فرقہ وارانہ تمسکلات نے تشدد کا راستہ اختیار کر لیا تو تاریخ انگریزوں کو معاف نہیں کرے گی۔ انگریزوں نے ہندستان پر سو برس سے زیادہ حکومت کی تھی اور اگر ان کے رخصت ہوتے ہی بدامنی، تشدد اور ابتری کا سلسلہ چل پڑا تو اس کے ذمے دار وہی ہوں گے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ وہ مسٹر اٹیلی کو قائل نہیں کر سکتے تو لارڈ ویول نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔

دس برس بعد ان واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے بعض اوقات میں حیران ہوتا ہوں کہ آخر صحیح کون تھا۔ حالات اتنے پیچیدہ اور صورت حال اتنی نازک تھی کہ کوئی قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ مسٹر اٹیلی کے فیصلے پر ہندستان کو اس کی آزادی کے حصول میں مدد دینے کا عزم غالب تھا۔ خفیف ترین شہنشاہیت پسند میلان رکھنے والا کوئی بھی شخص ہندستان کی کمزوری سے بآسانی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندو مسلم اختلافات سے برطانوی حکومت نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا۔ ہندستان کے مطالبۂ آزادی کے خلاف یہی ان کا سب سے بڑا دفاع تھا۔ مسٹر اٹیلی طے کر چکے تھے کہ لیبر حکومت کے خلاف اب کبھی کوئی شخص اس طرح کا الزام عاید نہ کرنے پائے۔

ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اگر ان کی نیت صاف نہ ہوتی اور اگر انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہا ہوتا تو وہ آسانی کے ساتھ ایسا کر سکتے تھے۔ ہماری مخالفت کے باوجود انگریز ابھی مزید دس برس تک اس ملک پر حکومت کرتے رہتے۔ بے شک، ہنگامے اور تصادم ہوتے رہتے۔ ہندستانیوں کے جذبات کو اس حد تک ابھارا جا چکا تھا کہ ہر قدم پر برطانوی حکومت کو چیلنج کیا جاتا۔ تاہم اگر وہ چاہتے تو ہندستانیوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر ابھی چند برس اور حکومت کر سکتے تھے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ برطانیہ کی بہ نسبت بہت کمزور ہوتے ہوئے بھی فرانسیسی اقتدار

انڈو چائنا میں تقریباً دس برس تک جاری رہا۔ اس لیے ہمیں لیبر حکومت کی کما حقہ تعریف کرنی چاہیے۔ وہ اپنے فائدے کے لیے ہندستان کی کمزوری کا استحصال نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تاریخ ان کے اس فیصلے کا احترام کرے گی اور ہمیں بھی، بغیر کسی ذہنی تحفظ کے، اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے۔

دوسری طرف، یقین کے ساتھ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ لارڈ ویول غلطی پر تھے۔ انھیں نے جن خطرات کی پیش بینی کی وہ حقیقی تھے اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ صورت حال کا ان کا تجزیہ درست تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ متبادل صورتوں میں سے کون سی صورت ہندستان کے لیے بہتر ہوتی ——— وہ جسے مسٹر ایٹلی نے واقعتاً اختیار کیا تھا یا وہ جس کی تجویز لارڈ ویول نے پیش کی تھی۔ اگر لارڈ ویول کی صلاح مان لی جاتی اور ہندستانی مسئلے کا حل ایک یا دو برس کے لیے ٹال دیا جاتا، تو ممکن تھا کہ مسلم لیگ مخالفت کرتے کرتے تھک گئی ہوتی۔ اگر مسلم لیگ نے ایک زیادہ مثبت رویہ نہ بھی اختیار کیا ہوتا تو غالباً ہندستان کے مسلمان عوام نے ہی مسلم لیگ کے منفی رویے کو مسترد کر دیا ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ شاید ہندستان کی تقسیم کا المیہ ٹل جاتا۔ یقین کے ساتھ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن کسی قوم کی تاریخ میں ایک یا دو برس کچھ بھی نہیں ہوتے۔ شاید تاریخ ہی یہ فیصلہ کرے گی کہ زیادہ دانشمندانہ پالیسی یہی ہوتی کہ لارڈ ویول کا مشورہ مان لیا گیا ہوتا۔

لارڈ ویول جب چلے گئے تو میں نے ایک بیان جاری کیا جس سے پتہ چلے گا کہ میں ان کے بارے میں کیا سوچتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جواہر لال اور میرے دوسرے رفقا مجھ سے متفق نہیں تھے۔ وہ لارڈ ویول کے خلاف تھے، لیکن میں اسے اپنا فرض سمجھتا تھا کہ لارڈ ویول کی خدمات کے بارے میں اپنے تحسین آمیز خیالات پبلک کے سامنے رکھ دوں ——— میں نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا :

> ہندستان کے بارے میں مسٹر ایٹلی کے بیان نے میرے ذہن میں ملے جلے احساسات پیدا کیے ہیں۔ ایک طرف تو میں یہ دیکھ کر مطمئن ہوں کہ جون ۱۹۴۸ء میں بےشک صورت حال

کا جو اندازہ لگایا تھا اُسے واقعات نے حق بجانب ثابت کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس امر پر مَیں افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ لارڈ ویول، جنھوں نے ہندستان اور انگلستان کے تعلقات کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا، اب اِس منظر سے رخصت ہو رہے ہیں۔

شِملہ کانفرنس کے وقت ہر سطح پر، انگریزوں کی نیت کے بارے میں شک اور بے اعتباری عام تھی۔ مَیں اقرار کرتا ہوں کہ خود مَیں بھی بدگمان تھا، اور پچھلے تین برسوں کے واقعات نے میرے ذہن میں تلخی کی ایک میراث چھوڑ رکھی تھی۔ مجوزہ کانفرنس میں شرکت کے لیے مَیں اسی ذہنی کیفیت کے ساتھ گیا، لیکن جب میں لارڈ ویول سے ملا تو مَیں ایک اچانک ذہنی تبدیلی کے تجربے سے روشناس ہوا۔ مَیں نے انھیں ایک ان گھڑ، بے ریا سپاہی کے طور پر دیکھا جو لفاظی کے عیب سے خالی تھا اور اپنے انداز و اسلوب میں دو ٹوک تھا۔ وہ کسی سیاست داں کی طرح پُر فریب نہیں تھے بلکہ فوراً اصل معاملے پر آجاتے تھے اور (دوسروں کے) ذہن میں زبردست خلوص کا تاثر پیدا کرتے تھے جو سیدھے دل کو چھو لیتا تھا۔ اسی لیے، مَیں نے اسے اپنا فرض سمجھا کہ ملک کو اپنے سیاسی نصب العین کی تکمیل کے لیے، ایک تعمیری طریقہ اپنانے کا مشورہ دوں۔ جبھی سے، شک و شبہے اور مخالفت کے ایک عام ماحول کے باوجود، مَیں نے اِس راہ سے انحراف کبھی نہیں کیا۔ سب جانتے ہیں کہ پہلی شِملہ کانفرنس کے وقت سے، کم از کم چار مختلف مواقع پر، کانگریس کے اندر اور باہر دونوں طرف سے، یہ کوششیں کی گئیں کہ کوئی تحریک شروع کروائی جائے اور کانگریس کو براہِ راست کارروائی پر مجبور کر دیا جائے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ برطانوی حکومت کے مفاہمتی رویّے کی روشنی میں یہ طریق کار غیر دانشمندانہ ہوگا۔ مَیں نے اپنے تمام اثرات کانگریس کی رفتار کو مستحکم رکھنے پر صرف کیے، اور آج مجھے اِس پر اطمینان کا احساس ہوتا ہے کہ صورتِ حال کا میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔

شِملہ کانفرنس ناکام ہوگئی، مگر اِس کے بعد جلدی ہی، انگلستان میں عام انتخابات ہوئے اور لیبر پارٹی اقتدار میں آگئی۔ اِس نے اعلان کیا کہ ہندستان کے بارے میں پہلے

س نے جو کچھ کہا تھا، اب اسی پر عمل کرے گی۔ جب سے اب تک کے واقعات نے ثابت کردیا ہے کہ اس کا دعوا مخلصانہ تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ پچھلے دو یا تین ہفتوں میں لارڈ ویول اور ہز میجسٹی کی حکومت میں کیا خط و کتابت ہوئی۔ بظاہر کچھ اختلافات پیدا ہوگئے تھے جو ان کے استعفے پر منتج ہوئے۔ ہم صورت حال کے بارے میں ان کی رائے سے اختلاف کرسکتے ہیں۔ مگر ہم، مقصد کے تئیں اُن کے خلوص اور اُن کی دیانت داری پر شک نہیں کرسکتے۔ نہ ہی میں یہ بھول سکتا ہوں کہ آج ہند برطانوی تعلقات میں بدلی ہوئی فضا کا سبب ان کا وہ قدم ہے جو بہت پہلے جون ۱۹۴۵ء میں انھوں نے نہایت حوصلہ مندی کے ساتھ اٹھایا تھا۔ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد، چرچل کی حکومت نے یہ طے کرلیا تھا کہ جنگ کی مدت تک کے لیے ہندستان کے مسئلے کو سرد خانے میں ڈال دے۔ ہندستان کی اپنی رائے کے سامنے بھی کوئی راستہ نہیں تھا اور ۱۹۴۲ء کے بعد کے واقعات نے تلخی اور زیادہ بڑھادی تھی۔ ایک بند دروازے کو کھولنے کا سہرا لارڈ ویول کے سر جاتا ہے۔ ملی جلی حکومت کی طرف سے ابتدائی مخالفت کے باوجود وہ اسے اس پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ ہندستان کے سامنے ایک نئی پیشکش رکھنے پر راضی ہو۔ اسی کا نتیجہ شملہ کانفرنس تھی۔ کانفرنس کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس کے بعد سے اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ اسی جرات مندانہ قدم کا منطقی نتیجہ ہے جو لارڈ ویول نے اٹھایا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ ہندستان لارڈ ویول کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کرے گا، اور آزاد ہندستان کے مورخ کے لیے، جب انگلستان اور ہندستان کے تعلقات کا جائزہ لینے کا وقت آئے گا۔ تو وہ لارڈ ویول کو ہی ان تعلقات میں ایک نیا باب کھولنے کی عزت کا مستحق قرار دے گا۔

اس شام ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں لارڈ ویول نے وائسرائے کی مجلسِ منتظمہ کے

اراکین کو الوداع کہا۔ میرے بیان سے وہ متاثر دکھائی دیے اور انھوں نے ایک دوست سے کہا، مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ہندوستان میں کم سے کم ایک شخص تو ایسا ہے جس نے میرے موقف کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

رخصت ہونے سے ایک روز پہلے، لارڈ ویول نے کابینہ کی اپنی آخری میٹنگ کی صدارت کی۔ کارروائی جب ختم ہوگئی تو انھوں نے ایک مختصر بیان دیا جس کا مجھ پر گہرا اثر پڑا۔ لارڈ ویول نے کہا میں ایک انتہائی مشکل اور تشویش ناک وقت میں وائسرائے بنا۔ مَیں نے اپنی بساط بھر اپنی ذمّے داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال، ایک ایسی صورت حال پیدا ہوئی جس کی وجہ سے مجھے مستعفی ہونا پڑا۔ تاریخ یہ فیصلہ کرے گی کہ اس مسئلے پر میرا استعفیٰ دینا صحیح تھا یا نہیں۔ آپ سے میری گزارش، بہر نوع، یہی ہوگی کہ آپ عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔ اس تعاون کے لیے جو مجھے آپ سے ملا میں آپ سب کا شکر گزار ہوں۔

اس تقریر کے بعد، لارڈ ویول نے جلدی جلدی اپنے کاغذات سمیٹے اور ہم سے کسی کو، کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر باہر نکل گئے۔ اگلے روز انھوں نے دہلی چھوڑ دی۔

(۱۴)

ماؤنٹ بیٹن مشن

لارڈ ماؤنٹ بیٹن پہلے پہل جنگ کے برسوں میں اچھی طرح معروف ہوئے۔ انھوں نے کچھ وقت ہندستان میں گزارا تھا اور پھر اپنے ہیڈکوارٹرز سیلون منتقل کر لیے تھے۔ جب لارڈ ویول مستعفی ہو گئے تو انھیں وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا۔ روانگی سے پہلے لیبر حکومت نے انھیں تمام معاملات سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا اور وہ مسٹر ایٹلی کی ان ہدایات کے ساتھ آئے تھے کہ ۳۰ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے اقتدار لازمی طور پر منتقل کر دیا جائے۔

وہ دہلی ۲۲ مارچ کو پہنچے اور ۲۴ تاریخ کو انھوں نے ہندستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ حلف اٹھانے کی تقریب کے فوراً بعد انھوں نے ایک مختصر تقریر کی جس میں اگلے چند مہینوں کے اندر کوئی حل ڈھونڈ نکالنے کی ضرورت پر زور دیا۔

اس کے بعد جلدی ہی، لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے مجھے بتایا کہ برطانوی حکومت اقتدار منتقل کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ ہو سکے، فرقہ وارانہ مسئلے کو طے کرنا ضروری تھا، اور ان کی خواہش یہ تھی کہ اس مسئلے کو حل کرنے کی ایک آخری اور فیصلہ کن کوشش کی جانی چاہیے۔ وہ مجھ سے اتفاق کرتے تھے کہ کانگریس اور لیگ کے درمیان اختلافات کو اب کافی کم کیا جا چکا تھا۔ کیبنیٹ مشن پلان نے آسام اور بنگال کو ایک ساتھ ایک ہی

گروپ میں رکھ دیا تھا۔ کانگریس کا کہنا یہ تھا کہ کسی بھی صوبے کو کسی خاص گروپ میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے اور ہر صوبہ یہ ووٹ دے سکتا ہے کہ وہ کسی خاص گروپ میں جائے گا یا نہیں۔ لیگ نے کہا کہ اس نے کیبنیٹ مشن پلان اس بنیاد پر قبول کیا تھا کہ مجموعی حیثیت سے گروپ ہی ووٹ دے گا، اور کوئی صوبہ گروپ کے آئین وضع کر لینے کے بعد ہی اس سے نکلنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیگ نے مزید یہ کہا کہ پلان کی تجاویز کی کوئی بھی تبدیلی معاہدے کو منسوخ کر دے گی اور اسی بنیاد پر لیگ نے کیبنیٹ مشن پلان کو مسترد کیا تھا۔

کوئی بھی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ لیگ نے آسام کے سوال پر اتنا زور کیوں دیا تھا جب کہ آسام مسلم اکثریتی صوبہ نہیں تھا۔ اگر لیگ کے اپنے پیمانے پر دیکھا جاتا تو آسام کو بنگال کے ساتھ شامل ہونے پر مجبور کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ وجہ جو بھی رہی ہو، لیگ اصولاً صحیح تھی گرچہ اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے اس کا مقدمہ کمزور تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کئی موقعوں پر میں نے اس سوال پر بحث کی۔ میرا خیال تھا کہ کانگریس اور لیگ کے مابین اختلافات ایک ایسی منزل تک پہنچ چکے تھے جہاں کسی ثالث کے توسط سے ہی کوئی مصالحت ممکن ہو سکتی تھی۔ میری رائے یہ بھی تھی کہ ہم اس معاملے کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر چھوڑ سکتے ہیں۔ کانگریس اور لیگ کو چاہیے کہ یہ معاملہ اُن کے سپرد کرنے پر راضی ہو جائیں اور پھر ان کا فیصلہ قبول کر لیں۔ مگر بہر حال نہ تو جواہر لال، نہ ہی سردار پٹیل اس تجویز سے متفق تھے۔ انھوں نے ایک قومی مسئلے پر کسی ثالث کے خیال کو پسند نہیں کیا اور میں نے بھی اس بات پر مزید دباؤ نہیں ڈالا۔

اس دوران میں صورت حال بر روز بگڑتی جا رہی تھی۔ کلکتے کے فسادات کے بعد نواکھالی اور بہار میں فسادات ہوئے تھے۔ اس کے بعد بمبئی میں گڑبڑ ہوئی۔ پنجاب میں بھی، جہاں ابھی تک سکون تھا، اب تناؤ اور تصادم کے آثار رونما ہونے لگے۔ ملک خضر حیات خاں نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ۲ مارچ کو اپنا استعفیٰ دے دیا تھا۔ لاہور میں ۴ مارچ کو پاکستان مخالف مظاہرے ہوئے جن کے نتیجے میں تیرہ افراد مر گئے اور بہتوں کو چوٹیں آئیں۔ فرقہ وارانہ ہنگامے صوبے کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل گئے اور امرتسر، ٹیکسلا، اور راولپنڈی میں بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے۔

ایک طرف فرقہ وارانہ جذبات شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ دوسری طرف انتظامیہ میں ڈھیل پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ جو یورپین ملازمتوں میں تھے، اُن کا جی کام میں نہیں لگتا تھا۔ انھیں اب یقین ہو چلا تھا کہ بہت کم وقت میں، اقتدار ہندستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے گا۔ چنانچہ انھیں اب اپنے کام میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی اور وہ بس وقت گزار رہے تھے۔ وہ لوگوں سے کھلے عام یہ کہتے تھے کہ انتظام کی کوئی ذمے داری اب ان پر نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں مزید بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی اور اعتماد میں کمی آتی گئی۔

حالات میں مزید خرابی مجلسِ منتظمہ کے اندر کانگریس اور لیگ کے مابین تعلق کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔ مرکزی حکومت مفلوج ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ مجلس منتظمہ (کونسل) کے ممبران ایک دوسرے کی کھینچا تانی میں مصروف تھے۔ لیگ مالیات کی انچارج تھی، چنانچہ اس کے پاس انتظامیہ کی کلید تھی —— یہ بات یاد ہوگی کہ ایسا صرف سردار پٹیل کی وجہ سے ہوا، جو امور داخلہ کو اپنے پاس رکھنے کی تشویش میں مالیات کا محکمہ مسلم لیگ کی نذر کر بیٹھے۔ مالیات کے محکمے میں کچھ بہت ہی لائق اور پرانے مسلمان افسر تھے، جو لیاقت علی کو ہر ممکن مدد دے رہے تھے۔ ان کے مشورے سے لیاقت علی کو مجلسِ منتظمہ کے کانگریسی ممبروں کی ہر تجویز کو التوا میں ڈالنے یا رد کرنے کا موقع ملا۔ سردار پٹیل پر یہ انکشاف ہوا کہ گرچہ وہ ہوم ممبر تھے مگر لیاقت علی کی منظوری کے بغیر وہ ایک چپراسی کی جگہ بھی نہیں نکال سکتے تھے۔ کونسل کے کانگریسی ممبران مشکل میں تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔

مسلم لیگ کو مالیات کا محکمہ دینے کی ہماری اپنی احمقانہ کارروائی کے نتیجے میں سچ مچ ایک افسوسناک صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس صورت حال کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ممبروں کے درمیان اختلافات کی وجہ سے انھوں نے بتدریج، دھیرے دھیرے تمام اختیارات سمیٹ لیے۔ ابھی ایک آئینی گورنر جنرل کی صورت تو انھوں نے برقرار رکھی مگر، دراصل، انھوں نے خود اپنا راستہ نکالنے کی غرض سے، کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین مصالحت کی کوشش شروع کر دی۔ سیاسی مسئلے کو انھوں نے ایک نیا موڑ دینے کی کوشش بھی شروع کی اور کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ پاکستان کا

قیام) ناگزیر تھا۔ انھوں نے پاکستان کی حمایت میں وکالت کی اور اس تصور (پاکستان) کا بیج مجلس منتظمہ کے کانگریسی ممبروں کے دماغ میں بو دیا۔

اسے ضبط تحریر میں لانا ضروری ہے کہ ہندستان میں پہلے شخص، جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس خیال کے سحر میں گرفتار ہوئے، سردار پٹیل تھے۔ شاید بالکل اخیر تک، جناح کے لیے پاکستان سودے بازی کا ایک ذریعہ تھا، مگر پاکستان کے لیے جدوجہد میں وہ اپنی حد سے آگے نکل گئے تھے۔ ان کے طرز عمل نے سردار پٹیل کو اتنا ناراض اور مشتعل کر دیا تھا کہ اب وہ تقسیم میں یقین رکھنے لگے۔ مسلم لیگ کو مالیات کا محکمہ دینے کی ذمہ داری سردار کی تھی۔ اسی لیے لیاقت علی کے سامنے اپنی بے چارگی پر انھیں دوسروں سے زیادہ غصہ آتا تھا۔ جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تجویز کیا کہ موجودہ مشکل کا حل تقسیم فراہم کر سکتی ہے، تو انھوں نے دیکھا کہ سردار پٹیل کا ذہن اسے قبول کرنے کے لیے فوراً تیار تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ نقشے پر ماؤنٹ بیٹن کے نمودار ہونے سے پہلے ہی سردار پٹیل پچاس فیصدی، تقسیم کے حق میں تھے۔ انھیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ وہ کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ اگر انھیں مسلم لیگ سے چھٹکارا مل سکے تو وہ ہندستان کا ایک ٹکڑا قبول کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ شاید یہ کہنا ناروا نہ ہوگا کہ ولبھ بھائی پٹیل ہی ہندستان کی تقسیم کے بانی تھے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن انتہائی ذہین آدمی تھے اور اپنے تمام ہندستانی ساتھیوں کے ذہن کو پڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انھوں نے جیسے ہی پٹیل کو اپنا نظریہ قبول کرنے پر آمادہ پایا، انھوں نے سردار کو جیتنے کے لیے اپنی شخصیت کا تمام سحر اور اپنی تمام طاقت صرف کر دی۔ اپنی نجی گفتگو میں وہ سردار کو اخروٹ کہتے تھے ——— باہر سے چھلکا بہت سخت مگر ایک بار یہ چھلکا ٹوٹ جائے تو پھر اندر ملائم گودا۔ بعض اوقات تفریحی موڈ میں وہ مجھ سے اسی طرح کہا کرتے تھے کہ انھوں نے اخروٹ سے بات کی تھی اور اخروٹ ہر سوال پر ان سے متفق ہو گیا ہے۔

سردار پٹیل کو قائل کرنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے توجہ کا رُخ جواہر لال کی طرف موڑا۔ پہلے پہل جواہر لال اس خیال کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور تقسیم کے تصور پر شدید

ردِ عمل کا اظہار کرتے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس وقت تک لگے رہے جب تک کہ زینہ بزینہ جواہر لال کی مخالفت معدوم نہیں ہو گئی۔ ہندستان پہنچنے کے مہینے بھر کے اندر جواہر لال جو تقسیم کے سخت مخالف تھے، اگر اس کے حامی نہیں بن گئے تو کم سے کم اس تصوّر کو خاموشی سے تسلیم کرنے پر تیار ہو گئے۔

میں اکثر حیران ہوتا ہوں کہ جواہر لال پر بھلا کس طرح ماؤنٹ بیٹن نے فتح پائی۔ وہ ایک اصول پسند انسان ہیں، مگر وہ جذباتی بھی ہیں اور ذاتی اثرات کو بہت آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس تبدیلی کے لیے ایک سبب جو ذمّے دار ٹھہرایا جا سکتا ہے' وہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی شخصیت تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ نہایت ذہین ہیں، اُن کا مزاج بھی انتہائی پُر کشش اور دوستانہ ہے۔ اپنے شوہر کو وہ بے حد پسند کرتی تھیں اور بہت سے معاملات میں ایسے لوگوں کے لیے جو پہلے ان کے شوہر سے متفق نہیں ہوتے تھے، وہ اپنے شوہر کے خیالات کو واضح کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔

ایک اور شخص پر بھی، جواہر لال میں اس تبدیلی کے لیے ذمّے داری عاید ہوتی ہے۔ ایک ہندستانی، جن کا نام کرشنا مینن تھا، تیسری دہائی کے اوائل سے لندن میں رہ رہے تھے۔ جواہر لال سے ان کی ملاقات پہلی بار تیسری دہائی کے اواخر میں ہوئی تھی اور اُن (کی شخصیت) میں جواہر لال کو ایک ایسے شخص کا سُراغ ملا تھا جو جواہر لال کے خیالات کے لیے زبردست تحسین کا دعوا کرتا تھا ——— * ہم سبھی اپنے مداحوں کو پسند کرتے ہیں، مگر شاید جواہر لال انھیں دوسروں سے کچھ زیادہ ہی پسند کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد، چوتھی دہائی کی شروعات میں، لیبر پارٹی نے ایک وفد ہندستان بھیجا جس کی قیادت مس ایلین ولکنسن کر رہی تھیں۔ کرشنا مینن بھی اس وفد سے متعلق تھے اور ہندستان آئے تھے۔ وہ لندن میں انڈیا لیگ کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے تھے۔ اس دوران میں، ان کا رابطہ بالخصوص ایسے لوگوں سے تھا جو کمیونسٹ یا ان کے حاشیہ بردار سمجھے جاتے تھے۔ جب جواہر لال دوبارہ لندن گئے تو کرشنا مینن نے اپنے تعلقات کی تجدید کی اور جواہر لال کے تئیں اپنی وفاداری کا بار بار اظہار کیا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو کرشنا مینن نے یہ تجویز پیش کی کہ انھیں رقوم مہیا

کی جائیں تاکہ وہ ہندستان کی طرف سے لندن میں پروپیگنڈہ جاری رکھ سکیں ——
ہٹلر نے جب روس پر حملہ کیا اس وقت لندن میں سوویت سفارت خانے سے ان کا رابطہ قائم ہوا۔ انھوں نے ہمیں کئی پیغامات بھیجے کہ وہ جواہر لال کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے سوویت سفیر سے ملاقات کر رہے تھے۔ ہندستان کے لیے دوستانہ جذبات رکھنے والوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے انھوں نے طرح طرح کی تجویزیں بھیجیں۔ انھوں نے ایسی اسکیمیں بھی بنائیں کہ کانگریس کے لیے رقوم کا مطالبہ کیا جائے۔ جواہر لال ان سے متاثر تھے اور انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ کچھ رقم منظور کر دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور معاملہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا۔ گاندھی جی اور سردار پٹیل نے مجھ سے صاف کہا کہ انھیں میرا یہ عمل پسند نہیں آیا تھا مگر چونکہ میں نے خوش اعتمادی میں (کرشنا مینن کو) یہ رقم دے دی تھی اس لیے وہ لوگ کچھ نہیں کہیں گے۔ بہرنوع، انھوں نے مجھ سے کہا کہ اب آگے کوئی اور رقم نہ دوں۔ انھوں نے یہ نشاندہی کی کہ لندن میں کرشنا مینن کے بارے میں رائے کے لحاظ سے، ہندستانی دو حلقوں میں صاف بٹے ہوئے تھے۔ ان کے کچھ حمایتی بھی تھے، لیکن مخالفوں کا ایک مضبوط حلقہ بھی تھا جو ان کے خلاف ہر طرح کے الزامات عاید کرتا تھا۔ عام تاثر جو مجھے ملا یہ تھا کہ ان کے طور طریقے شک و شبہے سے بالاتر نہیں ہیں۔ چنانچہ میں ان پر پوری طرح بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ کرشنا مینن کے سلسلے میں گاندھی جی اور سردار کے شکوک صحیح تھے۔ فیاضانہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھروسے کے قابل نہیں تھے اور عوامی رقوم کو خرچ کرنے کے معاملے میں کم محتاط تھے۔ بیشتر لوگ اس سے زیادہ خراب رائے رکھتے تھے اور انھیں اوپر سے نیچے تک بے ایمان سمجھتے تھے۔

جب انٹرم حکومت کی تشکیل ہو چکی تو جواہر لال نے کرشنا مینن کو لندن میں بطور ہائی کمشنر مقرر کرنا چاہا۔ لارڈ ویول راضی نہیں ہوئے۔ برطانوی حکومت نے بھی یہ صلاح دی کہ ان کا تقرر مناسب نہیں ہوگا کیونکہ وہ اشتراکیت کے حاشیہ بردار سمجھے جاتے تھے۔ لارڈ ویول کے رخصت ہونے کے بعد جلد ہی کرشنا مینن ہندستان آئے اور جواہر لال کے ساتھ قیام کیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن فوراً سمجھ گئے کہ جواہر لال کرشنامینن کے معاملے میں کمزور واقع ہوئے ہیں اور ان سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ لارڈ ویول نے کرشنامینن کے تقرر کی مخالفت کی تھی مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان کا سرپرست بننے کا فیصلہ کیا اور کئی موقعوں پر انھیں وائسرائے ہاؤس میں مدعو کیا۔ کرشنامینن اشتراکی میلانات رکھتے تھے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ماؤنٹ بیٹن کا رویہ ان کی طرف دوستانہ ہے اور کوئی رتبہ حاصل کرنے میں ان کی مدد کر سکتا ہے تو وہ ایک رات میں برطانیہ نواز ہو گئے۔ انگریزوں کے لیے اپنے دوستانہ جذبات کے ذریعے انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو متاثر کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سوچا کہ تقسیم ہند کی اسکیم کو قبول کرنے پر جواہر لال کو تیار کرنے میں کرشنامینن مددگار ثابت ہوں گے۔ میرا یقین ہے کہ اس سوال پر کرشنامینن نے جواہر لال کے ذہن کو لازماً متاثر کیا۔ چنانچہ مجھے حیرت نہیں ہوئی، جب کچھ عرصہ بعد میں نے یہ سنا کہ اگر جواہر لال کرشنامینن کو لندن میں ہائی کمشنر مقرر کرنا چاہتے ہیں تو ماؤنٹ بیٹن انھیں اپنا تعاون پیش کریں گے۔*

جب مجھے پتہ چلا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندستان کو تقسیم کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے اور جواہر لال اور پٹیل کو انھوں نے آمادہ بھی کر لیا تھا تو مجھ پر شدید اضمحلال طاری ہوا۔ میں نے سمجھ لیا کہ ملک ایک بہت بڑے خطرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مجھے پہلے بھی یقین تھا اور آج بھی ہے کہ ہر نقطۂ نظر سے کیبنیٹ مشن پلان (ہمارے مسئلے کا) بہترین حل تھا۔ وہ ہندستان کی وحدت کی حفاظت کر سکتا تھا اور اس نے ہر فرقے کو یہ موقع فراہم کیا تھا کہ عزت اور آزادی کے ساتھ کام کر سکے۔ حتیٰ کہ فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے بھی مسلمان اس سے بہتر کچھ اور پانے کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ جن صوبوں میں ان کی اکثریت ہوتی ان میں انھیں مکمل اندرونی خود مختاری حاصل ہوتی۔ مرکز میں بھی ان کی نمایندگی جتنی ہونی چاہیے تھی اس سے زیادہ ہوتی۔ جب تک فرقہ وارانہ رقابتیں اور شکوک باقی رہیں گے، ان کی حیثیت کا مناسب تحفظ کیا جاتا رہے گا۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ اگر آزاد ہندستان کا آئین اس کی بنیاد پر وضع کیا گیا اور کچھ عرصے تک ایمانداری کے ساتھ اس پر عمل ہوتا رہا تو جلد ہی فرقہ وارانہ شکوک اور بدگمانیاں جاتی رہیں گی۔ ملک کے اصل مسئلے معاشی تھے، فرقہ وارانہ نہیں۔ اختلافات طبقوں سے متعلق تھے،

گروہوں سے نہیں۔ ایک بار ملک آزاد ہو جائے تو ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی ان مسائل کی حقیقی نوعیت کو سمجھ لیں گے جن سے وہ دوچار ہیں اور فرقہ وارانہ اختلافات طے کر لیے جائیں گے۔

مَیں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو یہ سمجھانے کی حتی الامکان کوشش کی کہ کوئی آخری قدم نہ اُٹھائیں۔ مگر مَیں نے دیکھا کہ سردار پٹیل تقسیم کے اس حد تک حامی تھے کہ کسی اور نقطۂ نظر کو سننے تک کے لیے مشکل سے تیار ہوتے تھے۔ میں نے دو گھنٹے سے زیادہ ان سے بحث کی۔ مَیں نے یہ نشاندہی کی کہ اگر ہم نے تقسیم کو قبول کر لیا تو ہم ہندستان کے لیے ایک مستقل مسئلہ پیدا کر دیں گے۔ تقسیم فرقہ وارانہ مسئلے کو حل نہیں کرے گی بلکہ اسے ملک کی ایک مستقل خصوصیت بنا دے گی۔ جناح نے دو قوموں کا نعرہ بلند کیا تھا۔ تقسیم کو قبول کرنا اس نعرے کو قبول کرنا تھا۔ کانگریس کبھی بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی بنیاد پر ملک کو تقسیم کرنے کی حمایت کس طرح کر سکتی تھی۔ فرقہ وارانہ خدشات کو دور کرنے کے بجائے، فرقہ وارانہ منافرت پر مبنی دو ریاستیں قائم کر کے، تقسیم ان خدشات کو ہمیشہ کے لیے قائم کر دے گی۔ ایک بار نفرتوں پر مبنی ریاستیں وجود میں آگئیں تو کوئی نہیں جانتا کہ صورت حال ہمیں کہاں لے جائے گی۔

مجھے تعجب بھی ہوا اور تکلیف بھی جب جواب میں پٹیل نے کہا، ہمیں یہ پسند ہو کہ نہ ہو ہندستان میں (بہرحال) دو قومیں ہیں۔ اب انھیں یقین تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو متحد کر کے ایک قوم نہیں بنایا جا سکتا۔ اب کوئی دوسری صورت نہیں تھی سوائے اس کے کہ یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے صرف اسی طریقے سے ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کا وہ جھگڑا ختم کر سکتے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر دو بھائی ساتھ نہ رہ سکیں تو وہ الگ ہو جاتے ہیں۔ اپنے اپنے حصے کے ساتھ الگ ہو جانے کے بعد وہ دوست بن جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے، اگر انھیں زبردستی ایک ساتھ رکھا جائے تو ہر روز وہ لڑائی پہ کمربستہ رہیں گے۔ ہر روز کی بک بک جھک جھک سے تو یہی بہتر تھا کہ ایک بار دیانت داری کے ساتھ لڑائی کر کے الگ ہو جایا جائے۔ مجھے حیرت تھی کہ پٹیل اب دو قومی نظریے کے جناح سے بھی بڑے حامی تھے۔ تقسیم کا علم جناح نے بلند کیا ہوگا مگر اب اصل علم بردار پٹیل تھے۔

اب میں جواہرلال کی طرف مڑا۔ وہ اس طور پر تقسیم کی حمایت میں نہیں بولتے تھے جس طرح پٹیل بولتے تھے۔ دراصل، وہ اس کے معترف تھے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے تقسیم غلط تھی۔ بہرحال، مجلسِ منتظمہ کے لیگی ممبروں کے طور طریقے کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد اب وہ اشتراکِ عمل کی تمام امیدوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ کسی بھی سوال پر وہ ہم خیال نہیں ہو سکتے تھے۔ روزانہ ان میں جھگڑا ہوتا تھا۔ مایوسی کے عالم میں جواہرلال نے مجھ سے پوچھا کہ تقسیم کو قبول کرنے کے سوا اب کون سا راستہ ہے۔

جواہرلال نے مجھ سے غم آلود انداز میں بات کی لیکن میرے ذہن میں اس کی بابت کوئی شک باقی نہیں رہنے دیا کہ اُن کا اپنا دماغ کس طرح کام کر رہا تھا۔ یہ صاف تھا کہ تقسیم کے تصور سے اپنی نفرت کے باوجود، روز بہ روز وہ اسی نتیجے تک پہنچتے جا رہے تھے کہ کوئی اور صورت ممکن نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ تقسیم (مسئلے کا) بہترین حل نہیں تھی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قطعی طور پر یہ ایک اچھا حل نہیں تھا۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ حالات ناگزیر طور پر اسی کی طرف لے جا رہے تھے۔

چند روز بعد جواہرلال پھر مجھ سے ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے ایک لمبی تمہید کے ساتھ شروعات کی جس میں انھوں نے اس پر زور دیا کہ ہمیں خوش خیالی میں نہیں مبتلا ہونا چاہیے بلکہ حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے۔ آخر کار وہ اصل مطلب پر آئے اور مجھ سے کہا کہ میں تقسیم کی مخالفت ترک کر دوں۔ انھوں نے کہا کہ ناگزیر تھا اور عقل مندی اسی میں ہے کہ جو کچھ ہو کر رہنے والا ہے اس کی مخالفت نہ کی جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میرے لیے یہ دانش مندی کی بات نہیں ہوگی کہ اس مسئلے پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی مخالفت کی جائے۔

میں نے جواہرلال کو بتا دیا کہ میں غالباً ان کے خیالات کو قبول نہیں کر سکوں گا۔ میں نے خاصی صفائی کے ساتھ یہ بات دیکھی کہ ہم یکے بعد دیگرے غلط فیصلے کرتے جا رہے تھے۔ اپنی غلطیوں سے باز آنے کے بجائے ہم ایک دلدل میں اور گہرائی تک دھنستے چلے جا رہے تھے۔ مسلم لیگ نے کیبنیٹ مشن پلان کو منظور کر لیا تھا اور ہندستان کے مسئلے کا ایک اطمینان بخش حل نظر آ رہا تھا۔ یہی وہ منزل تھی جس پر بمبئی کی ایک پریس کانفرنس میں جواہرلال نے اپنا بدبختانہ اعلان کیا تھا۔ جب صدر کانگریس کی حیثیت سے انھوں نے یہ اعلان کر دیا کہ کانگریس نے

دستور ساز اسمبلی میں شرکت کے علاوہ اور کچھ بھی منظور نہیں کیا تھا، تو انھوں نے جناح کو یہ موقعہ دے دیا کہ وہ (کیبنیٹ مشن) پلان کی اپنی سابقہ قبولیت سے دست بردار ہو جائے۔

میں نے یہ دلیل دی کہ ہم سے دوسری غلطی اس وقت ہوئی جب لارڈ ویول نے یہ تجویز کیا کہ امور داخلہ کا محکمہ مسلم لیگ کو دے دیا جائے۔ یہ ہمارے لیے کسی ناقابلِ عبور مشکل کا سبب نہ بنتا۔ مگر چونکہ پٹیل نے اس محکمے کو اپنے پاس رکھنے پر اصرار کیا، اس لیے خود ہم نے مالیات کا محکمہ مسلم لیگ کو دے دیا۔ ہماری موجودہ مشکلات کی وجہ یہی تھی۔ اب ایک ایسی صورت حال اٹھ کھڑی ہوئی تھی جس میں ہم تقسیم کے جناح سے بھی بڑے حامی بنتے جا رہے تھے۔ میں نے جواہر لال کو متنبہ کیا کہ اگر ہم تقسیم پر رضامند ہو گئے تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ فیصلہ یہ کیا جائے گا کہ ہندوستان کو مسلم لیگ نے نہیں، بلکہ کانگریس نے تقسیم کیا تھا۔

اب، جبکہ سردار پٹیل اور یہاں تک کہ جواہر لال بھی تقسیم کے حامی بن چکے تھے۔ گاندھی جی ہی میری تنہا امید رہ گئے تھے۔ اسی دوران میں گاندھی جی پٹنہ میں مقیم تھے۔ اس سے پہلے انھوں نے چند ماہ نواکھالی میں گزارے تھے جہاں مقامی مسلمانوں پر انھوں نے گہرا اثر ڈالا اور ہندو مسلم اتحاد کی ایک نئی فضا پیدا کی۔ ہمیں توقع تھی کہ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کے لیے وہ دہلی آئیں گے، اور وہ واقعتاً اس مارچ کو آ گئے۔ میں فوراً ہی ان سے ملنے گیا اور ان کا بالکل پہلا فقرہ یہ تھا کہ 'تقسیم اب ایک خطرہ بن چکا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ولبھ بھائی اور یہاں تک کہ جواہر لال نے بھی ہتھیار ڈال دیے ہیں ——— اب آپ کیا کریں گے؟ آپ میرا ساتھ دیں گے یا آپ بھی بدل چکے ہیں؟'

میں نے جواب دیا۔ 'میں تقسیم کے خلاف تھا اور اب بھی ہوں۔ تقسیم کے لیے میری مخالفت جتنی شدید آج ہے اتنی کبھی نہیں رہی۔ بہر حال، میں یہ دیکھ کر پریشان ہوں کہ جواہر لال اور پٹیل تک نے شکست تسلیم کر لی ہے اور آپ کے لفظوں میں ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ میری تنہا امید اب آپ میں ہے۔ اگر آپ تقسیم کے خلاف کھڑے ہو جائیں۔ ہم اب بھی صورت حال کو سنبھال سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نے بھی چپ چاپ مان لیا تو۔ مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان برباد ہو جائے گا۔

گاندھی جی بولے۔ "یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے! اگر کانگریس تقسیم کو منظور کرنا چاہتی ہے، تو ایسا میری لاش پر ہی ہو سکے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں، میں ہندستان کی تقسیم کو کبھی بھی تسلیم نہیں کروں گا ——— نہ ہی میں، اگر مجھ سے یہ ہو سکا، کانگریس کو رضامندی کی اجازت دوں گا۔"

اسی روز بعد میں گاندھی جی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے ——— وہ اگلے روز بھی ان سے ملے، اور مزید ایک بار ۲ر اپریل کو ملے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اپنی پہلی ملاقات سے واپسی کے فوراً بعد پٹیل گاندھی جی کے پاس آئے اور دو گھنٹے سے زیادہ دیر تک تنہائی میں ان سے باتیں کرتے رہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ اس میٹنگ کے دوران کیا ہوا۔ لیکن جب میں دوبارہ گاندھی جی سے ملا تو مجھے یہ دیکھ کر اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا لگا کہ اب وہ بدل چکے تھے۔ وہ ابھی تک کھل کر تقسیم کے حق میں نہیں تھے مگر اب وہ پہلی شدو مد کے ساتھ اس کے خلاف نہیں بول رہے تھے۔ اس سے بھی حیران اور افسردہ مجھے جس بات نے کیا یہ تھی کہ وہ انہی دلیلوں کو دہرا رہے تھے جن کا استعمال سردار پٹیل پہلے کر چکے تھے۔ دو گھنٹے سے زیادہ میں نے ان سے بحث کی، لیکن میں ان پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔

مایوس ہو کر میں نے کہا، اگر اب آپ بھی ان خیالات کو اختیار کر چکے ہیں تو مجھے ہندستان کو تباہی سے بچانے کی کوئی امید دکھائی نہیں دیتی۔

گاندھی جی نے میری اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا، لیکن یہ کہا کہ وہ پہلے ہی یہ تجویز کر چکے ہیں کہ ہمیں جناح سے حکومت بنانے اور کابینہ کے اراکین کو چننے کی درخواست کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بھی وہ اس کا ذکر کر چکے تھے اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس خیال سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

میں جانتا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ جب گاندھی جی سے ان کی بات چیت کے اگلے روز میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ اگر کانگریس گاندھی جی کی تجویز مان لے تو اب بھی تقسیم سے بچا جا سکتا ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس سے اتفاق تھا کہ کانگریس کی طرف سے اس قسم کی پیشکش مسلم لیگ کو قائل کر دے گی اور شاید جناح کا اعتماد بھی

حاصل ہو جائے گا۔ بدقسمتی سے یہ بات آگے نہیں بڑھ سکی کیونکہ جواہر لال اور سردار پٹیل، دونوں نے شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ دراصل انھوں نے گاندھی جی کو تجویز واپس لینے پر مجبور کر دیا۔

گاندھی جی نے مجھے یہ بات یاد دلائی اور کہا کہ اب صورت حال ایسی تھی کہ تقسیم ناگزیر دکھائی دیتی تھی۔ صرف ایک سوال جس کا فیصلہ کرنا تھا یہ تھا کہ تقسیم کی شکل کیا ہونی چاہیے۔ یہی وہ سوال تھا جس پر اب گاندھی جی کے کیمپ میں رات دن بحث کی جا رہی تھی۔

میں نے پورے معاملے پر گہرائی کے ساتھ غور کیا۔ یہ کیسے ہوا کہ گاندھی جی نے اتنی جلدی اپنی رائے بدل دی؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ ایسا سردار پٹیل کے اثر کی وجہ سے ہوا۔ پٹیل کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ تقسیم کے سوا چارہ کار نہیں ہے۔ تجربے نے دکھا دیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ کام کرنا ناممکن تھا۔ ایک اور مصلحت غالباً سردار پٹیل کے حق میں جاتی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ دلیل دی تھی کہ کانگریس ایک کمزور مرکز پر صرف اس لیے رضامند ہوگئی تاکہ لیگ کے اعتراضات کا جواب دے سکے۔ صوبوں کو اسی لیے مکمل صوبائی خودمختاری دے دی۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جو زبان، فرقے اور ثقافت کی بنیاد پر اتنا بٹا ہوا تھا، کمزور مرکز لازمی طور پر علاحدگی پسند میلانات کو تقویت پہنچائے گا۔ اگر مسلم لیگ نہ ہوتی تو ہم ایک مضبوط مرکزی حکومت کا منصوبہ بنا سکتے تھے اور ایک ایسا آئین وضع کر سکتے تھے جو ہندستانی اتحاد کے نقطۂ نظر سے پسندیدہ ہوتا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ صلاح دی کہ بہتر یہ ہوگا کہ شمال مغرب اور شمال مشرق میں چند چھوٹے ٹکڑے دے دیے جائیں اور پھر ایک مضبوط اور مستحکم ہندستان کی تعمیر کی جائے۔ سردار پٹیل اس دلیل سے متاثر ہوئے تھے کہ مسلم لیگ کے ساتھ تعاون ہندستانی اتحاد اور طاقت کو خطرے میں ڈال دے گا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ ان دلیلوں نے سردار پٹیل کو ہی نہیں بلکہ جواہر لال کو بھی متاثر کیا تھا۔ یہی دلیلیں جب سردار پٹیل اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ذریعہ دہرائی گئیں تو گاندھی جی کی تقسیم کی مخالفت بھی کمزور پڑ گئی۔

میری کوشش شروع سے اخیر تک یہ رہی تھی کہ کیبنٹ مشن کے بارے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ایک اٹل موقف اختیار کرنے پر مائل کر دوں۔ جب تک گاندھی جی کا بھی یہی خیال رہا۔

میں ناامید نہیں ہوا۔ اب گاندھی جی کا طرزِ فکر تبدیل ہو گیا تو میں نے یہ سمجھ لیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن میری تجویز سے اتفاق نہیں کریں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کیبنیٹ مشن پلان کے سلسلے میں اتنے شدید احساسات نہ رکھتے ہوں کیونکہ وہ (پلان) ان کے ذہن کی پیداوار نہیں تھا۔ وہ تاریخ میں ایک ایسے شخص کے طور پر یاد کیے جانا چاہتے تھے جس نے ہندستان کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ اگر یہ حل ان کے وضع کیے ہوئے منصوبے کے مطابق ہوتا تو انھیں اور زیادہ داد ملتی۔ اس لیے یہ بات تعجب خیز نہیں کہ جیسے ہی انھوں نے کیبنیٹ مشن پلان کی مخالفت ہوتے دیکھی، انھوں نے اپنے خیالات کے مطابق وضع کردہ، تقسیم کا ایک نیا منصوبہ اس کے متبادل کے طور پر پیش کرنا چاہا۔

اب چونکہ ایسا لگتا تھا کہ لوگ بالعموم تقسیم پر راضی ہیں۔ بنگال اور پنجاب کے سوال نے ایک نئی اہمیت حاصل کر لی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ تقسیم چونکہ مسلم اکثریتی علاقوں کی بنیاد پر ہوئی ہے، اور چونکہ بنگال اور پنجاب دونوں میں ایسے علاقے ہیں جہاں مسلمان واضح طور پر اقلیت میں ہیں، اس لیے ان صوبوں کو بھی تقسیم کر دینا چاہیے۔ تاہم انھوں نے کانگریسی لیڈروں کو یہ مشورہ بھی دیا کہ فی الحال یہ سوال نہ اٹھائیں اور انھوں نے یقین دلایا کہ جب مناسب وقت آئے گا تو وہ خود ہی اس سوال کو اٹھائیں گے۔

گاندھی جی کے پٹنہ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے، میں نے ان سے ایک آخری اپیل کی۔ میں نے ان سے یہ بحث کی کہ موجودہ صورتِ حالات کو دو برس تک یونہی جاری رکھا جا سکتا ہے۔ عملاً اقتدار پہلے ہی سے ہندستانیوں کے ہاتھ میں تھا اور اگر اس (اقتدار) کی قانونی منتقلی دو برس کے لیے ٹال دی گئی تو اس سے کانگریس کو اور لیگ کو یہ موقع مل سکتا ہے کہ آپس میں کوئی سمجھوتا کر لیں۔ خود گاندھی جی نے چند ماہ پہلے ہی یہ تجویز کیا تھا اور میں نے انھیں یاد دلایا تھا کہ دو برس کی مدت کسی قوم کی تاریخ میں زیادہ طویل نہیں ہوتی۔ اگر ہم نے دو برس انتظار کر لیا تو مسلم لیگ مفاہمت پر مجبور ہو جائے گی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ اگر سرِدست فیصلہ کر لیا گیا تو تقسیم ناگزیر ہو گی مگر ایک یا دو برس بعد کوئی بہتر حل رونما ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی نے میری تجویز کو مسترد نہیں کیا، لیکن اس

کے لیے کسی پُرجوش دلچسپی کا اشارہ بھی انھوں نے نہیں کیا۔

اس وقت تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندستان کی تقسیم کے لیے خود اپنی تجویزیں وضع کرلی تھیں۔ اب انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ برطانوی حکومت سے گفتگو کے لیے وہ لندن جائیں گے اور اپنی تجاویز کے سلسلے میں اس کی منظوری حاصل کریں گے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اپنے منصوبے کے لیے وہ قدامت پسندوں CONSERVATIVES کی تائید بھی حاصل کرلیں گے۔ قدامت پسندوں نے کیبنیٹ مشن کی تجویز کی مخالفت علی الخصوص اس بنیاد پر کی تھی کہ اس نے ہندستان کی تقسیم کے لیے مسلم لیگ کے مطالبے کو پورا نہیں کیا تھا۔ اب جبکہ ماؤنٹ بیٹن کی تجویز ملک کی تقسیم پر ہی مبنی تھی تو مسٹر چرچل سے تائید کی توقع فطری تھی۔

۴ مئی کو جب کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنا اجلاس مکمل کرلیا، اس کے بعد میں شملہ چلا گیا۔ چند روز بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی آگئے۔ لندن کے لیے روانگی سے پہلے وہ تھوڑا آرام کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ ۱۵ مئی کو دلّی واپس جانے اور پھر ۱۸ تاریخ کو لندن کے لیے روانہ ہونے کا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ کیبنیٹ مشن پلان کو بچانے کی ایک آخری کوشش کروں گا، چنانچہ ۱۴ مئی کی رات کو مَیں نے وائسریگل لاج میں اُن سے ملاقات کی۔

ہم نے ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک گفتگو کی۔ مَیں نے ان سے گزارش کی کہ کیبنیٹ مشن کی تجویز کو دفن نہ کریں۔ مَیں نے ان سے کہا کہ ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ ابھی بھی یہ امید باقی تھی کہ پلان کامیاب ہوگا۔ اگر ہم نے جلد بازی کی اور تقسیم کو قبول کرلیا تو ہم ہندستان کو ایک مستقل نقصان پہنچائیں گے۔ ایک بار ملک تقسیم ہوگیا تو پھر کوئی بھی اندازہ نہیں کرسکتا کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے اور پھر واپسی کا کوئی امکان بھی نہیں ہوگا۔

مَیں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو یہ بھی بتایا کہ مسٹر ایٹلی اور ان کے رفقا غالباً آسانی کے ساتھ اس منصوبے سے دست بردار نہیں ہوں گے جسے خود اُنہی نے اتنی محنت کے

بعد وضع کیا تھا۔ اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی راضی ہو گئے اور محتاط رہنے کی ضرورت پر زور دیا تو کابینہ غالباً اس پر معترض نہیں ہوگی۔ ابھی تک یہ اصرار کانگریس ہی کرتی رہی تھی کہ ہندستان کو فوراً آزاد کر دینا چاہیے۔ اور اب کانگریس ہی نے یہ کہا تھا کہ ریاستی مسئلے کا حل برس دو برس کے لیے ٹال دیا جائے۔ بے شک، انگریز اگر کانگریس کی درخواست مان لیتے تو کوئی بھی انھیں موردِ الزام قرار نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی توجہ اس سوال کے ایک اور پہلو کی طرف مبذول کرائی۔ انگریزوں نے اگر اب مہلت سے کام لیا تو آزاد اور غیر جانب دار اہلِ نظر فطری طور پر یہی نتیجہ نکالیں گے کہ انگریزوں نے ہندستانیوں کو ایسے حالات میں آزادی دی جب وہ اس واقعے کا پورا فائدہ اٹھانے سے قاصر تھے۔ ہندستان کی خواہش کے خلاف زور دینا اور تقسیم کرنا یہی شبہ پیدا کرے گا کہ انگریزوں کی نیتیں صاف نہیں تھیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھے یقین دلایا کہ برطانوی کابینہ کے سامنے وہ صورت حال کی مکمل اور سچی تصویر رکھ دیں گے۔ پچھلے دو مہینوں میں انھوں نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، ایمانداری کے ساتھ اسی کا بیان کریں گے۔ وہ برطانوی کابینہ کو یہ بھی بتائیں گے کہ کانگریس کا ایک اہم حلقہ ایسا بھی تھا جو سال دو سال کے لیے فیصلے کو ملتوی کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ مسٹر ایٹلی اور سر سٹیفرڈ کرپس سے وہ یہ بتائیں گے کہ اس معاملے میں میرے خیالات کیا تھے۔ کسی آخری فیصلے تک پہنچنے سے پہلے برطانوی حکومت اپنے پیشِ نظر یہ سارا مواد رکھے گی۔

میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے یہ بھی کہا کہ وہ ملک کی تقسیم کے ممکنہ نتائج کو بھی ذہن میں رکھیں۔ تقسیم کے بغیر بھی کلکتہ، نواکھالی، بہار، بمبئی اور پنجاب میں فسادات ہوئے تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے کیے تھے اور مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملے کیے تھے۔ اگر اس طرح کے ماحول میں ملک کو تقسیم کیا گیا تو ملک کے مختلف حصوں میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی اور اس خون خرابے کی ذمے داری انگریزوں پر عاید کی جائے گی۔

ایک لمحے کی جھجک کے بغیر لارڈ ماؤنٹ نے جواب دیا۔ 'کم از کم اس سوال پر میں آپ

کو پورا پورا یقین دلاؤں گا۔ میں یہ دیکھوں گا کہ کوئی خون خرابہ اور فساد نہ ہونے پائے۔ میں ایک سپاہی ہوں، عام شہری نہیں۔ ایک بار اصولی سطح پر تقسیم کو قبول کر لیا گیا تو میں اس سلسلے میں احکامات جاری کر دوں گا کہ ملک میں کہیں بھی کوئی فرقہ وارانہ ہنگامہ نہ ہونے پائے۔ اگر ذرا سی بھی شورش ہوئی تو میں ایسے طریقے اختیار کروں گا کہ اسے اسی جگہ فوراً دبا دیا جائے۔ میں تو مسلح پولیس کا استعمال بھی نہیں کروں گا۔ میں (براہ راست) بری اور ہوائی فوج کو مداخلت کا حکم دوں گا۔ اور کوئی بھی شخص جو شرارت پر آمادہ ہو گا اس کی سرکوبی کے لیے ٹینکوں اور طیاروں کا استعمال کروں گا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھ پر یہ تاثر قائم کیا کہ وہ تقسیم کی کوئی واضح تصویر لے کر لندن نہیں جا رہے ہیں، نہ ہی کیبنٹ مشن پلان سے انھوں نے پوری طرح ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ بعد کے واقعات نے صورت حال کے بارے میں مجھے اپنا اندازہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے جو طرز عمل اس کے بعد اختیار کیا اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اپنا ذہن پہلے سے بنا چکے تھے اور اب لندن جا رہے ہیں تاکہ برطانوی کابینہ کو اپنا تقسیم کا منصوبہ قبول کرنے کی ترغیب دے سکیں۔ اُن کی باتوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ میرے شکوک رفع ہو جائیں۔ جو کچھ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے، اُس میں خود اُنھیں یقین نہیں تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے 'بہادرانہ' اعلانیے کا جو انجام سامنے آیا، وہ پوری دنیا کو معلوم ہے۔ تقسیم کے واقعتاً عمل میں آ جانے پر ملک کے وسیع حصوں میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہندستانی فوج بانٹ دی گئی اور بے گناہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا قتل روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا سکا۔

(۱۵)

ایک خواب کا خاتمہ

مجھے ایک کمزور سی امید تھی کہ لیبر کابینہ کیبنیٹ مشن پلان کی نامنظوری کو آسانی سے قبول نہیں کرے گی۔ کابینہ کے تین ممبروں نے اسے وضع کیا تھا جو لیبر حکومت کے بھی اہم ممبر تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت تک لارڈ پیتھک لارنس، سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندستان کے عہدے سے استعفیٰ دے چکے تھے، لیکن سر سٹیفرڈ کرپس اور مسٹر الیگزینڈر ابھی تک برطانوی کابینہ کے ممبر تھے۔ چنانچہ مجھے امید تھی کہ اس پلان کو بچانے کی وہ ایک آخری کوشش کریں گے۔ اسی لیے مجھے افسوس ہوا جب میں نے یہ سنا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے لندن پہنچنے کے بعد جلد ہی برطانوی کابینہ نے ان کی مجوزہ اسکیم منظور کر لی تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پلان کی تفصیلات ابھی تک شائع نہیں ہوئی تھیں، مگر مجھے معلوم تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ذہن میں ہندستان کی تقسیم ہے۔ ۳۰ مئی کو وہ دہلی واپس آئے اور ۲ جون کو انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں سے بات چیت کی۔ ۳ جون کو ایک قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) جاری کیا گیا جس میں پلان کی تمام تفصیلات دی گئی تھیں۔ برطانوی حکومت کا بیان ضمیمہ نمبر ۵ میں موجود ہے اور مجھے بس اتنا ہی کہنا ہے کہ میرے بدترین اندیشے صحیح ثابت ہوئے۔ تلافی کا واحد وسیلہ یہ اقرارنامہ تھا کہ ۳۰ جون ۱۹۴۸ء تک اقتدار ہندستانی ہاتھوں میں منتقل

کر دیا جائے گا، لیکن یہ اعلان مسٹر ایٹلی کے ذریعے پہلے ہی کیا جا چکا تھا اور اس میں کوئی نئی بات شامل نہیں کی گئی تھی۔ آزادی کی قیمت دو ریاستوں میں ہندوستان کی تقسیم تھی۔

اس بیان کی اشاعت کا مطلب ہندوستان کے اتحاد کی حفاظت سے متعلق تمام امیدوں کا خاتمہ تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کیبنٹ مشن پلان کو الگ کر دیا گیا اور تقسیم کو سرکاری سطح پر قبول کر لیا گیا۔ اس کی تشریح کرنے کی کوشش میں کہ لیبر حکومت نے اپنا رویّہ کیوں بدلا، میں اس تکلیف دہ نتیجے تک پہنچا کہ (لیبر) حکومت کی یہ کارروائی ہندوستانی مفادات سے زیادہ برطانوی حکومت کے مفادات کی تابع ہے۔ لیبر پارٹی کی ہمدردیاں ہمیشہ سے کانگریس کے ساتھ تھیں اور اس کے لیڈروں نے بہت بار کھل کر یہ بات کہی تھی کہ مسلم لیگ ایک رجعت پسند پارٹی ہے۔ (مگر اب) مسلم لیگ کے مطالبات کے سامنے اس کے سر جھکانے کا مطلب میری رائے میں مسلم لیگ کو خوش کرنے کی خواہش سے زیادہ برطانوی مفادات کے تحفظ کی خاطر اس کی اپنی تشویش تھی۔ اگر کیبنٹ مشن پلان کے مطابق ایک متحدہ ہندوستان آزاد ہوا ہوتا تو یہ امکان بہت کم تھا کہ ہندوستان کی اقتصادی اور صنعتی زندگی میں انگریز اپنی حیثیت کو قائم رکھ پاتے۔ اس کے برعکس ہندوستان کی تقسیم جس میں مسلم اکثریتی صوبے مل کر ایک الگ اور آزاد ریاست بناتے تھے۔ برطانیہ کو ہندوستان کی زندگی پر ایک مضبوط گرفت عطا کرتی تھی۔ ایسی ریاست جس میں مسلم لیگ برسرِ اقتدار ہو انگریزوں کو ایک مستقل حلقۂ اثر مہیا کرے گی۔ ہندوستان کے رویے پر بھی اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ اپنی سرحدوں پر ایک برطانوی اڈّے کی وجہ سے، ہندوستان کو برطانوی مفادات کا کہیں زیادہ لحاظ رکھنا پڑے گا ——— جو بصورت دیگر اسے نہ کرنا پڑتا۔

بہت دنوں سے یہ ایک کھلا ہوا سوال تھا کہ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان دولتِ متحدہ میں شامل رہے گا یا نہیں۔ کیبنٹ مشن پلان نے یہ انتخاب آزاد ہندوستان پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اسی وقت سر سٹیفرڈ کرپس کو بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے خود اپنی مرضی سے آزاد ہندوستان دولتِ متحدہ میں رہنے کا ہی فیصلہ کرے۔ ہندوستان کی تقسیم مادّی اعتبار سے

صورت حال کو برطانیہ کے موافق بنا دے گی ۔ مسلم لیگ کے مطالبے کے مطابق وجود میں آنے والی ایک نئی ریاست کا دولت متحدہ میں برقرار رہنا لازمی تھا ۔ اگر پاکستان یہ کرے گا تو ہندستان کو بھی کرنا پڑے گا ۔ لیبر حکومت پر ان تمام باتوں کا اثر پڑا ہو گا ۔ اس نے ہندستان کی آزادی کی حمایت کا عہد کیا تھا، لیکن وہ اس بات کو نہیں بھول سکتی تھی کہ سیاسی جدوجہد کے دوران کانگریس نے ہمیشہ انگریزوں کی مخالفت کی تھی جبکہ لیگ نے ہمیشہ اس کی حمایت کی تھی ۔ جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندستان کی تقسیم اور مسلم لیگ کو مطمئن کرنے کے لیے ایک نئی ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تو لیبر کابینہ کے بہت سے ممبروں کی طرف سے اس تجویز کا ہمدردانہ جواب ملا ۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جب کنزرویٹیو پارٹی سے ملے ہوں گے تو انھوں نے اس پہلو پر زور دیا ہو گا ۔ مسٹر چرچل کبھی بھی کیبنٹ مشن پلان کے حق میں نہیں تھے ۔ اس کی بہ نسبت وہ ماؤنٹ بیٹن کو اپنے ذوق سے کہیں زیادہ ہم آہنگ سمجھتے تھے اور پوری طرح اس کی حمایت کی تھی ۔ اس واقعے کا بھی لیبر حکومت نے لحاظ رکھا ہو گا کیونکہ کنزرویٹیو پارٹی کی حمایت سے ہندستان کی آزادی کے بل کی منظوری کا کام بہت آسان ہو گیا ہو گا ۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۳ جون کو اپنی میٹنگ کی اور نئی صورت حال کا جائزہ لیا ۔ جو نکات پہلے زیر بحث آئے ان میں شمال مغربی سرحدی صوبے کا مستقبل بھی تھا ۔ ماؤنٹ بیٹن پلان نے سرحد کے لیے ایک عجیب صورت حال پیدا کر دی تھی ۔ خان عبدالغفار خاں اور ان کی پارٹی نے ہمیشہ کانگریس کی حمایت اور مسلم لیگ کی مخالفت کی تھی ۔ خان بھائیوں کو لیگ اپنا جانی دشمن سمجھتی تھی ۔ لیگ کی مخالفت کے باوجود خان بھائیوں نے سرحد میں ایک کانگریسی حکومت قائم کر لی تھی اور یہ حکومت ابھی کام کر رہی تھی ۔ تقسیم ان خان بھائیوں کو اور کانگریس پارٹی کو ایک پریشان کن صورت حال سے دوچار کر دیتی ۔ دراصل، اس کی وجہ سے خان برادران اور ان کی خدائی خدمت گاروں کی پارٹی، لیگ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے جاتے ۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ گاندھی جی کا اپنے آپ کو بدل کر ماؤنٹ بیٹن پلان کا حامی بن جانا میرے لیے حیرت اور افسوس کا سبب تھا ۔ ورکنگ کمیٹی میں اب وہ کھلم کھلا تقسیم کی حمایت

میں بولتے تھے۔ چونکہ مجھے پہلے ہی سے ان کے ذہن کا کچھ اندازہ تھا، مجھے اس تبدیلی پر کچھ حیرانی نہیں ہوئی۔ البتہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ خان عبدالغفار خاں پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا ہوگا۔ وہ تو (یہ سننے کے بعد) ایک دم ششدر ہو کر رہ گئے اور کئی منٹ تک ان کی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلا۔ پھر انھوں نے ورکنگ کمیٹی سے اپیل کی اور اسے یاد دلایا کہ انھوں نے ہمیشہ کانگریس کی حمایت کی تھی۔ اب اگر کانگریس نے انھیں چھوڑ دیا تو سرحد پر اس کا ردِ عمل بھیانک ہوگا۔ ان کے دشمن ان پر ہنسیں گے اور ان کے دوست بھی یہ کہیں گے کہ کانگریس کو جس وقت تک سرحد (کے تعاون) کی ضرورت تھی، اس نے خدائی خدمت گاروں کی حمایت کی مگر جب کانگریس نے مسلم لیگ سے سمجھوتا کرنا چاہا، اس نے صوبۂ سرحد اور اس کے لیڈروں سے مشورہ تک کیے بغیر تقسیم کی مخالفت بند کر دی۔ خان عبدالغفار خاں نے بار بار کہا کہ سرحد کے لوگ اسے دغابازی کی حرکت سمجھیں گے اگر اب کانگریس نے خدائی خدمت گاروں کو بھیڑیوں کے حوالے کر دیا۔

گاندھی جی اس اپیل سے متاثر ہوئے اور کہا کہ وہ یہ معاملہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اٹھائیں گے۔ جب وہ وائسرائے سے ملے تو انھوں نے یہی کیا اور بولے کہ جب تک انھیں یہ اطمینان نہیں ہو جاتا کہ مسلم لیگ خدائی خدمت گاروں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرے گی، وہ تقسیم کے منصوبوں کی حمایت نہیں کر سکیں گے۔ وہ ان لوگوں کا ساتھ کیونکر چھوڑ سکتے ہیں جنھوں نے مشکلوں اور مصیبتوں کے دنوں میں ان کی مدد کی تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ اس معاملے پر وہ مسٹر جناح سے گفتگو کریں گے۔ اس بات چیت کے نتیجے میں مسٹر جناح نے خان عبدالغفار خاں سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ دونوں دہلی میں ملے مگر گفتگو بے نتیجہ رہی۔ یہ بات حیران کن نہیں تھی۔ جب کانگریس نے تقسیم کو قبول کر ہی لیا تو پھر خان عبدالغفار خاں کی پارٹی کا مستقبل ہو بھی کیا سکتا تھا؟ —— ماؤنٹ بیٹن پلان اس اصول پر مبنی تھا کہ مسلم اکثریتی صوبوں کو الگ کر دینا چاہیے اور ان کی ایک علاحدہ ریاست بنا دینی چاہیے۔ سرحد میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت تھی۔ چنانچہ اسے لازمًا پاکستان میں شامل ہونا تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی سرحد پاکستان کے مجوزہ علاقوں کے اندر پڑتا تھا۔ دراصل ہندستان سے اس کا کوئی نقطۂ اتصال ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ صوبوں کو انتخاب کا موقع دیا جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ حق خود اختیاری کی بنیاد پر سرحد کو اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے سرحد پاکستان میں شامل ہو یا ہندستان میں، ایک ریفرنڈم بھی کرایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب نے جو ابھی تک سرحد کے وزیر اعلا تھے، ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں اس منزل پر آکر شرکت کی ——— لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنے استصواب رائے کے منصوبے کے بارے میں انھیں بتا چکے تھے اور ڈاکٹر خان صاحب سے یہ پوچھ چکے تھے کہ انھیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلا تھے کیونکہ انھیں اپنے ساتھ اکثریت کی حمایت کا دعوا تھا۔ چنانچہ استصواب رائے کی تجویز پر وہ اعتراض نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے، بہر حال، ایک نیا مسئلہ اٹھا دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر کوئی استصواب رائے ہو تو سرحد کے پٹھانوں کو پختونستان کے حق میں رائے دینے کا اختیار بھی ہونا چاہیے جو ان کی اپنی ریاست ہوگی۔

واقعہ یہ تھا کہ خان برادران سرحد میں اتنے طاقت ور نہیں تھے جتنا کہ کانگریس سمجھتی تھی۔ تقسیم کے لیے تحریک شروع ہونے کے بعد ان کا اثر کم ہو گیا تھا۔ اب جبکہ پاکستان کی منزل سامنے تھی اور مسلم اکثریتی صوبوں سے ایک آزاد ریاست کی تشکیل کا موقع دیے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا، پورے سرحد میں ایک جذباتی انقلاب کی لہر دوڑ گئی تھی۔ پاکستان کی تحریک کو مزید تقویت انگریز افسروں کی سرگرمیوں سے ملی جو کھل کر پاکستان کی تائید کرتے تھے اور سرحد کے قبائلی سرداروں کی اکثریت کو یہ ترغیب دیتے تھے کہ وہ مسلم لیگ کی حمایت کریں۔

ڈاکٹر خان صاحب نے دیکھ لیا کہ سرحد کی قیادت کو برقرار رکھنے کا واحد موقع ان کے لیے اسی میں تھا کہ پختونستان کے مطالبے کا نعرہ بلند کریں۔ بہت سے پٹھان اپنی ایک چھوٹی سی ریاست کو ترجیح دیں گے کیونکہ انھیں پنجابیوں کے تسلط کا خوف تھا۔ بہر حال، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کسی نئے مطالبے کے بارے میں سننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی تجویز کو حتی الامکان جلد از جلد عمل میں لانا چاہتے تھے اور ایک آزاد پختونستان کے سوال پر تو تفصیلی بحث بھی نہیں کی گئی۔

چونکہ یہ آخری موقع تھا جب خان بھائیوں نے کانگریس سے گفتگو میں حصہ لیا، میں

اس منزل پر مختصراً یہ بیان کر سکتا ہوں کہ تقسیم کے فوراً پہلے اور بعد ان کے ساتھ کیا ہوا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کانگریس اب تقسیم کی ہمنوا ہو چکی ہے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ استصواب رائے سے تو وہ غالباً انکار نہیں کر سکتے تھے ——— اس کا مطلب یہ اعتراف ہوتا کہ انھیں اپنے لوگوں کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ وہ واپس پشاور گئے اور اپنے دوستوں سے مشورے کے بعد، انھوں نے سرحد کی آزادی کا نعرہ بلند کر دیا۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے سرحدی کانگریس کے فیصلے کی توثیق کر دی تھی جس کے تحت خان عبدالغفار خاں کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ اپنے صوبے کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے جو کارروائی مناسب سمجھیں وہ کریں۔ سرحدی کانگریس اب ایک آزاد پٹھان ریاست کا مطالبہ کر رہی تھی جس کا آئین جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف کے اسلامی تصور کی بنیاد پر وضع کیا گیا ہو۔ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے، خان عبدالغفار خاں نے کہا کہ سرحدی پٹھانوں کی ایک اپنی امتیازی تاریخ اور ثقافت تھی، اور تاوقتیکہ انھیں اپنے اداروں کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے کی مکمل آزادی حاصل ہو، اسے بچائے رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ رائے شماری صرف پاکستان اور ہندستان میں سے ایک کو منتخب کر لینے کی بنیاد پر نہ ہو، بلکہ ان کے سامنے ایک تیسرا راستہ آزاد پختونستان کے حق میں رائے دینے کا بھی ہونا چاہیے۔ صرف اسی طرح استصواب رائے صحیح ہوگا اور حقیقی معنوں میں عوام کی رضامندی کا ترجمان ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو استصواب رائے بے معنی ہو کر رہ جائے گا کیونکہ پختون لوگ پاکستان میں دوسرے عناصر کے ذریعہ جذب ہو کر رہ جائیں گے۔ کئی اسباب کی بنا پر یہ سوچا جا سکتا ہے کہ اگر استصواب رائے میں آزاد پختونستان کا مسئلہ شامل کر لیا گیا ہوتا تو اگر سرحد والوں کی اکثریت نہیں، پھر بھی بہت بڑی تعداد نے اس کے حق میں ووٹ دیے ہوتے۔ انھیں پنجابیوں کے ذریعہ نگل لیے جانے کا ڈر تھا اور صرف یہی ایک واقعہ انھیں پاکستان کے خلاف ووٹ دینے کے لیے بہلائے جاتا۔

بہر نوع، نہ تو مسٹر جناح اور نہ ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس مطالبے کو تسلیم کرنے پر آمادہ

بدبختانہ صورت حال کا نتیجہ تھا۔ ہندستان کے لیے تقسیم ایک المیہ تھا اور اکیلی ایک بات جو اس کی حمایت میں کہی جا سکتی تھی۔ یہ تھی کہ ہم نے بٹوارے کو ٹالنے کی بھرپور کوشش کی تھی، مگر ہم ناکام رہے تھے۔ اب کوئی اور راستہ نہیں تھا اور اگر ہم ابھی اور اسی جگہ آزادی چاہتے تھے تو ہمیں ہندستان کی تقسیم کے مطالبے کے سامنے سر جھکانا تھا۔ ہمیں، بہرحال، یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قوم ایک ہے اور اس کی ثقافتی زندگی ایک ہے اور ایک رہے گی۔ ہم سیاسی سطح پر ناکام رہے اور اسی لیے ہم ملک کو تقسیم کر رہے تھے۔ ہمیں اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے اس یقین کو قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری ثقافت کا بٹوارہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر پانی میں ہم ایک چھڑی رکھ دیں تو بظاہر ایسا لگے گا کہ پانی بٹ گیا ہے لیکن پانی تو جوں کا توں رہتا ہے اور جیسے ہی چھڑی ہٹائی جاتی ہے تو ظاہری تقسیم بھی ختم ہو جاتی ہے۔

سردار پٹیل کو میری تقریر اچھی نہیں لگی۔ انھوں نے اپنی تقریباً تمام تقریر، میں نے جو کچھ کہا تھا، اس کی تردید میں صرف کر دی۔ انھوں نے یہ دلیل دی کہ تقسیم کے لیے قرارداد کسی کمزوری یا مجبوری کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ ہندستان کے موجودہ حالات میں یہی ایک صحیح حل تھا۔

اس عظیم المیے کے درمیان بھی مزاح کے کچھ پہلو موجود تھے۔ کانگریس میں ایک گروپ ایسے لوگوں کا رہا ہے جو قوم پرست ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں مگر اپنے رویے میں واقعہ یہ ہے کہ بکیر فرقہ پرست رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ یہ دلیل دی ہے کہ ہندستان کی کوئی مشترکہ ثقافت نہیں ہے اور ان کا خیال ہے کہ کانگریس چاہے جو کہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی زندگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ رجعت پرستوں کے اس گروہ کے شاید سب سے زیادہ کھل کر اپنا اظہار کرنے والے رکن شری پرشوتم داس ٹنڈن تھے۔ حیرانی یہ دیکھ کر ہوئی کہ اچانک وہ پلیٹ فارم پر ہندستان کے اتحاد کے عظیم ترین علم بردار بن کر نمودار ہوئے۔

شری ٹنڈن نے شدومد کے ساتھ قرارداد کی مخالفت کی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ ہندستان کی ثقافتی اور قومی زندگی کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، اس سے

مجھے اتفاق تھا۔ مجھے اس میں شک نہیں تھا کہ انھوں نے اب جو کچھ کہا وہ بھی صحیح تھا۔ مگر، بہر حال، میں یہ نہیں بھول سکتا تھا کہ وہ اور ان کے ساتھی عمر بھر اسی نظریے کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ یہ بات عجیب تھی کہ اب آخری وقت میں وہ غیر منقسم ہندستان کی آواز بلند کر رہے تھے۔

پہلے روز کے مباحثے کے بعد، ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کے خلاف احساسات بہت شدید تھے۔ نہ تو پنڈت پنت کی ترغیبی صلاحیت اور نہ ہی سردار پٹیل کی طلاقت لسانی لوگوں کو یہ قرارداد منظور کرنے پر مائل کر سکی۔ وہ یہ کر بھی کس طرح سکتے تھے جب کہ ایک معنیٰ میں یہ اس سب کی مکمل نفی تھا جو کانگریس اپنے روزِ قیام سے کہتی آئی تھی؟ اس لیے یہ ضروری ہو گیا کہ گاندھی جی مباحثے میں مداخلت کریں۔ انھوں نے ممبروں سے اپیل کی کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی حمایت کریں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ہمیشہ سے تقسیم کے مخالف تھے اور کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ بہر حال، وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جب کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ سیاسی حقیقت پسندی ماؤنٹ بیٹن کے پلان کو قبول کرنے کا مطالبہ کرتی تھی اور وہ ممبروں سے اپیل کریں گے کہ پنڈت پنت کی پیش کی ہوئی قرارداد کو منظور کر لیں۔

جب قرارداد ووٹ کے لیے سامنے رکھی گئی تو انتیس ووٹ اس کی حمایت میں پڑے، پندرہ مخالفت میں ——— حتیٰ کہ گاندھی جی کی اپیل بھی اس سے زیادہ ممبروں کو ملک کی تقسیم کے حق میں ووٹ دینے پر مائل نہ کر سکی!

قرارداد بے شک منظور ہو گئی، مگر لوگوں کے ذہن کی حالت کیا تھی؟ سب کے دل تقسیم کے خیال سے بوجھل تھے۔ کوئی بھی شخص مشکل ہی سے قرارداد کو ذہنی تحفظات کے بغیر منظور کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی، جنھوں نے تقسیم کو قبول کر لیا، ان کے تمام احساسات بھی اس کے خلاف تھے۔ یہ خاصی بڑی بات تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ برا وہ فتنہ انگیز فرقہ وارانہ پروپیگنڈہ تھا جو ہر طرف عام ہوتا جا رہا تھا۔ کانگریسی حلقوں میں کھلے عام یہ کہا جا رہا تھا کہ پاکستان میں ہندوؤں کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ساڑھے چار کروڑ

مسلمان ہندستان میں رہیں گے اور اگر پاکستان میں ہندوؤں پر کوئی ظلم ہوا تو اس کا نتیجہ ہندستان میں مسلمانوں کو بھگتنا پڑے گا۔

اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی میٹنگ میں سندھ کے ممبروں نے زور و شور کے ساتھ قرارداد کی مخالفت کی۔ انھیں ہر طرح کے یقین دلائے گئے تھے۔ پبلک پلیٹ فارم پر تو نہیں، مگر نجی بات چیت میں ان سے کہا جاتا تھا کہ اگر انھیں پاکستان میں کسی طرح کی رکاوٹیں یا ذلتیں جھیلنی پڑیں تو ہندستان اس کا بدلہ ہندستانی مسلمانوں سے لے گا۔

جب پہلے پہل مجھے اس طرح کی تجاویز کا پتہ چلا تو مجھے صدمہ ہوا۔ میں نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ ایک خطرناک جذبہ تھا اور اس کے نتائج بہت افسوسناک اور دوررس ہو سکتے تھے۔ اس میں یہ مفہوم بھی مضمر تھا کہ تقسیم کو اس بنیاد پر تسلیم کیا جا رہا تھا کہ ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ یرغمال رکھے جائیں گے جو دوسری ریاست میں اقلیتی فرقے کے تحفظ کے ذمے دار ہوں گے۔ انتقام کا یہ خیال اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے ایک طریقے کے طور پر مجھے وحشیانہ معلوم ہوا ——— بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ میرے اندیشے کتنے حق بجانب تھے۔ خون کی وہ ندی جو تقسیم کے بعد نئی سرحد کے دونوں طرف بہی، یرغمالوں اور انتقام سے متعلق اسی جذبے سے نمودار ہوئی تھی۔

کانگریس کے کچھ اراکین سمجھتے تھے کہ اس قسم کے نظریات کتنے خطرناک تھے۔ مجھے خاص طور پر، بنگال کے کانگریسی لیڈروں میں سے ایک، کرن شنکر راؤ یاد ہیں جنھوں نے پہلے مجھے اس طرف توجہ دلائی ——— انھوں نے آچاریہ کرپلانی سے بھی بات کی جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے، اور اس کی نشاندہی کی کہ یہ ایک انتہائی خطرناک نظریہ تھا۔ اگر ایک بار اس طرح کے احساس کو پنپنے کی اجازت دے دی گئی تو اس کے نتیجے میں پاکستان میں ہندو اور ہندستان میں مسلمان جبر اور قتل کے شکار ہوں گے۔ مگر کسی نے بھی کرن شنکر راؤ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ دراصل، بہتوں نے تو ان کے اندیشوں کے لیے ان کی ہنسی بھی اڑائی۔ انھوں نے ان سے یہ بھی کہا کہ ایک بار ہندستان بٹ جائے، پھر یرغمال بنانے کا نظریہ بھی ہمیں ماننا پڑے گا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ صرف اسی طریقے سے پاکستان کے ہندوؤں کی حفاظت کی جا سکتی تھی۔

کرن شنکر راؤ قائل نہیں ہوئے اور میرے پاس تقریباً آنسوؤں کے ساتھ آئے۔ انھوں نے ان یقین دہانیوں کو کبھی قبول نہیں کیا جو بعض کانگریسی لیڈروں نے دی تھیں اور وہ اپنے بدترین خدشات کو پورا ہوتے ہوئے دیکھنے کے لیے زندہ رہے۔

شروع میں برطانوی حکومت نے اقتدار کی منتقلی کے انتظامات مکمل کرنے کے لیے پندرہ مہینوں کی مدت مقرر کی تھی۔ دراصل ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو مسٹر ایٹلی نے وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی تھی کہ برطانوی حکومت، جون ۱۹۴۸ء سے پہلے کی کسی تاریخ تک ذمے دار ہندستانی ہاتھوں میں اقتدار کی منتقلی کا مصمم ارادہ رکھتی ہے۔ بہرحال ۲۰ فروری اور ۳ جون کے درمیان بہت کچھ ہوچکا تھا۔ اب، جبکہ تقسیم کا منصوبہ منظور ہوچکا تھا لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کیا کہ اس اسکیم کو جتنی جلد ہوسکے بروئے کار لایا جائے۔ ان کے مقاصد شاید ملے جلے تھے۔ ایک طرف وہ چاہتے تھے کہ انگریزوں کو ہندستانی ہاتھوں میں ذمے داری جتنی جلدی ممکن ہو سونپ دینی چاہیے۔ دوسری طرف انھیں غالباً یہ خدشات بھی تھے کہ تاخیر کی وجہ سے ان کے منصوبے میں نئی رکاوٹیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ کیبنٹ مشن پلان کے انجام نے ظاہر کردیا تھا کہ اس کے اطلاق میں تاخیر کے باعث دوبارہ سوچنے کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بالآخر پلان کو مسترد کردیا گیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے لیے تین ماہ کی مدت رکھی جس میں انھیں تقسیم کی کارروائی پوری کرنی تھی۔ یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا، اور میں نے اتنے کم وقت میں ایک اس قدر پیچیدہ منصوبے کی تکمیل کے امکان کی بابت کھل کر اپنے شکوک کا اظہار کیا۔ مجھے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس مستعدی اور لیاقت کے لیے جس کے ساتھ انھوں نے یہ مرحلہ طے کیا، خراج تحسین پیش کرنا چاہیے۔ انھیں تفصیلات پر اتنی مہارت حاصل تھی اور وہ اس تیزی کے ساتھ چیزوں کو سمجھتے تھے کہ تین مہینے سے کم مدت میں تمام مسائل حل کردیے گئے اور اگست ۱۹۴۷ء میں ہندستان دو ریاستوں میں منقسم کردیا گیا۔

دو ریاستوں کے قیام سے متعلق اٹھنے والے مختلف پرپیچ مسئلوں سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن جس ماہرانہ انداز میں سبک دوش ہوئے اس کی میں بس ایک مثال دوں گا، جیسے

ہی یہ معلوم ہوا کہ ہندستان کو تقسیم کیا جانے والا ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں نے مبالغہ آمیز دعوے کرنا شروع کر دیے پورے ملک میں جہاں تہاں ہنگامے ہو رہے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں کلکتے کے قتلِ عام کے بعد نواکھالی اور بہار میں فساد ہوئے تھے۔ پنجاب میں فسادات مارچ میں شروع ہوئے۔ ابتداءً لاہور تک محدود رہنے کے بعد، یہ ہنگامے پھیل گئے اور جلدی ہی راولپنڈی میں اور اس کے اطراف وسیع علاقے خون خرابے کی زد میں آگئے۔ لاہور تو واقعتاً میدانِ جنگ بن گیا جس کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو لوگ فرقہ پرست تھے لڑنے لگے ——— ہندوؤں اور سکھوں کے نمائندوں نے کانگریس کو یہ سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ لاہور کو لازماً ہندستان میں برقرار رکھنا چاہیے۔ انھوں نے یہ نشاندہی کی کہ پنجاب کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کو مرکزیت لاہور میں حاصل ہے اور اگر یہ پاکستان کو مل گیا تو پنجاب مستقل طور پر مفلوج ہو کر رہ جائے گا۔ اسی لیے بہتوں نے زور دیا کہ کانگریس کو لاہور کا مسئلہ اٹھانا چاہیے۔ کانگریس اس تجویز سے متفق نہیں ہوئی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اس سوال کا آبادی کی خواہش کے مطابق فیصلہ کیا جانا چاہیے۔

مسلمانوں، ہندوؤں اور اسی کے ساتھ ساتھ سکھوں کے بعض حلقے سوچتے تھے کہ لاہور کا مسئلہ تشدد کا طریقہ اختیار کر کے طے کیا جا سکتا تھا۔ عام طور پر دیکھا جائے تو لاہور اور اس کے گرد و نواح میں املاک کے مالک طبقات ہندو تھے۔ مسلمانوں نے سوچا کہ ہندوؤں کو سب سے زیادہ تکلیف، وہ ان کی املاک کو تباہ کر کے اور معاشی سطح پر انھیں نقصان پہنچا کر دے سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے کارخانے اور مکانات جلا دیے اور بغیر کسی تفریق کے غیر مسلموں کی جائداد لوٹ لی۔ لاہور میں ہندوؤں کے بعض حلقوں نے انتقاماً مسلمانوں کو قتل کیا ——— ان کے پاس دولت تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح حملے مسلمانوں کو لاہور سے مار بھگائیں گے اور وہاں ان کی اکثریت یقینی ہو جائے گی۔ کھلے عام یہ کہا جاتا تھا کہ اس جھگڑے میں ——— جہاں ایک فریق مال پر حملہ کرتا ہے اور دوسرا جان پر ——— فرقہ پرست جماعتوں کے اہم لیڈران براہ راست یا بالواسطہ طور پر ملوث تھے۔ چنانچہ یہ اطلاع دور دور تک پہنچائی گئی اور بالعموم اس پر یقین کیا گیا

کہ مسلم لیگ کے لیڈر، مرکزی بھی اور صوبائی بھی۔ دونوں ہندوؤں پر حملے منظم کر رہے ہیں۔ اسی طرح، ہندو مہاسبھا کے لیڈروں پر مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو اکسانے کا الزام تھا۔

تقریباً ایک مساوی صورت حال کلکتے میں رونما ہو چکی تھی۔ مسلم لیگ کے حامیوں کا اصرار تھا کہ کلکتہ پاکستان کو ملنا چاہیے جب کہ وہ تمام لوگ جو لیگ کے خلاف تھے، انھیں یہ فکر تھی کہ کلکتے کی شمولیت ہندستان میں برقرار رہنی چاہیے۔

یہ تھی وہ صورت حال جس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم پر توجہ دی ——— فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ صوبائی اسمبلی میں ووٹوں کے ذریعہ یہ طے کیا جائے گا کہ ان صوبوں کو تقسیم کیا بھی جانا چاہیے یا یہ کہ انھیں جوں کا توں ہندستان یا پاکستان میں شامل کر دیا جانا چاہیے۔ بنگال اور پنجاب دونوں اسمبلیوں نے تقسیم کے حق میں ووٹ دیے اور یہ طے کرنا ضروری ہو گیا کہ دونوں نئے صوبوں کی حدیں کیا ہوں گی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک حد بندی کمیشن اس سوال سے نمٹنے کے لیے مقرر کیا اور مسٹر ریڈ کلف سے کہا کہ وہ اس کام کو سنبھالیں۔ اس وقت مسٹر ریڈ کلف شملہ میں تھے۔ انھوں نے یہ تقرر منظور کر لیا مگر یہ تجویز کیا کہ اپنا سروے وہ جولائی کے اوائل میں شروع کریں گے۔ انھوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ جون کی گرمی میں پنجاب کی زمینوں کا سروے کرنا تقریباً ناممکن ہوگا اور اگر بہر حال جولائی میں یہ کام کیا گیا تو صرف تین یا چار ہفتوں کی تاخیر ہوگی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان سے کہا کہ وہ ایک دن کی تاخیر کے لیے بھی تیار نہیں ہیں اور تین یا چار ہفتوں کے التوا کی تجویز کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ان کے احکامات کی تعمیل کی گئی۔ یہ صرف ایک مثال ہے اس مستعدی اور کار پردازی کی جس کے ساتھ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کام کرتے تھے۔

ایک دوسرا مسئلہ جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو درپیش تھا حکومتِ ہند کے اثاثوں اور دفاتر کی تقسیم کا تھا۔ حتیٰ کہ ان صوبوں کے سلسلے میں بھی مشکلات تھیں جو پورے کے پورے ایک یا دوسری ریاست میں شامل ہو گئے تھے۔ ان صوبوں سے متعلق دستاویزات کو جو

پاکستان میں چلے گئے تھے، الگ کرنا تھا اور پاکستان بھیجنا تھا۔ وہ صوبے جو تقسیم ہو گئے تھے ان کے معاملے میں یہ مرحلہ مزید سخت تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے شخصی طور پر بیشتر انتظامات کی نگرانی کی اور اس مقصد کے لیے انھوں نے جس کمیٹی کا تقرر کیا تھا، اس نے ہر سوال کو پیدا ہوتے ہی طے کر دیا۔

اس سے بھی زیادہ دشوار مسئلے ملک کی مالیات کے بٹوارے اور فوج کی تقسیم کے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی معاملہ فہمی اور قوت عمل کے سامنے کوئی رکاوٹ بہت بڑی ثابت نہیں ہوئی۔ مالیات کے پیچیدہ ترین مسائل معینہ مدت کے اندر طے کر دیے گئے۔

فوج کے سلسلے میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ پاکستان کے پاس فوج کا ایک چوتھائی حصہ ہونا چاہیے اور ہندستان کے پاس تین چوتھائی، یہ سوال اٹھا کہ کیا فوج کو فوراً تقسیم کر دیا جائے یا دو یا تین برس کے لیے اسے ایک متحدہ کمان کے تحت کام کرنے دیا جائے — فوجی کمانڈروں نے صلاح دی کہ اس مدت کے دوران عام اسٹاف مشترکہ ہونا چاہیے میں ان کے دلائل سے متاثر ہوا اور ان کی تائید کی۔ ان اسباب سے قطع نظر جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پیش کیے تھے، میرے پاس کچھ اپنی دلیلیں بھی تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ تقسیم کے بعد بدامنی اور فسادات پھیل جائیں گے۔ میں نے سوچا کہ اس سیاق میں ایک مشترکہ فوج ہندستان کی بہتر خدمت کر سکے گی، میں اپنے ذہن میں صاف تھا کہ اگر صورت حال کو بچانا ہے تو ہمیں فوج کے اندر فرقہ وارانہ بٹوارے نہیں کرنے چاہئیں۔ اگر فوج کو سیاست سے باہر رکھا گیا، ان کی ڈسپلن اور غیر جانبداری قائم رہے گی۔ اسی لیے میں نے ایک متحدہ کمان پر زور دیا اور میں ان الفاظ کو ضبط تحریر میں لانا چاہتا ہوں کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے میرے موقف کی حمایت کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر فوج متحدہ رہتی تو ہم آزادی کے فوراً بعد بہنے والی خون کی ندیوں سے بچ سکتے تھے۔

یہ کہتے ہوئے مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میرے رفقا نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا اور پرزور طریقے سے میری مخالفت کی۔ سب سے زیادہ حیرانی مجھے جس بات پر ہوئی وہ ڈاکٹر راجندر پرساد کی

مخالفت کی تھی۔ وہ امن پسند تھے اور عدم تشدد ان کا مسلک تھا۔ اس اصرار میں کہ فوج کو تقسیم کر دیا جائے، اب وہی پیش پیش تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہندستان دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا تو کسی متحدہ فوج کو ایک دن کے لیے بھی نہ تو باقی رکھا جا سکتا ہے، نہ ایسا کرنا چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ یہ ایک خطرناک فیصلہ تھا۔ اس نے فوج کو فرقوں کی بنیاد پر تقسیم کر دیا۔ مسلمان دستے پاکستان کے حصے میں چلے گئے، اور ہندو اور سکھ دستے ہندستان ہی میں رہے۔ اس نے فوج میں بھی فرقہ پرستی کا زہر پھیلا دیا جو اب تک اس سے بچی ہوئی تھی۔ جب ۱۵ اگست کے بعد بے گناہ مردوں اور عورتوں کا خون سرحد کے دونوں طرف بہا تو فوج خاموش تماشائی بنی رہی۔ اس سے زیادہ بُرا یہ ہوا کہ بعض معاملات میں فوجی خود بھی اس لڑائی میں شامل ہو گئے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھ سے یہ بات غصے سے زیادہ افسوس کے ساتھ کہی کہ مشرقی پنجاب میں فوج کے ہندستانی اراکین مسلمانوں کے قتل میں شریک ہونا چاہتے تھے مگر انگریز افسروں نے بڑی مشکل سے انھیں روکا۔ یہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی رپورٹ تھی اور میں پوری طرح یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ انگریز افسروں کے بارے میں یہ بیان کہاں تک درست ہے۔ بہرحال، اپنے ذاتی علم کی بناء پر مجھے یہ پتہ ہے کہ سابقہ غیر منقسم ہندستانی فوج نے پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو قتل کیا اور ہندستان میں مسلمانوں کو ——— ہندستانی فوج کی شاندار روایت منتشر ہو گئی اور ان کے اب تک کے قابل فخر ریکارڈ پر ایک دھبہ لگ گیا۔

سرکاری ملازمتوں کے بارے میں میری تجویز یہ تھی کہ انھیں فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم نہیں کیا جانا چاہیے۔ سیاسی احتیاج نے ہمیں ملک کی تقسیم کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا تھا، لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ سرکاری کارکنوں کو ان کے اپنے علاقوں سے اکھاڑ دیا جائے۔ میرا خیال تھا کہ تمام ملازمت پیشہ لوگوں کو ان کے اپنے صوبوں میں برقرار رکھنا چاہیے۔ چنانچہ مغربی پنجاب، سندھ یا مشرقی بنگال کے ملازمین کو، خواہ کسی بھی فرقے سے متعلق رہے ہوں، پاکستان میں رہنا چاہیے۔ اسی طرح وہ ملازمین جن کا تعلق ہندستانی صوبوں سے تھا، انھیں

قطع نظر اس تفریق کے کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان، ہندستان کی خدمت کرنی چاہیے۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم کم از کم ملازمتوں سے فرقہ وارانہ جذبات کو باہر رکھ سکے، تو دونوں ریاستوں میں ایک بہتر ماحول برقرار رکھا جا سکے گا۔ اس طرح انتظامیہ فرقہ واریت کے زہر سے بچا رہے گا اور ہر ریاست کی اقلیتیں۔ اپنے تحفظ کا بہتر احساس کرسکیں گی ——— مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہے کہ میری منتیں لاحاصل رہیں۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ تمام سرکاری کارکنوں کو ہندستان یا پاکستان کے انتخاب کا حق دیا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً کسی استثناء کے بغیر، ہندوؤں اور سکھوں نے ہندستان کا انتخاب کیا اور مسلمانوں نے پاکستان کا۔

اس مسئلے پر میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مفصل گفتگو کی۔ میں نے اس امر کی نشاندہی کی کہ فوج کو اور سرکاری ملازمتوں کو فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کرنا کس درجہ خطرناک تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھ سے اتفاق کیا اور میرے موقف کی حمایت کے لیے حتی الامکان کوشش کی۔ جہاں تک فوج کا تعلق تھا، انھیں کوئی کامیابی نہیں ملی۔ سرکاری کارکنوں کے سلسلے میں ان کی کوششوں کا واحد نتیجہ یہ ہوا کہ ملازمین کو مستقل یا عارضی طور پر انتخاب کا حق دے دیا گیا۔ ایسے لوگ جنھوں نے عارضی طور پر اپنا حق انتخاب استعمال کیا، انھیں چھ مہینے کی مدت کے اندر اپنے فیصلے پر نظرثانی کا حق بھی دیا گیا۔ دونوں ریاستوں نے یہ ضمانت دی کہ وہ لوگ جو اس طریقے سے اپنے انتخاب پر نظرثانی کریں گے، انھیں واپس لے لیا جائے گا ——— مجھے یہ بات افسوس کے ساتھ کہنی ہے گرچہ یہ سنجیدہ یقین دہانی کی گئی تھی مگر وہ بدقسمت افراد جنھوں نے عارضی طور پر یہ انتخاب کیا ان کے ساتھ کسی بھی ریاست میں ہمیشہ منصفانہ سلوک نہیں ہوا۔

مجھے یہ کہتے ہوئے بھی افسوس ہے کہ مسلم لیگ نے انتخاب کو بروئے کار لانے کے معاملے میں بھی نادانی اور بے بصری سے کام لیا۔ اس نے تمام مسلمانوں کو پاکستان کا انتخاب کرنے اور ہندستان کو چھوڑ دینے پر اکسایا۔ اس وقت مرکزی دفاتر میں بہت سی کلیدی جگہوں پر مسلمان مامور تھے۔ مسلم لیگ نے ان سب پر دباؤ ڈالا کہ ہندستان چھوڑ دیں۔ جو لوگ خود تیار نہیں ہوئے انھیں ہر طرح کی رپورٹوں سے ڈرایا گیا کہ کانگریس کے مسلمہ طور پر برسر اقتدار آجانے کے بعد ان کا حشر کیا ہوگا۔ چونکہ اس طرح کی افواہیں مسلمان ملازمین میں خاصی گھبراہٹ

پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے حکومتِ ہند پر زور دیا کہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے ایک مراسلہ جاری کر دے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لال نے میری مکمل حمایت کی اور ایک سرکلر واقعی جاری کر دیا گیا جس میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ملازمین کو یقین دلایا گیا تھا کہ اگر انھوں نے ہندستان میں رہ کر کام کرنا چاہا تو نہ صرف یہ کہ انھیں ان کا حق ملے گا بلکہ ان کے ساتھ فیاضی کا برتاؤ بھی کیا جائے گا۔

اس مراسلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرکزی دفاتر کے بہت سے مسلمان افسروں کا اعتماد بحال ہو گیا اور انھوں نے ہندستان میں ہی قیام کا فیصلہ کر لیا۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کو جب اس کا پتہ چلا، تو جو افسر یہاں رکنا چاہتے تھے، انھیں ورغلانے کی مہم شروع کر دی گئی۔ ایک طرف وہ اپنے مستقبل کے سلسلے میں سراسیمگی کے شکار تھے کہ نہ جانے اُن کا حشر کیا ہو۔ دوسری طرف، انھیں یہ دھمکی دی گئی کہ اگر وہ ہندستان ہی میں رہے تو مسلم لیگ اور حکومت پاکستان انھیں اپنا دشمن سمجھیں گے اور ہر ممکن طریقے سے انھیں پریشان کریں گے۔

ان میں بہت سے افسر اُن صوبوں سے آئے تھے جنھیں پاکستان کا حصّہ بننا تھا۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ مسلم لیگ کے اربابِ اختیار پاکستان میں ان کی املاک، اور ان کے رشتہ داروں سے بدلہ چکانا چاہتے ہیں تو اُن میں سے بیشتر بے حد پریشان ہوئے ——— میری اپنی وزارت میں کئی مسلم افسر اونچے عہدوں پر مامور تھے۔ انھوں نے میری یقین دہانیوں کے بل پر ہندستان کا انتخاب کیا تھا لیکن جب مسلم لیگ نے ان کے خاندانوں اور ان کی املاک کے خلاف دھمکیاں دیں تو ان میں سے بعض اشکبار آنکھیں لیے میرے پاس آئے اور بولے، ہم نے ہندستان میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا، مگر اب مسلم لیگ کی دھمکی کے بعد، ایسا کرنا ناممکن ہو گا۔ ہمارے اہلِ خاندان مغربی پنجاب میں ہیں۔ ہم انھیں تکلیف اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اسی لیے ہم مجبور ہیں کہ پاکستان کا انتخاب کر لیں۔

تمام مسلمان افسروں کو ہندستان سے نکال باہر کرنے کی مسلم لیگ کی یہ کارروائی، احمقانہ ہی نہیں نقصان دہ بھی تھی۔ دراصل یہ مجموعی طور پر ہندستان کی بہ نسبت مسلمانوں کے لیے زیادہ نقصان دہ تھی ——— اب جبکہ تقسیم کو قبول کر لیا گیا تھا اور پاکستان کا قیام عمل میں آرہا تھا،

تو یہ بات صاف تھی کہ نئی ریاست میں مسلمانوں کو ہر فائدہ ملے گا۔ اسی کے ساتھ اگر کچھ مسلمان ہندستان میں ہی ملازمت کرتے رہے، تو نہ صرف یہ کہ اس سے انھیں ذاتی فائدہ پہنچے گا، بلکہ پورے فرقے کے لیے یہ نہایت سود مند ہو گا۔ چند ذمے دار عہدوں پر مسلمانوں کی موجودگی نے اس فرقے میں پہلے سے زیادہ اعتماد پیدا کیا ہوتا اور بہت سے نامعقول اندیشے رفع ہو جاتے ——— میں یہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تقسیم پر اصرار کر کے لیگ نے کتنی بڑی نادانی کی تھی ——— مسلمان افسروں کی طرف لیگ کا رویّہ اسی نادانی کی ایک اور مثال تھا۔

یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندستان کی حکومت ۱۵ راگست، ۱۹۴۷ء کو وجود میں آجائے گی۔ مسلم لیگ نے طے کیا کہ پاکستان ایک روز پہلے، ۱۴ راگست کو بننا چاہیے ——— دونوں حکومتوں کی پیدائش تک کے بارے میں ایک ناخوشگوار واقعہ ہوا۔ ایک رسم یہ قائم ہو گئی تھی کہ ہر آزاد مملکت اپنے گورنر جنرل کا انتخاب خود کر سکتی تھی اور بہت سی مملکتوں نے اس منصب پر اپنے ہی ہم قوموں کو مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ہندستان کو آزادی تھی کہ ہندستان کے پہلے آئینی گورنر جنرل کے طور پر کسی ہندستانی کا انتخاب کرے ——— بہر حال ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئی اچانک تبدیلی کرنا مناسب نہ ہوگا، اور یہ سوچا کہ (اس منصب پر) لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا تقرر انتظامیہ اور پالیسی میں ایک تسلسل کو راہ دے گا۔ یہ بھی سوچا گیا کہ ابتدائی منزلوں میں، دونوں مملکتوں کا ایک ہی گورنر جنرل ہو گا اور بعد کو کوئی تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے ——— عام طور پر یہ سوچا جاتا تھا کہ پاکستان بھی انہی باتوں کا پاس و لحاظ رکھے گا۔

چنانچہ، ہم نے یہ اعلان کر دیا کہ گورنر جنرل کی حیثیت سے ہمارا انتخاب لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہیں۔ ہم لیگ سے یہ توقع کرتے تھے کہ وہ بھی انہی کو منتخب کرے گی، مگر آخری ساعت میں لیگ نے یہ تجویز کر کے کہ مسٹر جناح کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر کیا جانا چاہیے، سب کو حیران کر دیا ——— لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جیسے ہی یہ خبر سنی انھوں نے ہم سے کہا کہ اس کی وجہ سے پوری صورت حال بدل گئی ہے۔ انھوں نے مشورہ دیا

کہ ہم اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں اور کسی ہندستانی کا تقرر کر دیں ——— ہمیں بہرحال اپنے انتخاب میں تبدیلی کا کوئی سبب دکھائی نہیں دیا اور ہم اسی پر مُصر رہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن انڈین ڈومینین (INDIAN DOMINION) کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے۔

(۱۶)

منقسم ہندوستان

میں جو کہانی سُنانا چاہتا ہوں، اب اُس کے آخری باب تک پہنچ چکا ہوں۔ ۱۴ راگست کو ماؤنٹ بیٹن پاکستان کی نئی ریاست کا افتتاح کرنے کے لیے کراچی گئے۔ اگلے روز وہ واپس آگئے اور ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو رات کے بارہ بجے ہندوستان کی آزاد ریاست کا جنم ہوا۔

ملک آزاد تھا، لیکن اس سے پہلے کہ لوگ آزادی اور فتح کے احساس کا پورا لطف اٹھا سکیں، انھوں نے بیدار ہوتے ہی یہ دیکھا کہ آزادی کا ہم رکاب ایک عظیم المیہ بھی ہے۔ ہم نے یہ بھی سمجھ لیا کہ آزادی کی نعمتوں سے محظوظ ہونے اور دم لینے سے پہلے ہمیں ایک طویل اور دشوار سفر طے کرنا ہوگا۔

کانگریس اور اسی کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ نے تقسیم کو قبول کر لیا تھا۔ چونکہ کانگریس پوری (متحدہ) قوم کی نمائندہ تھی اور مسلم لیگ کو مسلمانوں میں وسیع حمایت حاصل تھی، اس لیے عام طور پر اس سے یہی مطلب نکالا جاتا کہ پورے ملک نے تقسیم کو مان لیا ہے۔ لیکن اصل صورت حال، یکسر مختلف تھی۔ جب ہم نے تقسیم کے فوراً پہلے اور بعد ملک پر نظر ڈالی تو ہم نے دیکھا کہ تقسیم کو صرف کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ایک قرارداد میں اور مسلم لیگ کے رجسٹر پر تسلیم

کیا گیا ہے۔ ہندستان کے عوام نے تقسیم کو تسلیم نہیں کیا تھا ——— واقعہ یہ ہے کہ ان کا دل اور ان کی روح اس (تقسیم کے) تصور کی ہی مخالف تھی۔ میں یہ کہہ چکا ہوں کہ مسلم لیگ کو بہت سے ہندستانی مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی لیکن اس فرقے میں ایک بڑا حصہ ایسا بھی تھا جس نے ہمیشہ لیگ کی مخالفت کی تھی۔ ایسے لوگوں کو قدرتی طور پر، ملک کو تقسیم کرنے کے فیصلے سے گہرا زخم لگا ——— جہاں تک ہندوؤں اور سکھوں کا تعلق ہے، ان کا ایک ایک آدمی تقسیم کے خلاف تھا۔ کانگریس کے اس (تقسیم کے) منصوبے کو مان لینے کے باوجود، ان لوگوں کی مخالفت میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔ اب جبکہ تقسیم ایک حقیقت بن چکی تھی، حتیٰ کہ وہ مسلمان بھی جو مسلم لیگ کے پیروکار رہے تھے، تقسیم کے نتیجے سے دہشت زدہ تھے اور کھل کر یہ کہنے لگے تھے کہ یہ تو وہ کچھ نہیں تھا جو وہ تقسیم سے مراد لیتے تھے۔

دس برس بعد صورت حال پر دوبارہ نظر ڈالتے ہوئے میں یہ دیکھتا ہوں کہ واقعات نے اس کی تصدیق کر دی ہے جو میں نے اس وقت کہا تھا۔ اس وقت بھی مجھے صاف نظر آتا تھا کہ کانگریسی لیڈروں نے تقسیم کو ایک آزاد اور کھلے ہوئے ذہن کے ساتھ قبول نہیں کیا ہے۔ کچھ نے اسے محض غصے اور ناراضگی میں مان لیا تھا اور بعض دوسروں نے مایوسی کے ایک احساس کی وجہ سے۔ لوگ جب غم و غصے اور خوف کے شکار ہوں تو معروضیت کے ساتھ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ تقسیم کے وہ حمایتی جنھوں نے جذبے کے دباؤ میں آکر قدم اٹھایا تھا، بھلا کس طرح یہ سوچ سکتے تھے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کے مضمرات کیا ہیں؟

کانگریسیوں میں تقسیم کے سب سے بڑے حامی سردار پٹیل تھے۔ مگر ان تک کو یہ یقین نہیں تھا کہ ہندستان کے مسئلے کا بہترین حل تقسیم ہے۔ انھوں نے جھنجلاہٹ اور اپنی گھایل خود پسندی کی وجہ سے تقسیم کی حمایت میں اپنا پورا زور لگا دیا۔ وزیر مالیات کی حیثیت سے لیاقت علی خاں ان کی تمام تجاویز کو جو رد کر دیتے تھے، اس کے باعث ہر قدم پر انھیں شکست کا احساس تنگ کرتا تھا۔ اسی لیے محض غصے میں آکر انھوں نے طے کر دیا کہ جب تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں تو اس کو مان لیا جائے۔ انھیں اس کا بھی یقین تھا کہ پاکستان کی ریاست پنپنے والی نہیں ہے اور زیادہ دن قائم نہیں رہ سکے گی۔ انھوں نے سوچا کہ پاکستان

قبولیت مسلم لیگ کو کڑوا سبق سکھائے گی۔ تھوڑے ہی دنوں میں پاکستان ڈھیر ہو جائے گا اور وہ صوبے جو ہندستان سے الگ ہو گئے تھے، انھیں ناقابلِ بیان مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سردار پٹیل کو شاید یہ امید تھی کہ ان صوبوں کو واپس ہندستان میں آنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ مجھے اس کا اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ مسلم لیگ کے خلاف انھوں نے اتنے شدید تعصبات پیدا کر لیے تھے کہ لیگ کی پیروی کرنے والے مسلمانوں کو اگر تکلیف پہنچتی تو انھیں (سردار پٹیل کو) کوئی افسوس نہ ہوتا۔

ملک کی تقسیم کی طرف لوگوں کے رویّے کا اصل امتحان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہوا جب آزاد پاکستان کی تشکیل عمل میں آئی۔ اگر ہندستان کے عوام نے آمادگی کے ساتھ تقسیم کو مان لیا ہوتا تو یقیناً پنجاب، سرحد، سندھ اور بنگال کے ہندوؤں اور سکھوں نے بھی اسی طرح خوشی منائی ہوتی جس طرح اِن علاقوں کے مسلمانوں نے ——— ان تمام صوبوں سے جو اطلاعات ہم تک پہنچیں اُن سے ظاہر ہو گیا کہ یہ دعوا کتنا کھوکھلا تھا کہ کانگریس کا تقسیم کو مان لینا، ہندستانی عوام کے تقسیم کو مان لینے کے مترادف ہے۔

پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ۱۴ اگست ایک یوم عید تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے لیے یہ ماتم کا دن تھا۔ یہ احساس صرف بیشتر عام لوگوں کا ہی نہیں تھا، بلکہ کانگریس کے اہم لیڈروں کا بھی تھا۔ اس وقت آچاریہ کرپلانی کانگریس کے صدر تھے۔ وہ سندھ کے رہنے والے ہیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو انھوں نے ایک بیان جاری کیا کہ یہ دن افسوس کا اور ہندستان کی بربادی کا ہے۔ پورے پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں نے کھلے عام اسی جذبے کا اظہار کیا۔ یقینی طور پر یہ انوکھی صورت حال تھی۔ ہماری قومی تنظیم (کانگریس) نے تقسیم کے حق میں فیصلہ کیا تھا لیکن سارا ملک تقسیم پر رنجیدہ تھا۔

یہاں فطری طور پر ایک سوال اٹھتا ہے۔ اگر تمام ہندستانیوں کے دلوں میں تقسیم نے غصّے اور افسوس کے ایسے احساسات پیدا کیے تو ہندستان کے عوام نے اسے مانا کیوں؟ اس کی اور زیادہ مخالفت کیوں نہیں ہوئی؟ ایک ایسا فیصلہ کرنے میں اتنی جلد بازی کیوں ہوئی جسے تقریباً ہر شخص غلط تصور کرتا تھا۔ اگر ۱۵ اگست تک ہندستان کے مسئلے کا صحیح حل نہیں

نکالا جاسکتا تھا تو ایک غلط فیصلہ کیوں کیا جائے اور پھر اس پر افسوس کیا جائے؟ میں نے بار بار یہ کہا تھا کہ ایک درست حل کے پائے جانے تک، انتظار کر لینا بہتر ہوگا۔ میں نے اپنے بس بھر کوشش کی مگر میرے دوستوں اور رفیقوں نے بدقسمتی سے میرا ساتھ نہیں دیا۔ حقائق کے تئیں ان کی اس عجیب و غریب بے بصری کا ایک ہی جواز مجھے ملتا ہے کہ غصّے اور مایوسی نے ان کی نظر کو دھندلا دیا تھا۔ شاید ایک تاریخ کے تعین ——— ۱۵ اگست ——— نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ہر بات مان لینے کے معاملے میں اُن پر ایک سحر اور تنویم کی طرح کا اثر کر دیا تھا۔

یہ صورت حال ایسی تھی جس میں نشاط اور غم باہم شیر و شکر ہو گئے تھے۔ تقسیم کے بعد سب سے مضحک پوزیشن ان مسلم لیگی لیڈروں کی تھی جو ہندستان میں ہی رہے۔ جناح اپنے مقلّدوں کے نام اس پیغام کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہو گئے کہ اب ملک تقسیم ہو چکا ہے اور انھیں ہندستان کا وفادار شہری ہونا چاہیے۔ اس رخصتی پیغام نے ان میں کمزوری اور ہزیمت کا ایک عجیب احساس پیدا کر دیا۔ ان میں بہت سے لیڈر ۱۴ اگست کے بعد مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ان میں سے ہر ایک نے گہرے ملال اور غصّے کے ساتھ کہا کہ جناح نے انھیں دھوکا دیا ہے اور بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔

مَیں پہلے پہل سمجھ نہیں سکا کہ یہ کہنے سے ان کی مُراد کیا تھی کہ جناح نے انھیں دھوکا دیا تھا۔ انھوں نے مسلم اکثریتی صوبوں کی بنیاد پر کھلے عام ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا۔ اب تقسیم ایک حقیقت تھی اور مغرب و مشرق دونوں میں مسلم اکثریتی علاقے پاکستان کا حصّہ بن چکے تھے ——— پھر مسلم لیگ کے ان ترجمانوں نے یہ کیوں کہا کہ انھیں دھوکا دیا گیا تھا؟

ان سے گفتگو کرتے ہوئے مَیں نے سمجھ لیا کہ ان لوگوں نے تقسیم کی ایک ایسی تصویر بنائی تھی جس کا حقیقی صورت حال سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ پاکستان کے اصل مضمرات کو سمجھنے میں ناکام رہے تھے۔ اگر مسلم اکثریتی صوبوں نے ایک الگ ریاست بنائی تو یہ صاف تھا کہ وہ صوبے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ہندستان کا حصّہ بنیں گے۔ یو۔ پی اور بہار

کے مسلمان اقلیت میں تھے چنانچہ انھیں تقسیم کے بعد بھی اسی حال میں رہنا تھا۔ یہ بات عجیب ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ ان مسلم لیگیوں کو بے وقوف بنا کر یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ پاکستان بس بن جائے، اس کے بعد تو مسلمان خواہ اکثریتی صوبے کے ہوں یا اقلیتی صوبے کے، انھیں ایک الگ قوم سمجھا جائے گا اور انھیں خود اپنے مستقبل کو طے کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ اب جبکہ مسلم اکثریتی صوبے ہندستان سے نکل گئے تھے اور بنگال اور پنجاب تک کو تقسیم کر دیا گیا تھا اور مسٹر جناح کراچی جا چکے تھے، تو ان احمقوں کی سمجھ میں آیا کہ انھوں نے کچھ بھی نہیں پایا بلکہ ہندستان کی تقسیم سے واقعتاً سب کچھ گنوا بیٹھے ہیں ——— جناح کا الوداعی پیغام ذرا سا تھا مگر اس نے انھیں چت کر کے رکھ دیا۔ اب اُن پر یہ عیاں تھا کہ تقسیم کا واحد نتیجہ یہ نکلا کہ بطور ایک اقلیت کے، ان کی پوزیشن پہلے کی بہ نسبت خاصی کمزور ہو گئی۔ مزید برآں، اپنی احمقانہ کارروائی سے انھوں نے ہندوؤں کے ذہن میں غصہ اور ناراضگی پیدا کر دی تھی۔

مسلم لیگ کے اراکین یہی رٹتے رہے کہ اب وہ لوگ ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہیں۔ یہ بات اتنی بدیہی تھی کہ ان واقعات کے باعث اُن کے رنج و ملال پر کسی کو مشکل ہی سے ترس آیا۔ میں نے انھیں وہ یاد دلایا جو میں نے کیبنٹ مشن پلان کے دوران کہا تھا۔ اپنے ۱۵ راپریل ۱۹۴۶ء کے بیان میں، غیر مبہم الفاظ میں، ہندستانی مسلمانوں کو میں نے خبردار کیا تھا کہ ایک روز جب انھیں ہوش آئے گا تو وہ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے پاکستان چلے جانے کے بعد، ہندستان میں وہ بس ایک چھوٹی سی اور غیر اہم اقلیت بن کر رہ گئے ہیں۔

۱۵ راگست کو آزادی کی صبح کی نشاندہی کے لیے ایک خصوصی پروگرام مرتب کیا گیا تھا۔ آدھی رات کو آئین ساز اسمبلی کا جلسہ ہوا اور یہ اعلان کیا گیا کہ اب ہندستان ایک آزاد اور خود مختار ریاست ہے۔ اگلے روز صبح نو بجے دوبارہ اسمبلی کا جلسہ ہوا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے افتتاحی تقریر کی۔ سارے شہر میں خوشی کا ہنگامہ برپا تھا۔ یہاں تک کہ تقسیم کی اذیتیں بھی اس وقت بھلا دی گئیں۔ شہر اور مضافات کے لاکھوں باشندے آزادی کی آمد کا جشن منانے کے لیے اکٹھا ہو گئے ——— شام چار بجے آزاد ہندستان کا پرچم لہرایا جانے والا تھا

اگست کے تپتے ہوئے سورج کے باوجود لاکھوں اُمڈ پڑے بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ چلچلاتی دھوپ میں وہ گھنٹوں سے انتظار کر رہے تھے۔ مجمع اتنا کثیر تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی کار سے نہیں نکل سکے اور وہیں سے انھیں اپنی تقریر کرنی پڑی۔

یہ مسرت وجد آفریں تھی مگر مشکل سے اڑتالیس گھنٹے باقی رہی۔ اس کے دوسرے ہی دن سے فرقہ وارانہ جھگڑوں کی خبریں راجدھانی پر گہری تاریکی پھیلانے لگیں۔ یہ خبریں قتل اور موت اور بے رحمی کی تھیں یہ پتہ چلا کہ مشرقی پنجاب میں ہندو اور سکھ ہجوم مسلمان گانوں پر حملہ آور ہوئے تھے۔ وہ گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہے تھے۔ بعینہ ایسی ہی خبریں مغربی پنجاب سے آئیں۔ مسلمان، بغیر کسی تفریق کے ہندو اور سکھ فرقے کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہے تھے۔ پورا پنجاب، مشرقی بھی اور مغربی بھی، بربادی اور موت کا قبرستان بنتا جا رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے تیزی کے ساتھ واقعات رونما ہوئے۔ پنجاب سے ایک کے بعد دوسرا وزیر بھاگا ہوا دلی آیا۔ ان کے پیچھے مقامی کانگریس کے لیڈر آئے جو حکومت سے باہر تھے۔ وہ سب کے سب ان واقعات سے سراسیمہ تھے جو (پنجاب میں) رونما ہو رہے تھے۔ جس بڑے پیمانے پر کشت و خون ہوا تھا اس نے ان کے حواس بھی گم کر دیے تھے اور وہ مایوسی میں یہ سمجھتے تھے کہ اسے شاید کوئی بھی چیز روک نہیں سکتی۔ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ انھوں نے فوج کیوں نہیں بلوائی آخر دگی کے ساتھ وہ بولے کہ پنجاب میں جو دستے تعینات ہیں وہ اب قابل اعتبار نہیں رہے اور ان سے کسی مدد کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ فوجی امداد دہلی سے پنجاب کو بھیجی جانی چاہیے۔

شروع میں، دہلی میں کوئی ہنگامے نہیں ہوئے، لیکن جب اس غارت گری کے ساتھ ملک میں چاروں طرف آگ بھڑک رہی تھی، یہ ممکن نہیں تھا کہ دہلی میں جو تھوڑی سی ریزرو فوج تھی اُسے وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ ہم نے باہر سے دستوں کو بلوانے کا فیصلہ کیا، مگر ان کی آمد سے پہلے، راجدھانی میں ہنگامے آن پہنچے۔ چونکہ پنجاب سے خون خرابے کی خبروں کے پیچھے پیچھے، مغربی پنجاب سے آنے والے پناہ گزینوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا

تھا اس لیے دلّی میں تشدد بھڑک اٹھا۔ شہر پر قتل کا آسیب چھا گیا۔ یہ ہنگامہ صرف پناہ گزینوں یا عام پبلک تک محدود نہیں رہا، حتیٰ کہ وہ علاقے جہاں سرکاری ملازمین رہتے تھے، وہ بھی لپیٹ میں آ گئے۔ جب مغربی پنجاب کی خوں ریزی کی خبریں دہلی پہنچیں، تو سرکش لوگوں کا ہجوم شہر کے مسلمانوں پر لوٹ پڑا ___ دہلی میں ان قاتلانہ حملوں کو منظم کرنے میں سکھوں نے نمایاں حصہ لیا۔

مَیں یہ پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یرغمال بنانے اور انتقام لینے کے خطرناک اصول کی غیر محتاط باتوں نے مجھے کتنا پریشان کیا تھا۔ دہلی میں اب ہم اسی اصول پر بھیانک طریقے سے عمل ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اگر مغربی پنجاب کے مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے قتل کے قصوروار تھے تو اس کا کیا جواز تھا کہ بدلہ دہلی کے مسلمانوں سے لیا جائے؟ یرغمال بنانے اور بدلہ لینے کا یہ اصول اتنا بھیانک ہے کہ کوئی بھی شائستہ یا ہوش مند انسان اس کی مدافعت میں ایک لفظ نہیں کہہ سکتا۔

فوج کا رویہ اب تک تشویشناک مسئلہ بن گیا۔ تقسیم سے پہلے فوج فرقہ وارانہ منافرت سے آزاد تھی۔ جب فرقہ وارانہ بنیادوں پر ملک کو تقسیم کیا گیا تو فرقہ واریت کے جراثیم فوج میں بھی داخل ہو گئے۔ دہلی میں فوجیوں کی اکثریت ہندو اور سکھ تھی۔ چند ہی روز میں یہ عیاں ہو گیا کہ اگر شہر میں امن و امان کی بحالی کے لیے سخت کارروائی کرنی ہے تو ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ہم نے اور زیادہ تیزی کے ساتھ جنوب سے فوجیوں کو لانے کے اقدامات کیے۔ ملک کی تقسیم سے وہ متاثر نہیں ہوئے تھے اور سپاہیانہ ڈسپلن کا احساس انھوں نے ابھی برقرار رکھا تھا۔ جنوب کے فوجیوں نے صورت حال کو قابو میں لانے اور شہر میں نظم و ضبط بحال کرنے میں، ایک زبردست رول ادا کیا۔

خاص شہر سے قطع نظر، مضافات مثلاً قرول باغ، لودی کالونی، سبزی منڈی اور صدر بازار کے علاقے تھے جن میں مسلمانوں کی بڑی آبادی تھی۔ اُن تمام علاقوں میں جان اور مال اب محفوظ نہیں رہے تھے۔ نہ ہی موجودہ حالات میں مکمل فوجی حفاظت ممکن ہو سکتی تھی۔ ایک منزل پر تو ان علاقوں میں صورت حال ایسی خراب ہو گئی کہ کوئی بھی مسلمان گھر والا رات کو اس اعتماد کے ساتھ سو نہیں سکتا تھا کہ اگلی صبح وہ زندہ اُٹھے گا۔

لوٹ مار، قتل اور غارت گری کے اُن دنوں میں، فوجی افسروں کو ساتھ لے کر میں نے دہلی کے مختلف حصّوں کا دورہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ مسلمان بالکل ہزیمت زدہ تھے اور مکمل بے لبسی کے ایک احساس میں مبتلا تھے۔ بہتوں نے میرے گھر میں پناہ چاہی۔ شہر کے متمول اور معروف خاندان میرے پاس اس حال میں آئے کہ وہ بالکل قلاش تھے۔ اور بدن کے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ کچھ کو دن کے اجالے میں آنے کا حوصلہ نہیں ہوا اور انھیں فوج کی حفاظت میں آدھی رات کو یا علی الصبح لایا گیا۔ جلد ہی میرا گھر بھر گیا اور میں نے کمپاؤنڈ میں خیمے لگوا دیے۔ ہر طرح کے اور ہر حال کے مرد اور عورتیں۔ غریب امیر، جوان اور بوڑھے —— محض جان کے ڈر سے ایک ساتھ سمٹے سمٹائے پڑے تھے۔

جلدی ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ نظم و ضبط کے قائم ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ شہر کے مختلف علاقوں میں اُن گھروں کی حفاظت ممکن نہیں تھی جو اکیلے پڑ گئے تھے۔ اگر ہم ایک علاقے میں پہرے داروں کا انتظام کرتے تو حملہ دوسرے علاقوں میں شروع کر دیا جاتا۔ اسی لیے ہم نے طے کیا کہ مسلمانوں کو یکجا کر کے حفاظتی کیمپوں میں پہنچا دینا چاہیے۔ ایک ایسا ہی کیمپ پرانے قلعے میں قائم کیا گیا۔ اس میں کوئی عمارت بچی نہیں رہ گئی ہے۔ صرف برج باقی ہیں۔ جلدی ہی یہ برج لوگوں سے بھر گئے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد قلعے میں جمع ہو گئی اور انھی برجوں میں تقریباً پوری سردیوں کے مہینے گزار دیے۔

میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر اس طریقے کی وجہ سے اعتراض کر چکا ہوں جس سے انھوں نے تقسیم کے عمل میں مدد لی تھی۔ اب مجھے اس سلیقے کے لیے انھیں خراجِ تحسین بھی پیش کرنا ہے، جس کے ساتھ انھوں نے ہمارا سامنا کرنے والے بحران پر قابو پایا۔ میں ان کی توانائی اور سرگرمی کا ذکر بھی پہلے ہی کر چکا ہوں جس کا اظہار انھوں نے ہندستان کی تقسیم کے پر پیچ اور دشوار مرحلے کو طے کرنے میں کیا تھا۔ اب وہ اس سے بھی زیادہ سرگرمی اور توانائی کے ساتھ ملک کے نظم و ضبط کی بحالی میں لگ گئے۔ ان کی فوجی تربیت ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ ان کی قیادت اور فوجی حکمتوں کے تجربے کے بغیر، یہ مشکوک ہے کہ ہم اتنی تیزی

اور مستعدی کے ساتھ دشواریوں پر قابو پاسکتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ صورت حال بالکل جنگ کی سی ہے اور اس سے اسی طرح نمٹنا ہوگا۔ جنگ کے دوران، جنگی کونسلیں چوبیس گھنٹے کام کرتی ہیں۔ ہمیں بھی ایک کونسل آف ایکشن بنانی ہوگی جو بلا تاخیر فیصلے کرے گی اور یہ بھی دیکھے گی کہ ان کے مطابق عمل کیا جائے۔ ایک ہنگامی بورڈ کی تشکیل ہوئی جو کابینہ کے کچھ اراکین اور اونچے عہدے کے کچھ سول اور ملٹری حکام پر مشتمل تھا۔ اس بورڈ کی میٹنگ روزانہ صبح ساڑھے نو بجے گورنمنٹ ہاؤس کے کیبنٹ روم میں ہوتی تھی۔ ہم پچھلے چوبیس گھنٹوں میں دیے گئے احکامات اور کیے گئے کاموں کا جائزہ لیتے تھے۔ یہ بورڈ بغیر کسی وقفے کے اس وقت تک کام کرتا رہا جب تک کہ امن پوری طرح بحال نہیں ہوگیا۔ ہر صبح بورڈ تک جو رپورٹیں آتی تھیں ان سے ہمیں اس خطرناک صورت حال کو سمجھنے میں مدد ملتی تھی۔

اس پوری مدت کے دوران گاندھی جی ایک ہولناک ذہنی اذیت میں گرفتار رہے تھے۔ انھوں نے اپنی تمام تر طاقت دونوں فرقوں کے مابین بہتر فضا کو بحال کرنے اور مسلمانوں کو جان و مال کو بچانے پر صرف کردی۔ یہ دیکھ کر انھیں انتہائی پریشانی اور تکلیف کا احساس ہوا کہ ان کی کوششیں متوقع کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکیں۔ اکثر وہ جواہر لال کو، سردار پٹیل کو اور مجھے بلواتے اور ہم سے کہتے کہ ہم شہر کی صورت حال بیان کریں۔ ان کی پریشانی بڑھ جاتی جب وہ یہ دیکھتے کہ جو کچھ واقعتاً ہو رہا تھا اس کے سلسلے میں بھی ہم لوگوں (کے بیانات) میں اختلافات تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف سردار پٹیل کے اور دوسری طرف جواہر لال کے اور میرے رویوں میں ایک فرق تھا۔ یہ مقامی انتظامیہ پر اثر انداز ہو رہا تھا اور بات صاف ہوتی جارہی تھی کہ حکام بھی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ان میں بڑا والا گروپ سردار پٹیل کی نظر میں دیکھتا تھا اور اس انداز سے کام کرتا تھا جو اس کے خیال میں سردار پٹیل کو خوش کرسکے۔ ایک چھوٹا گروپ جواہر لال کی اور میری طرف دیکھتا تھا اور یہ کوشش کرتا تھا کہ جواہر لال کے احکامات کی تعمیل ہوسکے۔ دہلی کے چیف کمشنر ایک مسلمان افسر خورشید احمد تھے جو صاحبزادہ آفتاب احمد کے بیٹے تھے۔ وہ مضبوط افسر نہیں تھے۔ علاوہ ازیں، انھیں یہ خوف بھی

تھا کہ اگر انھوں نے کوئی سخت کارروائی کی تو ان پر مسلمانوں کی طرفداری کا الزام بھی آسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تو انتظامیہ کے بس برائے نام سربراہ رہے، اور ڈپٹی کمشنر خود اپنی مرضی کے مطابق تمام کارروائیاں انجام دیتا رہا۔ یہ افسر رندھاوا کے نام سے جانا جاتا تھا اور سکھ تھا، مگر سکھوں کی بہت سی رسوم اور روایات کی پابندی نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنی داڑھی مونڈلی تھی اور بال ترشوالیے تھے اور بہت سے سکھ اس کو تقریباً ایک بدعتی سمجھتے تھے۔ وہ تقسیم سے پہلے بھی دہلی میں ڈپٹی کمشنر رہ چکا تھا، اور پندرہ اگست سے پہلے کسی وقت یہ تجویز تھی کہ چونکہ اس نے اپنی مدت پوری کرلی ہے اس لیے اسے پنجاب واپس بھیج دیا جائے۔ دہلی کے بہت سے ممتاز شہریوں، علی الخصوص مسلمانوں کے ایک بڑے حلقے نے اس تجویز کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ رندھاوا ایک روشن خیال اور مضبوط افسر ہے اور ان مشکل دنوں کے دوران اس کا مناسب بدل پانا محال ہوگا۔

چنانچہ رندھاوا کو روک لیا گیا، مگر ایسا لگتا ہے کہ فرقہ وارانہ تناؤ کا زور، جو پورے پنجاب میں پھیل چکا تھا، اس کے اثر میں آکر وہ بھی بدل گیا۔ مجھے ایسی بہت سی رپورٹیں ملیں کہ شر پسندوں کے خلاف وہ مطلوبہ حد تک سخت اور مؤثر کارروائی نہیں کررہا ہے۔ وہی مسلمان جنھوں نے سال بھر پہلے اُسے دہلی میں برقرار رکھنے کی درخواست کی تھی اب آتے تھے اور کہتے تھے کہ دہلی کے مسلمان شہریوں کی فکر درکی حفاظت وہ نہیں کررہا ہے۔ یہ اطلاع سردار پٹیل کو بھی دی گئی مگر اس قسم کی شکایتوں پر انھوں نے مشکل سے کوئی توجہ صرف کی۔

سردار پٹیل ممبر داخلہ تھے اور اس طرح دہلی انتظامیہ براہ راست ان کے تحت تھا۔ جیسے ہی قتل اور لوٹ مار کی وارداتوں کی فہرست طویل تر ہوئی گاندھی جی نے پٹیل کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ اس خوں ریزی کو روکنے کے لیے وہ کیا کررہے ہیں —— سردار پٹیل نے یہ کہتے ہوئے انھیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ گاندھی جی کو ملنے والی خبریں نہایت مبالغہ آمیز ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اس حد تک کہا کہ مسلمانوں کو شکایت

کرنے یا ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے ایک موقع اچھی طرح یاد ہے جب ہم تینوں گاندھی جی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جواہر لال نے گہری افسردگی کے ساتھ کہا کہ دہلی کی صورت حال کو، جس میں مسلمان کتّوں اور بلیوں کی طرح مارے جا رہے تھے، وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ انھیں اپنے آپ پر شرم آتی تھی کہ وہ بے بس تھے اور انھیں بچا نہیں سکتے تھے۔ ان کا ضمیر انھیں چین سے بیٹھنے نہ دے گا کیونکہ جب لوگ ان ہولناک واقعات کے بارے میں شکایت کرتے تھے تو اُن سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ جواہر لال نے کئی بار دوہرایا کہ صورت حال ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی اور ان کا ضمیر انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

سردار پٹیل کے ردِّ عمل نے ہمیں مکمل طور پر حیرت زدہ کر دیا۔ ایک ایسے وقت میں جب دہلی میں مسلمان دن دہاڑے قتل کیے جا رہے تھے۔ انھوں نے نہایت اطمینان سے گاندھی جی کو بتایا کہ جواہر لال کی شکایتیں ان کے لیے یکسر ناقابلِ فہم ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ اکا دکا واقعات ہوئے ہوں، لیکن حکومت مسلمانوں کی جان اور مال بچانے کے لیے حتی الامکان ہر کوشش کر رہی تھی اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دراصل انھوں نے اپنی بے اطمینانی کا اظہار بھی کیا کہ وزیر اعظم کے طور پر جواہر لال اپنی ہی حکومت کے کاموں پر ناپسندیدگی ظاہر کر رہے ہیں۔

چند لمحوں تک جواہر لال کچھ بھی نہیں کہہ سکے، پھر انھوں نے مایوسی کے ساتھ گاندھی جی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر سردار پٹیل کے خیالات یہی ہیں تو انھیں کچھ نہیں کہنا ہے۔

ایک اور واقعے نے، جو تقریباً اسی وقت ہوا، صاف ظاہر کر دیا کہ سردار پٹیل کا ذہن کس طرح کام کر رہا تھا۔ شاید انھوں نے یہ سوچا کہ مسلمانوں پر ہر روز جو حملے ہو رہے ہیں ان کا کوئی جواز ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک نظریہ یہ پیش کیا کہ شہر کے مسلمان علاقوں سے مہلک اسلحے برآمد کیے گئے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ دہلی کے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کرنے کے لیے اسلحے جمع کیے تھے اور اگر ہندوؤں اور سکھوں نے جارحیت میں پہل نہ کی ہوتی تو مسلمانوں نے انھیں برباد کر دیا ہوتا۔ قرول باغ اور سبزی

منڈی سے پولیس نے کچھ اسلحے برآمد کیے۔ سردار پٹیل کے حکم سے انھیں گورنمنٹ ہاؤس لایا گیا اور ہمارے معائنے کے لیے کیبنیٹ روم کے اینٹی چیمبر میں رکھ دیا گیا۔ جب ہم اپنی روز کی میٹنگ کے لیے یکجا ہوئے، سردار پٹیل نے کہا کہ پہلے ہم اینٹی چیمبر میں جائیں اور برآمد کردہ اسلحے دیکھ لیں ——— ہم وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میز پر باورچی خانے میں کام آنے والے درجنوں چاقو جن میں زنگ لگا ہوا تھا، جیب میں رکھنے والے اور قلم یا پنسل تراشنے والے چاقو، جن میں سے بعض دستوں کے ساتھ تھے بعض بغیر دستوں کے اور لوہے کی کچھ سلاخیں جو پرانے مکانات کے جنگلوں سے نکالی گئی تھیں، اور کچھ ڈھلے ہوئے فولاد کے واٹر پائپ رکھے ہوئے تھے۔ سردار پٹیل کے قول کے مطابق یہی وہ اسلحے تھے جو دہلی کے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے جمع کیے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک یا دو چاقو اٹھائے اور مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ لوگ جنھوں نے یہ سامان اکٹھا کیا تھا، وہ جنگی داؤں پیچ کا ایک حیرت انگیز تصور رکھتے ہوں گے اگر وہ یہ سوچتے ہیں کہ شہر دہلی پر انہی اسلحوں کی مدد سے قبضہ کیا جا سکتا ہے۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ شہر کے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت پرانے قلعے میں جمع کر دی گئی تھی۔ سردیاں آنے والی تھیں۔ ہزاروں لوگ جو کھلے آسمانوں کے نیچے رہتے تھے، ٹھنڈ سے بے حد پریشان ہوئے۔ کھانے یا پینے کے پانی کا وہاں کوئی مناسب انتظام نہیں تھا۔ اس سے زیادہ برا یہ تھا کہ وہاں سے غلاظت ہٹانے کا کوئی انتظام یا تو تھا ہی نہیں یا اگر تھا تو بہت ناکافی تھا ——— ایک صبح ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایمرجنسی بورڈ کے سامنے گواہی دی اور بتایا کہ پرانے قلعے میں کیا ہولناک حالت ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ غریب مرد اور عورتیں، جنھیں اچانک موت سے بچا لیا گیا تھا، اب وہ زندہ قبر میں ڈال دیے گئے ہیں۔ بورڈ نے مجھ کو ہدایت کی کہ انتظامات کا معائنہ کروں اور ضروری اقدامات تجویز کروں۔ اپنی اگلی میٹنگ میں بورڈ نے طے کیا کہ پینے کے پانی اور صفائی کا فوری انتظام کیا جانا چاہیے۔ فوج سے بھی کہا گیا کہ جتنے خیمے مستعار دے سکتی ہو دے تاکہ لوگوں کے سر پر کم سے کم کینوس کی چھت تو ہو۔ جب یہ بات

پھیل گئی کہ جب تک دہلی میں امن اور نظم و ضبط قائم نہیں ہو جاتا گاندھی جی برت رکھیں گے، تو بہت سے لوگ جو اس وقت تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے انھیں شرم آئی اور وہ کچھ کرنے پر مائل ہوئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس عمر میں اور ایسی صحت کے ساتھ گاندھی جی کو لازمی طور پر برت سے بچایا جانا چاہیے۔ پہلے انھوں نے انہی سے اپیل کی کہ برت کا خیال چھوڑ دیں، مگر گاندھی جی اڑے رہے۔

ایک بات جس کا گاندھی جی کے ذہن پر بہت بڑا بوجھ تھا وہ سردار پٹیل کا رویہ تھا۔ سردار پٹیل کا تعلق گاندھی جی کے اندرونی حلقے سے تھا اور وہ انھیں بہت عزیز تھے واقعہ یہ ہے کہ سردار پٹیل کا مکمل سیاسی وجود گاندھی جی کا مرہونِ منت تھا۔ کانگریس کے اہم لیڈروں میں بہتوں کی سیاسی زندگی گاندھی جی کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ بہر حال دو اشخاص ——— سردار پٹیل اور راجندر پرساد ——— ایسے تھے جو کلیتاً گاندھی جی کی تخلیق تھے۔

* ڈاکٹر راجندر پرساد کا تعلیمی ریکارڈ شاندار رہا تھا اور بہت سے لوگ انھیں بہار کی سیاست کے ابھرتے ہوئے نمایاں ترین شخص کے طور پر دیکھتے تھے۔ مگر انھیں زیادہ فکر اپنی وکالت کی تھی اور شاید وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ امام بھائیوں اور مظہر الحق جیسے لیڈروں کے مقابلے میں انھیں زیادہ موقع بھی نہیں مل سکتا تھا۔ جب گاندھی جی بہار آئے تو انھوں نے دیکھا کہ سیاسی قیادت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی اور شروع میں تو ایک بھی ہندو جس کی کوئی حیثیت رہی ہو، ان کے ساتھ شامل نہیں ہوا۔ ایک معتبر ذریعے سے میں نے سنا ہے کہ ڈاکٹر سچدانند سنہا نے ایک ڈنر کا اہتمام کیا جہاں نسبتاً زیادہ ممتاز ہندوؤں کو گاندھی جی سے ملنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ بہار کے ہندو تحریک عدم تعاون میں شامل ہو جائیں گے بشرطیکہ گاندھی جی کسی ہندو کو اس کا لیڈر منتخب کر دیں۔ گاندھی جی بولے کہ وہ اپنی من مانی کے ساتھ کسی کو بھی لیڈر شپ نہیں دے سکتے تھے، ہاں یہ وعدہ کر سکتے تھے کہ اگر کوئی با صلاحیت اور صاحب کردار ہندو آگے بڑھا تو وہ اس کی ضرور مدد کریں گے۔ تب گاندھی جی کے سامنے بابو راجندر پرساد کا نام تجویز کیا گیا اور چند ہی برسوں کے اندر گاندھی جی کی مدد اور حمایت

سے وہ ایک کل ہند شخصیت بن گئے"۔*

پٹیل کا معاملہ اور زیادہ دل چسپ ہے۔ عدم تعاون کی تحریک سے پہلے، گجرات کے بہت سے وکیلوں میں سے بس ایک پٹیل ہی تھے جن کی ملک کی عوامی زندگی میں مشکل ہی سے کوئی جگہ یا دل چسپی تھی۔ جب گاندھی جی نے احمد آباد کو اپنا ٹھکانا بنایا تو انھوں نے سردار پٹیل کو چن لیا اور زینہ بہ زینہ ان کی حیثیت بنائی۔ پٹیل دل و جان سے ان کے حمایتی بن گئے، اور یہ ذکر تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں کہ کس طرح بیشتر موقعوں پر وہ بس گاندھی جی کی خواہشوں کو دوہرا دیا کرتے تھے۔ وہ گاندھی جی ہی تھے جنھوں نے ان کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ایک رکن بنایا۔ پھر، یہ بھی گاندھی جی ہی کی وجہ سے ہوا کہ ۱۹۳۱ء میں وہ کانگریس کے صدر بن گئے۔ گاندھی جی کو اس بات سے گہری چوٹ لگی کہ اب پٹیل ایک ایسی پالیسی اختیار کریں جو ان تمام اصولوں کی یکسر ضد ہو، جن کا گاندھی جی کو لحاظ تھا۔

گاندھی جی نے کہا کہ انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دہلی کے مسلمانوں کو قتل ہوتے دیکھا ہے۔ یہ ایسے وقت میں کیا جا رہا تھا جب ان کے اپنے ولبھ بھائی حکومتِ ہند کے ممبر داخلہ اور راجدھانی میں نظم و ضبط کو قائم رکھنے کے لیے ذمّے دار تھے۔ پٹیل نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے تحفظ کا انتظام کرنے میں ناکام رہے، بلکہ اس کے سلسلے میں ان سے جو شکایتیں کی جاتی تھیں انھیں وہ لاپروائی کے ساتھ ٹال دیتے تھے۔ گاندھی جی نے کہا کہ ان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا ہے سوائے اپنا آخری حربہ استعمال کرنے کے، یعنی یہ کہ جب تک صورتِ حال بدل نہ جائے وہ برت پر رہیں گے، چنانچہ ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے اپنا برت شروع کر دیا۔ ایک معنی میں اس برت کا رخ سردار پٹیل کے رویّے کے خلاف تھا اور سردار پٹیل جانتے تھے کہ ایسا ہے۔

ہم نے گاندھی جی کو اس برت سے باز رکھنے کی اپنے بس بھر کوشش کی تھی۔ برت کے پہلے دن کی شام کو، جواہر لال، سردار پٹیل اور میں گاندھی جی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اگلی صبح سردار پٹیل بمبئی کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ انھوں نے رسمی انداز میں گاندھی جی سے بات کی اور یہ شکوہ کیا کہ گاندھی جی بغیر کسی معقول وجہ کے برت رکھ رہے ہیں۔ انھوں نے

یہ شکایت بھی کی کہ اس طرح کے برت کے (جواز) کے لیے کوئی حقیقی مسئلہ نہیں ہے۔ دراصل اس برت کی وجہ سے سردار پٹیل کے خلاف الزامات کو بڑھاوا ملے گا۔ انھوں نے قدرے تلخی کے ساتھ کہا کہ گاندھی جی کے طرزِ عمل سے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے سردار پٹیل ہی مسلمانوں کے قتل کے لیے ذمے دار ہیں۔

گاندھی جی نے اپنے حسبِ معمول پُرسکون انداز میں جواب دیا، ''میں اس وقت چین میں نہیں، دہلی میں ہوں۔ نہ ہی میں نے اپنی آنکھیں اور کان گنوا دیے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ اپنی ہی آنکھوں اور کانوں کی گواہی پر اعتبار نہ کروں، اور مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس شکایت کرنے کا کوئی سبب نہیں ہے، تو میں یقیناً نہ تو آپ کو قائل کر سکتا ہوں، نہ آپ مجھے قائل کر سکتے ہیں۔ ہندو اور سکھ میرے بھائی ہیں۔ وہ میرے جسم کا حصہ ہیں اور اگر اس وقت وہ طیش میں آ کر اندھے ہو گئے ہیں تو میں ان کو الزام نہیں دوں گا — بہرحال، خود مجھے اپنے آپ کو تکلیف دے کر، کفارہ ادا کرنا ہی چاہیے اور مجھے امید ہے کہ میرے برت سے اصل حقیقتوں کی طرف ان کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

* سردار پٹیل اس جواب سے ناراض ہو گئے اور گاندھی جی سے روکھائی کے ساتھ بات کی۔ جواہر لال کو اور مجھے ان کے اس برتاؤ پر صدمہ بھی ہوا اور حیرانی بھی اور ہم چپ نہیں رہ سکے۔ میں نے احتجاج کیا اور کہا، ''ولبھ بھائی، ہو سکتا ہے آپ کو اس کا اندازہ نہ ہو، مگر ہم گہرائی کے ساتھ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا رویہ کتنا توہین آمیز ہے، اور آپ گاندھی جی کو کتنا دُکھ پہنچا رہے ہیں۔*

سردار پٹیل ایک لفظ کہے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے اور ایسا ظاہر کیا کہ جیسے وہ وہاں سے چلے جائیں گے۔ میں نے انھیں روکا اور کہا کہ انھیں اپنا پروگرام منسوخ کر دینا چاہیے اور دہلی میں رُکے رہنا چاہیے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ واقعات کیا رخ اختیار کریں، اور اس وقت جب گاندھی جی کا برت جاری ہے، انھیں جانا نہیں چاہیے۔

پٹیل نے تقریباً چیخ کر جواب دیا۔ ''میرے یہاں رُکنے سے کیا فائدہ؟ گاندھی جی میری بات سننے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ ساری دنیا کے سامنے ہندوؤں کے نام پر کالک لگانے کا

تہیہ کر چکے ہیں۔ اگر ان کا یہی رویّہ ہے تو مجھ سے انھیں کچھ نہیں لینا۔ میں اپنا پروگرام نہیں بدل سکتا اور مجھے بمبئی جانا ہی ہے۔"

سردار پٹیل کے لفظوں سے زیادہ ان کے لہجے نے مجھے گہری تکلیف پہنچائی۔ میں نے سوچا۔ ان کا اثر گاندھی جی پر کیا ہوگا؟ پٹیل گاندھی جی کی ہی تخلیق تھے اور ان کی مدد کے بغیر ان کی کوئی حیثیت نہ ہوتی ——— ہم نے سوچا کہ اس سے زیادہ کچھ اور کہنا بے کار ہے، اور پٹیل رخصت ہو گئے۔

پٹیل نے گاندھی جی کی طرف سے اپنا جی کڑا کر لیا تھا، مگر دہلی کے لوگوں نے نہیں۔ جیسے ہی خبر پھیلی کہ انھوں نے اپنا برت شروع کر دیا ہے، صرف اسی شہر میں نہیں بلکہ پورے ہندستان میں گہری ہلچل مچ گئی۔ دہلی پر تو بجلی کا سا اثر ہوا۔ ایسے گروہ جو ابھی حال تک گاندھی جی کے خلاف تھے، انھوں نے آگے بڑھ کر کہا کہ گاندھی جی کی قیمتی زندگی بچانے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے پر تیار رہیں گے۔

کئی طرح کے لوگ آئے اور گاندھی جی سے بتایا کہ دہلی میں امن بحال کرنے کے لیے وہ کام کریں گے، لیکن گاندھی جی پر ان کے لفظوں کا اثر نہیں ہوا۔ اضطراری سرگرمی کے وہ دن گزر گئے۔ تیسرے روز صورت حال پر غور کرنے اور ایسے طریقے اختیار کرنے کے لیے، جن سے گاندھی جی کو اپنا برت چھوڑنے پر مائل کیا جا سکے، ایک عوامی جلسہ طلب کیا گیا۔

جلسے کی طرف جاتے ہوئے میں گاندھی جی سے ملا۔ میں نے کہا کہ وہ اپنا برت توڑنے کی شرطیں رکھ دیں۔ اس کے بعد ہم ان (شرطوں) کو عوام کے سامنے پیش کر دیں گے اور کہہ دیں گے کہ جب ان معاملات پر گاندھی جی کو اطمینان ہو جائے گا تو وہ اپنا برت ترک کر دیں گے۔

گاندھی جی نے کہا، "یہ کام کی بات ہے۔ میری پہلی شرط یہ ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں کے حملوں کی وجہ سے، وہ تمام مسلمان جو دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے انھیں پھر سے واپس بلایا جائے اور اپنے گھروں میں پھر سے بسایا جائے۔

یہ ایک اچھا اور شائستہ اقدام ہوتا، لیکن مجھے پتہ تھا کہ یہ قابل عمل تجویز نہیں ہے۔ تقسیم کے بعد، پنجاب کے دونوں حصوں میں زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی تھی۔ مغربی پنجاب سے

لاکھوں پناہ گزیں ہندستان آئے تھے اور مشرقی پنجاب سے لاکھوں پاکستان چلے گئے تھے ہزاروں دہلی سے رخصت ہو گئے تھے اور مغربی پنجاب کے بہت سے پناہ گزینوں نے ان گھروں پر قبضہ کر لیا تھا جنھیں مسلمانوں نے خالی چھوڑا تھا۔ اگر یہ محض چند سو افراد کا معاملہ ہوتا تو شاید گاندھی جی کی خواہش پر عمل کر دیا جاتا۔ مگر اس معاملے سے تو لاکھوں مردوں اور عورتوں کا تعلق تھا۔ چنانچہ گاندھی جی کی خواہش کو پورا کرنے کی کوئی بھی کوشش، صرف نئے مسئلے پیدا کر کے رکھ دیتی ——— مغربی پنجاب سے جو ہندو اور سکھ آئے تھے، ایک بار اجاڑے جا چکے تھے، مگر اب دہلی میں انھیں ایک طرح کا ٹھکانا میسر آ گیا تھا۔ اگر ان سے اپنے نئے گھروں کو چھوڑنے کے لیے کہا جاتا، تو وہ بھلا کہاں جاتے؟ ——— اس کے علاوہ جو مسلمان دہلی چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے، وہ شاید مختلف حصّوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ انھیں واپس کیسے لایا جاتا؟ ——— نہ تو مسلمان واپس لائے جا سکتے تھے، نہ ہی ہندوؤں اور سکھوں سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ جن گھروں میں وہ بس گئے ہیں انھیں چھوڑ دیں۔ اس طرح کے سمجھوتے کی کوشش کا دراصل یہ مطلب ہوتا کہ جن مکانات سے مسلمانوں کو پہلی بار نکال باہر کر دیا گیا تھا، اب ان کی جگہ دوسری بار سکھوں اور ہندوؤں کو نکال باہر کر دیا جائے۔

میں نے گاندھی جی کے ہاتھ پکڑ لیے اور ان سے منّت کی کہ اس شرط کو انھیں چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ نہ تو قابل عمل ہوگا، نہ ہی شاید اخلاقی اعتبار سے حق بجانب ہوگا کہ دہلی میں جن ہندوؤں اور سکھوں نے اب ایک نیا گھر بنا لیا ہے، وہ پھر سے مارے مارے پھرنے لگیں ——— میں نے ان سے درخواست کی کہ اس معاملے پر اصرار نہ کریں بلکہ اپنی پہلی شرط یہ رکھ دیں کہ قتل اور غارت گری فوراً ختم کی جائے۔ وہ اس پر بھی اصرار کر سکتے تھے کہ ایسے مسلمان جو ابھی تک ہندستان میں ہیں، انھیں عزت اور سکون کے ساتھ رہنے کا موقع دیا جائے اور تمام فرقوں کے درمیان دوستانہ تعلقات بحال کیے جائیں۔ میں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اس بات کو بھی بطور شرط پیش کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی درگاہیں اور عبادت گاہیں، جنھیں توڑ پھوڑ دیا گیا تھا یا جن کی بے حرمتی ہوئی تھی، انھیں (مسلمانوں کو) واپس کر دیا جائے اور ان کی مرمت کرائی جائے۔ غیر مسلموں کے ذریعہ ایسے مقامات پر قبضہ،

مسلمانوں کے لیے رنج اور دہشت کا باعث تھا۔ گاندھی جی یہ ضمانت بھی طلب کر سکتے تھے کہ ایسی جگہیں، جو کسی بھی فرقے کے لیے مقدس ہیں ـــــــ ان پر اب پھر کوئی حملہ نہیں کیا جائے گا۔

پہلے تو گاندھی جی رضامند نہیں ہوئے اور اپنی ہی شرطوں پر اصرار کرتے رہے۔ مگر بالآخر انھوں نے مان لیا اور کہا کہ اگر یہ شرطیں جو میں نے تجویز کی تھیں، میرے لیے اطمینان بخش ہیں تو وہ بھی انھیں قبول کر لیں گے۔ میں نے اپنے خیالات کے لیے ان کی اس توجہ کا شکریہ ادا کیا اور گزارش کی کہ میری تجاویز کو قبول کر لیں۔

اس کے بعد گاندھی جی نے برت کو توڑنے کے لیے اپنی شرطیں بول کر لکھوائیں۔ یہ مندرجہ ذیل تھیں :

۱۔ ہندو اور سکھ فوراً مسلمانوں پر حملے کرنا بند کریں اور مسلمانوں کو باور کرائیں کہ وہ بھائیوں کی طرح ساتھ رہیں گے۔

۲۔ ہندو اور سکھ اسے یقینی بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ایک بھی مسلمان اپنی جان اور مال کے عدم تحفظ کی وجہ سے ہندستان نہ چھوڑنے پائے۔

۳۔ چلتی ریل گاڑیوں میں مسلمانوں پر جو حملے ہو رہے تھے انھیں فوراً رک جانا چاہیے اور ان حملوں میں جو ہندو اور سکھ حصہ لے رہے تھے انھیں ایسا کرنے سے روکا جانا چاہیے۔

۴۔ وہ مسلمان جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی درگاہوں یا زیارت گاہوں کے پاس آباد تھے، انھوں نے پریشانی میں اپنے گھر چھوڑ دیے تھے۔ انھیں اپنی بستی میں واپس لایا جائے اور پھر سے آباد کیا جائے۔

۵ - درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو نقصان پہنچایا گیا تھا گرچہ حکومت اُس کی مرمت اور بحالی کروا سکتی تھی، مگر گاندھی جی اُس سے مطمئن نہ ہوئے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ ہندو اور سکھ اپنے گناہ کے کفارے کے طور پر درگاہ کی بحالی اور مرمت خود کروائیں۔

۶ - سب سے اہم ضرورت دلوں کو بدلنے کی تھی۔ ان شرطوں کا پورا ہونا اتنا ضروری نہیں تھا جتنا کہ یہ کام۔ ہندو اور سکھ فرقے کے لیڈروں کو چاہیے کہ اس سلسلے میں گاندھی جی کو اچھی طرح یقین دلائیں تاکہ ایسے کسی مسئلے پر انھیں دوبارہ برت نہ رکھنا پڑے۔

گاندھی جی نے کہا، "میں چاہتا ہوں کہ یہ میرا آخری برت ہو۔"

میں نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ یہ شرطیں پوری کی جا سکتی تھیں۔ دن کے ۲ بجے جلسے میں آیا اور شرطیں حاضرین کے سامنے رکھ دیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ ہم گاندھی جی کو مطمئن کرنے اور ان سے اپنا برت چھوڑ دینے کی درخواست کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں خالی قرار دادوں کا اُن پر اثر نہیں ہو گا، لیکن اگر دلی کے لوگ اُن کی جان بچانا چاہتے ہیں تو جو شرطیں انھوں نے رکھی ہیں انھیں پورا کرنا پڑے گا۔ گاندھی جی نے مجھے یہی دیکھنے کے لیے بھیجا ہے کہ کیا دہلی کے لوگ انھیں اس بات کی ضمانت دے سکتے ہیں۔

وہاں جلسے میں تقریباً بتیس ہزار مرد اور عورتیں موجود تھے۔ وہ ایک آواز ہو کر چلائے ——— "ہم گاندھی جی کی خواہش کو حرف بہ حرف پورا کریں گے۔ ہم اپنی جان اور دل کی بازی لگا دیں گے اور گاندھی جی کو دُکھ پہنچانے والی کوئی بات نہ ہونے دیں گے۔"

میں ابھی تقریر کر ہی رہا تھا کہ کچھ لوگوں نے شرطوں کی نقلیں اُتار لیں اور حاضرین سے دستخط کروانے لگے۔ جلسہ برخاست ہونے سے پہلے اس دستاویز پر ہزاروں نے دستخط کر دیے تھے ——— رندھاوا، جو ابھی تک ڈپٹی کمشنر تھا، اس نے ہندو اور

سکھ لیڈروں کا ایک گروپ اکٹھا کیا اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ کے لیے چل پڑا تاکہ مرمّت کا کام ہو جائے۔ ساتھ ہی، دہلی میں کام کرنے والی کئی سوسائٹیوں نے برسرِ عام یہ عہد کیا کہ وہ گاندھی جی کی شرطوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے حلقوں میں خود کوشش کریں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان سوسائٹیوں نے یہ اعلان کر دیا کہ شرطوں کو پورا کرنے کی ذمّہ داری وہ اپنے سر لے رہی ہیں۔ شام تک تمام پارٹیوں اور گروپوں کے وفود میرے پاس آئے اور دہلی کے ہر حلقے سے مجھے یقین دلایا گیا کہ گاندھی جی کی شرطیں انھیں منظور ہیں، اور اب مجھے گاندھی جی سے یہ درخواست کرنی چاہیے کہ اپنا برت توڑ دیں۔

اگلی صبح، میں نے دہلی کے نمائندہ لیڈروں کی ایک میٹنگ طلب کی۔ ہم اس فیصلے تک آئے کہ سب کو برلا ہاؤس جانا چاہیے اور گاندھی جی کو شخصی طور پر یقین دلانا چاہیے۔ میں تقریباً دس بجے برلا ہاؤس پہنچا اور گاندھی جی سے کہا۔ اب میں مکمل طور پر مطمئن ہوں کہ ان کا مقصد پورا کر دیا گیا ہے۔ ان کے برت نے ہزاروں کے دل بدل دیے تھے اور اُن میں انصاف اور انسانیت کا احساس پھر سے جگایا تھا۔ ہزاروں نے اب یہ عہد کیا تھا کہ فرقوں کے درمیان اچھے تعلقات برقرار رکھنے کو وہ اپنا اوّلین مقصد سمجھیں گے ——— میں نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ اس یقین دہانی کو قبول کرلیں اور اپنا برت ترک کر دیں۔

صاف نظر آتا تھا کہ گاندھی جی خوش تھے۔ مگر ہماری درخواست اس وقت تک انھوں نے قبول نہیں کی تھی۔ دن بحثوں اور منّتوں میں گزر گیا۔ اُن کا وزن اور طاقت گھٹ گئی تھی اور وہ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ وہ بستر پر دراز تھے اور جو بھی وفد آتا، اس کی باتیں سنتے تھے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کے دل سچ مچ کس حد تک بدلے ہیں ——— آخیر میں انھوں نے کہا کہ دوسرے روز صبح تک وہ جواب دیں گے۔

صبح دس بجے ہم سب ان کے کمرے میں یکجا ہو گئے۔ جواہر لال پہلے سے وہیں تھے۔ دوسرے اور لوگ جو آئے ان میں پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین بھی تھے جنھوں نے گاندھی

جی سے ملنے کی اجازت چاہی تھی۔ گاندھی جی نے انھیں بلوالیا اور وہ مجمع جس میں سردار پٹیل کے سوا ساری کابینہ موجود تھی، اس میں وہ بھی شامل ہو گئے۔ گاندھی جی نے اشارے سے کہا کہ جو لوگ اپنے عہد کو دوہرانا چاہتے ہیں، ایسا کریں۔ دہلی کے تقریباً پچیس لیڈر جن میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہر سیاسی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے شامل تھے، ایک ایک کر کے آگے بڑھے اور قسم کھائی کہ گاندھی جی نے جو شرطیں رکھی ہیں، انھیں وہ پوری وفاداری کے ساتھ انجام دیں گے۔ گاندھی جی نے پھر ایک اشارہ کیا اور ان کے حلقے کے مرد اور عورتیں رام دھن گانے لگے۔ اُن کی پوتی ایک گلاس میں سنترے کا عرق لائیں اور انھوں نے اشارہ کیا کہ وہ گلاس مجھے دے دیں۔ میں نے گلاس ان کے ہونٹوں سے لگایا اور گاندھی جی نے اپنا برت توڑ دیا۔

گاندھی جی کا برت شروع ہونے کے بعد، اخبار اسٹیٹسمین کے سابق ایڈیٹر مسٹر آرتھر مور نے بھی امپیریل ہوٹل میں اپنا برت شروع کر دیا تھا۔ ہندو مسلم فسادات سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر یہ ہنگامے ختم نہیں ہوتے، تو انھوں نے بھی مرن برت کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ بہت برسوں سے ہندستان میں تھے اور اسے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ بہ طور ایک ہندستانی کے، اسے وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اس انسانی بے بسی اور پستی کو دور کروائیں، جو اس وقت سامنے تھی۔ انھوں نے کہا ہندستان کو جس ہولناک المیے نے گرفت میں لے رکھا ہے۔ اس سے تو موت بہتر تھی۔ اب میں نے ان کو یہ پیغام بھجوایا کہ گاندھی جی نے اپنا برت توڑ دیا ہے۔ اور انھیں بھی یہی کرنا چاہیے۔

اپنا برت توڑنے کے بعد بھی، گاندھی جی کو دھیرے دھیرے اپنی طاقت بحال کرنے میں کئی روز لگ گئے۔ سردار پٹیل بمبئی سے واپس آئے اور گاندھی جی سے ملاقات کے لیے گئے۔ میں بھی اس وقت موجود تھا۔ گاندھی جی کی عظمت ایسے موقعوں سے زیادہ کسی اور موقعے پر روشن نہیں ہوتی تھی۔ انھوں نے پٹیل کا خیر مقدم بڑی شفقت اور ملائمت کے ساتھ کیا۔ ان کے چہرے بشرے میں ناراضگی یا غصے کا شائبہ تک نہیں تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ پٹیل بے چین ہیں اور ان کا طور طریقہ ابھی بھی رُوکھا اور رسمی تھا۔ وہ گاندھی جی سے

خوش نہیں تھے اور گاندھی جی نے مسلمانوں میں اپنے تحفظ کا احساس پیدا کرنے کے لیے جو کچھ کیا تھا، اسے وہ پسند نہیں کرتے تھے۔

گاندھی جی کی طرف اس رویے میں سردار پٹیل تنہا نہیں تھے ——— واقعہ یہ ہے کہ ہندوؤں کا ایک گروپ اس وقت سے گاندھی جی کے خلاف تلخی کا انداز اپنائے ہوئے تھا۔ جب انھوں نے پونے سے رہائی کے بعد جناح کے ساتھ گفت گو شروع کی تھی ——— ان کی ناراضگی روز بہ روز بڑھتی گئی۔ وہ کھلے عام گاندھی جی کی مذمت کرتے تھے کہ انھوں نے ہندوؤں کو ایسے مفادات سے محروم کر دیا ہے جن کو وہ جائز مفادات کا نام دیتے ہیں۔ یہ راز نہیں رہ گیا تھا اور پورے ملک میں لوگوں کو اس کا پتہ تھا۔ ہندستان کی تقسیم کے بعد، بہر حال، یہ معاملات پوری طرح ابھر کر سامنے آ گئے۔ مہا سبھا اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی قیادت میں ہندوؤں کا ایک حلقہ کھلے بندوں یہ کہتا پھرتا تھا کہ گاندھی جی ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگ گاندھی جی کی پرارتھنا سبھاؤں کی مخالفت بھی منظم کرنے لگے، جن میں گاندھی جی کی ہدایت پر ہندو مسیحیوں کے ساتھ ساتھ قرآن اور انجیل کی آیات بھی پڑھی جاتی تھیں۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب وہ دہلی آ گئے، اس کے بعد ان میں سے کچھ لوگوں نے ان کی پرارتھنا سبھاؤں کے خلاف ایک باقاعدہ ایجی ٹیشن شروع کر دیا اور یہ کہا کہ وہ قرآن یا انجیل کی آیتیں پڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس سلسلے میں پمفلٹ اور ہینڈ بل تقسیم کیے گئے۔ یہ کہہ کر بھی لوگوں کو گاندھی جی کے خلاف اکسایا گیا کہ وہ ہندوؤں کے دشمن ہیں۔ ایک پمفلٹ میں تو یہاں تک کہا گیا کہ اگر گاندھی جی نے اپنے طور طریقے بدلے نہیں تو انھیں قتل کرنے کی تدبیریں بھی کی جانی چاہئیں۔

گاندھی جی کے برت نے اس گروپ کو مزید اشتعال دلایا ——— اب انھوں نے گاندھی جی کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کیا۔ پرارتھنا سبھاؤں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہونے کے بعد، جلد ہی ان پر ایک بم پھینکا گیا۔ خوش قسمتی سے کسی کو چوٹ نہیں آئی لیکن پورے ہندستان میں لوگوں کو اس پر صدمہ پہنچا کہ کوئی گاندھی جی کے خلاف بھی

ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔ پولیس نے اپنی تحقیقات شروع کیں اور یہ بات بہت عجیب لگی کہ انھیں یہ تک معلوم نہ ہو سکا کہ بم کس نے رکھا تھا اور برلا ہاؤس کے باغ میں وہ بھلا کس طرح داخل ہو سکا ——— یہ بھی عجیب تھا کہ اس واقعے کے بعد بھی ان کی زندگی کی حفاظت کے لیے مناسب اقدامات نہیں کیے گئے۔ اس واقعے نے صاف ظاہر کر دیا کہ تعداد میں وہ چاہے جتنے کم ہوں، مگر ایک حلقہ گاندھی جی کو قتل کرنے کے درپے ہے۔ چنانچہ دہلی کی پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی سے یہ توقع فطری تھی کہ انھیں گاندھی جی کے تحفظ کی خاطر خصوصی انتظامات کرنے چاہئیں ——— مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ بات ہمارے لیے ہمیشہ شرم اور رنج کا باعث رہے گی کہ انتہائی مبتدیانہ قسم کی احتیاطی تدابیر بھی اختیار نہیں کی گئیں۔

کچھ اور دن گزر گئے ——— جیسے جیسے گاندھی جی کی طاقت دھیرے دھیرے بحال ہوتی گئی، انھوں نے پرارتھنا کے خاتمے پر مجمع سے خطاب کرنا دوبارہ شروع کر دیا۔ ہزاروں لوگ ان پرارتھناؤں میں شریک ہوا کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اپنا سندیسہ عوام تک پہنچانے کے سب سے موثر طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے۔

۳۰ رجنوری ۱۹۴۸ء کو میں دن کے ڈھائی بجے گاندھی جی کے پاس گیا۔ مجھے ان سے کئی اہم مسئلوں پر بات کرنی تھی اور میں ان کے ساتھ گھنٹے بھر سے زیادہ بیٹھا۔ پھر قریب ساڑھے پانچ بجے میں گھر واپس آیا۔ اچانک یاد آیا کہ کئی اہم نکات پر میں نے ان سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ میں برلا ہاؤس واپس آگیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ دروازے بند تھے۔ ہزاروں لوگ سبزہ زار پر کھڑے تھے اور بھیڑ چھلک کر سڑکوں پر پھیل گئی تھی ——— میں سمجھ نہیں سکا کہ معاملہ کیا تھا، مگر میری کار پر نظر پڑتے ہی انھوں نے میرے لیے راستہ بنایا۔ گیٹ کے قریب میں اترا اور ان کے گھر کی سمت چل پڑا۔ گھر کے دروازے بھی مقفل تھے۔ کھڑکی کے شیشے سے ایک مکین نے مجھے دیکھ لیا اور مجھے اندر لے جانے کے لیے باہر آیا۔ میں جس وقت داخل ہو رہا تھا کسی نے گلوگیر آواز میں کہا ——— 'گاندھی جی کو گولی ماردی گئی ہے اور وہ بے حس پڑے ہیں۔'

خبر ایسی تکلیف دہ اور غیر متوقع تھی کہ میں ان لفظوں کا مفہوم بھی مشکل سے سمجھ سکا۔ ایسا لگا کہ حواس معطل ہوگئے ہیں۔ اور میں گاندھی جی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کا چہرہ زرد تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ ان کے دو پوتے ان کے پانو پکڑے رو رہے تھے ——— میں نے اس طرح سُنا جیسے خواب میں کوئی کہہ رہا ہے۔ "گاندھی جی مرچکے ہیں۔"

حرفِ آخر

گاندھی جی کی شہادت ایک دور کے خاتمے کا علامیہ ہے۔ مَیں آج کے دن تک یہ بھلا نہیں پاتا کہ ہم جدید ہندستان کے شاید عظیم ترین فرزند کی زندگی کے تحفظ میں کس بری طرح ناکام ہوئے تھے۔ بم والے واقعے کے بعد، یہ توقع کرنا فطری تھا کہ دلّی کی پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی ان کی حفاظت کے لیے خصوصی تدابیر اختیار کرے گی۔ اگر کسی عام آدمی کی زندگی پر کوئی حملہ کیا جائے تو پولیس خاص اہتمام کرتی ہے۔ یہ اس صورت میں بھی کیا جاتا ہے جب کسی کو دھمکی آمیز خط یا پمفلٹ موصول ہوں۔ گاندھی جی کے معاملے میں تو صرف خط، پمفلٹ اور کھلے عام دھمکیاں ہی نہیں تھیں۔ بلکہ واقعتاً ایک بم بھی اُن پر پھینکا گیا تھا ——— یہ سوال تھا معاصر ہندستان کی سب سے بڑی شخصیت کی زندگی کا، پھر بھی کوئی مؤثر اقدام نہیں کیا گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس طرح کے اقدامات مشکل تھے۔ پرارتھنا سبھائیں کھلے میدان میں نہیں ہوتی تھیں بلکہ برلا ہاؤس کے سبزہ زار پر ہوتی تھیں۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جو چاروں طرف دیواروں سے گھری ہوئی تھی۔ کوئی بھی شخص سوائے پھاٹک کے اور کسی جانب سے داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ پولیس کے لیے یہ آسان ترین بات تھی کہ لوگ جب اندر آئیں یا باہر جائیں تو انھیں چیک کرلیا جائے۔

اس سانحے کے بعد عینی شاہدوں کے بیان سے یہ صاف ظاہر تھا کہ قاتل انتہائی

مشکوک انداز میں آیا تھا۔ اس کا طرزِ عمل اور الفاظ ایسے تھے کہ سی۔آئی۔ڈی اس پر نگاہ رکھ سکتی تھی اور اسے نگاہ رکھنی چاہیے تھی۔ اگر پولیس نے کوئی کارروائی کر دی ہوتی تو اس کا پتہ چل گیا ہوتا اور اسے غیر مسلح کر دیا جاتا۔ وہ ایک ریوالور لے کر بغیر کسی جانچ پڑتال کے اندر آ گیا۔ گاندھی جی جب پرارتھنا سبھا میں پہنچ گئے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہتے ہوئے گاندھی جی کو متوجہ کیا کہ "آج آپ کو دیر ہو گئی" —— گاندھی جی نے جواب دیا۔ "ہاں" —— اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور لفظ زبان پر لاتے، تین بار گولیاں چلائی گئیں، جنھوں نے ان کی بیش بہا زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

* ان تمام امور میں سب سے زیادہ لائقِ توجہ بات یہ تھی کہ سردار پٹیل گاندھی جی کے خلاف ہو گئے تھے۔ جس وقت گاندھی جی نے مسلمانوں کے تحفظ کے سوال پر برت رکھا، وہ بے نیاز رہے۔ پٹیل نے سوچا کہ برت کا رُخ ان کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے جب میں نے ان سے کہا کہ بمبئی نہ جائیں تو انھوں نے رکنے تک سے انکار کر دیا۔ مقامی پولیس پر ان کے رویے کا انتہائی افسوس ناک اثر پڑا۔ مقامی کارکن سردار پٹیل کی طرف دیکھتے تھے اور جب انھوں نے یہ دیکھا کہ گاندھی جی کی حفاظت کے لیے انھوں نے خصوصی احکامات نہیں جاری کیے تو خود ان لوگوں نے بھی یہ ضروری نہیں سمجھا کہ کوئی خاص تدابیر کی جائیں۔ گاندھی جی کی موت سے پہلے پٹیل کی بے پروائی اتنی نمایاں تھی کہ لوگوں نے اسے محسوس کر لیا تھا * —— یہ سانحہ ہو گیا تو اس پر غم و غصے کی ایک لہر کا دوڑ جانا فطری تھا۔ کچھ لوگ سردار پٹیل کو نا اہل یا اس سے بھی زیادہ خرابی کا قصوروار سمجھتے تھے۔ جے پرکاش نرائن نے اس مسئلے کو اٹھانے میں خاصی ہمت دکھائی۔ گاندھی جی کی موت پر اپنی دہشت اور رنج کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے دہلی میں جو جلسہ ہوا، اس میں جے پرکاش نرائن نے صاف کہہ دیا کہ حکومت ہند کے وزیر داخلہ ان کے قتل کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے۔ انھوں نے سردار پٹیل سے جواب طلب کیا کہ جب کھلے بندوں پروپیگنڈے کے ذریعہ گاندھی جی کے قتل پر لوگوں کو اکسایا جا رہا تھا اور ان پر واقعتاً ایک بم بھی پھینکا جا چکا تھا، تو آخر خصوصی تدابیر اختیار کیوں نہیں کی گئیں۔

کلکتے کے مسٹر پرفلا چندر گھوش نے بھی یہی مسئلہ اٹھایا۔ انھوں نے بھی گاندھی جی کی قیمتی زندگی کو بچانے میں ناکام رہنے پر حکومت ہند کی مذمت کی۔ انھوں نے یہ نشاندہی کی کہ اپنی سیاسی حیثیت کے لیے سردار پٹیل گاندھی جی کے مرہون منت تھے، اور انھیں ایک مضبوط اور مستعد وزیر داخلہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اس کی توجیہہ کس طرح کر سکتے ہیں کہ گاندھی جی کی زندگی کو بچانے کے لیے کوئی کوشش کیوں نہیں کی گئی؟

سردار پٹیل نے اپنے مخصوص انداز میں ان الزامات کا جواب دیا ——— بے شک اس سانحے پر انھیں گہرا دکھ پہنچا تھا مگر لوگ جس طرح کھلے عام انھیں قصوروار ٹھہرا رہے تھے، اس پر وہ ناراض بھی تھے ——— جب کانگریس پارلیمانی کمیٹی کی میٹنگ ہوئی، انھوں نے کہا کہ کانگریس کے دشمن اُن کے خلاف اس قسم کے الزامات لگا کر تنظیم میں نفاق پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کے تئیں اپنی وفاداری کا اعادہ کیا اور کہا کہ پارٹی کو ان الزامات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ گاندھی جی کی موت سے پیدا ہونے والی خطرناک صورت حال میں مضبوط اور متحد رہنا چاہیے ——— ان کی اپیل بے اثر نہیں رہی۔ کانگریس پارٹی کے بہت سے اراکین نے انھیں یقین دلایا کہ وہ ان کا ساتھ دیں گے۔

ملک کے مختلف حصوں میں اکا دکا وارداتیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ حالیہ زمانے میں فرقہ پرستی کا زہر کتنی گہرائی تک پھیل چکا تھا ——— بہ حیثیت مجموعی ملک پر اس قتل کا انتہائی شدید اثر پڑا، مگر چند شہروں میں لوگوں نے مٹھائیاں بانٹیں اور جشن کی تقریبات منعقد کیں ——— خاص طور پر گوالیار اور جے پور کی بابت یہ کہا گیا۔ مجھے افسوس ہوا جب میں نے یہ سنا ان دونوں شہروں میں کھلے عام مٹھائیاں بانٹی گئیں، اور لوگوں میں اتنی جرأت تھی کہ برسرِ عام خوشیاں منائی گئیں ——— بہرحال، ان کی یہ خوشی جلدی ہی ختم ہو گئی۔ مجموعی طور پر پوری قوم کو رنج و ملال کے احساس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور لوگوں کے غصے کا رُخ ان تمام لوگوں کی طرف ہو گیا تھا، جو گاندھی جی کے دشمن سمجھے جاتے تھے۔ سانحے کے دو یا تین ہفتے کے بعد تک ہندو مہاسبھا یا آر۔ ایس۔ ایس کے لیڈر باہر نکل کر لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی ہندو

مہاسبھا کے صدر اور مرکزی حکومت میں ایک وزیر تھے۔ انھیں اپنے گھر سے باہر آنے کی ہمت نہیں ہوئی اور کچھ عرصہ بعد انھوں نے مہاسبھا سے استعفیٰ دے دیا۔ بہر نوع، دھیرے دھیرے صورتِ حال بہتر ہوئی اور کچھ دنوں بعد لوگ اپنے کام سے لگ گئے۔

قاتل گوڈسے کے خلاف قانونی کارروائی شروع کر دی گئی لیکن اس کے خلاف مقدمہ قائم کرنے میں بہت وقت لگا —— چونکہ ایسا لگتا تھا کہ گاندھی جی کو قتل کرنے کی سازش دور تک پھیلی ہوئی ہے، اس لیے پولیس نے تفتیش کے کام میں کئی مہینے صرف کر دیے۔ گوڈسے کی گرفتاری پر پبلک کا ردِ عمل یہ ظاہر کرتا تھا کہ ہندو فرقے کا ایک حلقہ فرقہ پرستی کے زہر سے کتنا متاثر ہوا تھا۔ ہندستانیوں کی وسیع اکثریت نے گوڈسے کی مذمت کی اور اس کا موازنہ جوڈاز JUDAS سے کیا، مگر باعزت گھرانوں کی کچھ خواتین نے اس کے لیے ایک سوئٹر (کا تحفہ) بھیجا جسے خود انھوں نے اس کے لیے بُنا تھا۔ اس کی رہائی کے لیے ایک تحریک بھی چلائی گئی۔ اس کے حمایتی کھل کر اس کے فعل کی مدافعت نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے یہ تھے چونکہ گاندھی جی کا مسلک عدمِ تشدد تھا، اس لیے ان کے قاتل کی جان نہیں لینی چاہیے۔ جواہر لال کو اس مضمون کے ٹیلی گرام بھیجے گئے کہ گوڈسے کو پھانسی دینا گاندھی جی کے اصولوں کی خلاف ورزی ہوگا —— بہر نوع، قانون اپنے راستے پر چلا اور ہائی کورٹ نے اس کی سزائے موت کی توثیق کر دی۔

گاندھی جی کے انتقال کو مشکل سے دو مہینے گزرے ہوں گے جب سردار پٹیل پر دل کا دورہ پڑا۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ یہ اس صدمے کا نتیجہ تھا جو انھیں پہنچا تھا۔ جب تک گاندھی جی زندہ تھے، ان کے خلاف پٹیل کا غصہ برقرار رہا۔ جب گاندھی جی قتل کر دیے گئے اور لوگوں نے کھلے عام سردار پٹیل کو غفلت اور نااہلیت کا قصوروار ٹھہرایا تو انھیں شدید صدمے اور تضحیک کا احساس ہوا۔ اس سے قطعِ نظر، وہ بھول نہیں سکتے تھے کہ ان کے پاس جو کچھ بھی تھا اس کے لیے وہ گاندھی جی کے مرہونِ منت تھے۔ پٹیل کے لیے گاندھی جی کی،

بے پایاں شفقت اور توجہ نے صورت حال کو اور زیادہ مشکل بنا دیا ہوگا۔ ان سب کا اثر ان کے دماغ پر پڑا اور وہ پریشان رہے، یہاں تک کہ (کسی شریان میں انجمادِ خون کی وجہ سے) ان پر تھرومبوسس کا حملہ ہوا۔ وہ کوئی چار برس اور زندہ رہے مگر ان کی صحت کبھی بحال نہیں ہوئی۔

اس طرح، ہندستان نے اپنی آزادی حاصل کرلی، مگر اپنی وحدت کھو دی۔ ایک نئی ریاست پاکستان کے نام سے وجود میں لائی گئی۔ پاکستان مسلم لیگ کی تخلیق تھا۔ چنانچہ فطری طور پر اس نئی ریاست میں جماعت مسلم لیگ نے غالب اقتدار کی حیثیت اختیار کرلی ——— میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ کس طرح کانگریس کی مخالفت کے لیے شروع میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اسی لیے لیگ میں مشکل ہی سے کوئی ایسا رکن رہا ہوگا جس نے ملک کی آزادی کے لیے جنگ لڑی ہو۔ نہ تو انھوں نے کوئی ایثار کیا تھا نہ ہی وہ کسی جدوجہد کی ڈسپلن سے گزرے تھے۔ ان میں یا تو ریٹائرڈ حکام تھے، یا ایسے افراد جو انگریزوں کی سرپرستی کے تحت عوامی زندگی میں لائے گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب نئی ریاست کی تشکیل ہوئی تو اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو خدمت یا قربانی کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھتے تھے۔ نئی ریاست کے بہت سے حکمراں خود غرض لوگ تھے جو صرف ذاتی مفاد کی خاطر عوامی زندگی میں آئے تھے۔

نئی ریاست کے لیڈروں کی اکثریت یو۔ پی، بہار اور بمبئی سے تعلق رکھتی تھی۔ بہت سوں کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ وہ ان علاقوں کی زبان بول تک نہیں سکتے تھے جن پر اب پاکستان مشتمل تھا۔ اسی وجہ سے اس نئی ریاست میں حکمراں اور عوام کے مابین ایک خلیج رہی۔ ان خود ساختہ لیڈروں کو ڈر تھا کہ اگر آزاد انتخابات ہو گئے تو ان میں سے بیشتر کی واپسی تک کا بہت کم امکان ہے۔ ان کا مقصد اسی لیے یہ تھا کہ جب تک ممکن ہوسکے، انتخابات ملتوی کرا دیے جائیں اور ملک میں بس اپنی اقتصادی حیثیت اور اقتدار کی تعمیر کی جائے۔ دس برس گزر چکے ہیں اور ابھی حال ہی میں (وہاں) ایک آئین وضع کیا جا سکا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ یہ شکل بھی آخری نہیں لگتی کیونکہ جب دیکھو آئین میں مزید تبدیلیوں کی تجاویز ہوتی رہتی ہیں۔ ابھی تک

کسی کو معلوم نہیں کہ نئے آئین کے تحت پہلے انتخابات کب کرائے جائیں گے۔

پاکستان کی تخلیق کا واحد نتیجہ، برصغیر ہندستان کے مسلمانوں کی پوزیشن کو کم کرنا تھا — ساڑھے چار کروڑ مسلمان، جو ہندستان ہی میں رہے۔ وہ کمزور ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف، ابھی تک کوئی ایسا اشارہ نہیں ملا جس سے پتہ چلتا کہ پاکستان میں ایک مستحکم اور مستعد حکومت قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر اس سوال کو صرف مسلم فرقے کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کیا کوئی آج انکار کر سکتا ہے کہ ان کے لیے پاکستان ایک بہت افسوسناک اور نامبارک قدم رہا ہے؟ — واقعہ تو یہ ہے کہ میں جتنا سوچتا جاتا ہوں، اتنا ہی قائل ہوتا جاتا ہوں کہ پاکستان نے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تعلقات اتنے کشیدہ رہے ہیں کہ تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے بیشتر حمایتی یہی خیال رکھتے تھے۔ اور تقسیم کے بعد بہت سے کانگریسی لیڈروں کا بھی ایسا ہی خیال رہا ہے۔ جب کبھی تقسیم کے بعد میں نے جواہرلال یا سردار پٹیل سے اس سوال پر گفتگو کی، یہی وہ دلیل ہے جو انھوں نے فیصلے کی حمایت میں دی۔ بہرحال، اگر ہم معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کا تجزیہ صحیح نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کیبنٹ مشن کے موقع پر جو اسکیم میں نے مرتب کی تھی اور جسے مشن نے بڑی حد تک قبول کر لیا تھا، ہر نقطۂ نظر سے وہ مسئلے کا کہیں زیادہ بہتر حل تھی۔ اگر ہم ثابت قدم رہتے اور تقسیم کو ماننے سے انکار کر دیتے تو مجھے یقین ہے کہ ایک زیادہ محفوظ اور اس سے زیادہ شاندار مستقبل ہمارا منتظر ہوتا۔

کیا کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی تخلیق نے فرقہ وارانہ مسئلے کو حل نہیں کیا بلکہ اسے اور زیادہ شدید اور ضرررساں بنا دیا ہے؟ — تقسیم کی بنیاد ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی عداوت تھی۔ پاکستان کی تخلیق نے اسے ایک مستقل آئینی شکل دے دی اور اس کا حل کہیں زیادہ مشکل کر دیا۔ اس صورت حال کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ برصغیر ہندستان دو ریاستوں میں منقسم ہو گیا ہے جو ایک دوسرے کو نفرت اور خوف کے ساتھ دیکھتی ہیں۔ پاکستان کو یقین ہے کہ ہندستان اسے چین سے نہیں رہنے دے گا اور جب بھی اسے یہ موقع میسر آیا، اس کو برباد کر دے گا — اسی طرح ہندستان کو ڈر ہے کہ پاکستان کو جب بھی موقع ہاتھ آیا وہ ہندستان

کے خلاف اٹھے گا اور اس پر حملہ کر دے گا۔ اس نے دونوں ریاستوں کو اپنا دفاعی خرچ بڑھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ جنگ کے بعد غیر منقسم ہندستان دفاع پر صرف تقریباً ایک سو کروڑ روپے خرچ کرتا تھا۔ خود لارڈ ویول کا خیال تھا کہ دفاعی افواج کی تینوں شاخوں کے لیے ایک سو کروڑ کی رقم کافی ہونی چاہیے۔ پھر بٹوارہ ہو گیا۔ غیر منقسم فوج کا ایک چوتھائی حصہ پاکستان چلا گیا۔ اس کے باوجود، اپنی دفاعی افواج کی ضروریات پر ہندستان کو تقریباً ڈھائی سو کروڑ روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ ہندستان کی حکومت کی آمدنی کا تقریباً آدھا۔ دفاعی اخراجات کی نذر ہو جاتا ہے ——— پاکستان کی حالت اگر کچھ ہے تو اس سے خراب تر ہی ہے۔ اس واقعے کے باوجود کہ اس کے پاس ہندستان کی زمین اور افواج کا صرف ایک چوتھائی حصّہ ہے، اس امداد کے علاوہ جو اسے امریکہ سے ملتی ہے، وہ کم سے کم سو کروڑ خود اپنی آمدنی میں سے خرچ کر رہی ہے۔ اگر ہم ذرا دم لے کر سوچیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ان سب کی وجہ سے کتنی زبردست قومی بربادی ہو رہی ہے۔ اگر یہ رقم معاشی ارتقا کے لیے استعمال کی جا سکتی تو ملک کی ترقی کی رفتار بہت زیادہ تیز ہو سکتی تھی۔

ایسا لگتا ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے مقلدوں نے سمجھا ہی نہیں کہ جغرافیہ ان کے خلاف تھا۔ ہندستانی مسلمان اس طریقے سے بکھرے ہوئے تھے کہ ایک مربوط علاقے میں علاحدہ ریاست کی تشکیل ناممکن تھی ——— مسلم اکثریتی علاقے شمال مغرب اور شمال مشرق میں تھے۔ ان دونوں علاقوں میں طبیعی اعتبار سے کوئی نقطۂ اتصال نہیں ہے۔ ان دونوں علاقوں کے لوگ سوائے مذہب کے، ہر معاملے میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ یہ کہنا لوگوں کے ساتھ سب سے بڑا فریب کرنا ہے کہ مذہبی یگانگت اُن علاقوں کو متحد کر سکتی ہے جو جغرافیائی، اقتصادی لسانی اور ثقافتی اعتبار سے مختلف ہوں ——— یہ صحیح ہے کہ اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا تھا جو نسلی، لسانی، اقتصادی اور سیاسی حد بندیوں سے بالاتر ہو۔ مگر تاریخ نے، بہر حال، یہ ثابت کر دیا ہے کہ شروع کی چند دہائیوں کے بعد، یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کے بعد، اسلام تمام مسلم ممالک کو صرف اسلام کی بنیاد پر متحد نہیں کر سکا۔

یہ تھی ماضی کی حالت اور یہی حالت آج بھی ہے۔ کوئی یہ امید نہیں کر سکتا کہ مشرقی

مغربی پاکستان، اپنے تمام اختلافات کو درست کرلیں گے اور ایک قوم بن جائیں گے۔ یہاں تک کہ مغربی پاکستان کے اندر سندھ، پنجاب اور سرحد کے تینوں صوبے اندرونی بے آہنگی رکھتے ہیں اور اپنے الگ مقاصد اور مفادات کے لیے کام کررہے ہیں ——— بہرکیف، جو ہونا تھا ہو چکا۔ پاکستان کی نئی ریاست ایک حقیقت ہے۔ یہ ہندستان اور پاکستان دونوں کے مفاد میں ہوگا کہ اپنے دوستانہ تعلقات کو آگے بڑھائیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کریں۔ کوئی دوسرا طریق کار صرف اور زیادہ پریشانیوں، مصائب اور آلام کی راہ پر لے جائے گا۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہوا، وہ ناگزیر تھا۔ دوسری طرف اتنی ہی شدت کے ساتھ، لوگ اس امر میں یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ ہوا، غلط ہوا اور اس سے بچا جاسکتا تھا۔ ہم آج، نہیں کہہ سکتے کہ کس کا اندازہ صحیح ہے۔ یہ فیصلہ تو صرف تاریخ کرے گی کہ کیا ہم نے دانش مندی اور دوستی کے ساتھ عمل کیا تھا۔

ضمیمے

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ-۱

مرتّب کا نوٹ

مولانا آزاد کی خود نوشت کا پہلا مسودہ جب تیار ہو گیا تو انھوں نے سوچا کہ افراد اور واقعات پر چند رائیں ایسی بھی ہیں جن کی اشاعت فی الوقت مناسب نہیں ہوگی۔ اسی لیے انھوں نے نظرِ ثانی کے بعد ایک عبارت تیار کی جو حسبِ ذیل عنوان کے تحت شائع کی جا رہی ہے:

INDIA WINS FREEDOM

AN AUTOBIOGRAPHICAL NARRATIVE

BY MAULANA ABUL KALAM AZAD

مولانا آزاد نے سوچا کہ مستقبل کے مورّخ کے لیے بعض متنازعہ امور پر اپنے فیصلے اور رائے کا مکمل ریکارڈ بھی وہ چھوڑنا چاہیں گے جس کا کچھ حصّہ مطبوعہ کتاب سے الگ کر دیا گیا ہے۔ وہ مواد جو الگ نہیں کیا گیا ہے، اس کے سلسلے میں بھی اصل متن جو یہاں محفوظ کیا گیا ہے، اس سے چند جزوی اختلافات موجود ہیں۔ ایسا اس واقعے کی بنا پر ہوا کہ جو متن اشاعت کے لیے تھا اس میں کئی بار قطع و برید کی گئی، اور ایک یا دو مستثنیات کو چھوڑ کر، ان کی اصل رایوں کا لہجہ نرم کر دیا گیا تاکہ ان کے بعض ہم عصروں اور ساتھی کارکنوں کے احساسات کو ٹھیس نہ پہنچے۔

وہ عبارتیں جو مطبوعہ کتاب میں شامل نہیں ہیں، ان کے بارے میں مولانا آزاد کی اصل رائے اور فیصلہ ان کاغذات میں ملے گا جو نیشنل آرکائیوز میں جمع کر دیے گئے ہیں (مکمل اور نظر ثانی شدہ متن میں)، جو نمایاں اختلافات ہیں، ان کی جانب اشارہ حسب ذیل طور پر کیا جاسکتا ہے:

الف: مولانا آزاد سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر سید محمود کو بہار کا پہلا کانگریسی وزیر اعلیٰ نہ بنا کر ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ دوسری طرف، ان کا ذہن اس معاملے میں بھی یکساں طور پر صاف تھا کہ قلعۂ احمد نگر جیل سے ڈاکٹر سید محمود نے جس طریقے سے اپنی رہائی حاصل کی، اس کی مدافعت ممکن نہیں ——— مولانا آزاد نے ڈاکٹر سید محمود کے جیل سے باہر آنے کے بعد کی بعض کارروائیوں کو بھی ناپسند کیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں معاملات سے متعلق صفحات کو مطبوعہ متن سے الگ کر دیا جائے۔

ب: مولانا آزاد یہ سمجھتے تھے کہ سردار پٹیل نے ایک ایسا رول ادا کیا تھا جو کانگریس کے نصب العین سے ہمیشہ ہم آہنگ نہیں رہا۔ جب کہ مطبوعہ متن سردار پٹیل کے بارے میں ان کی رائے کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے، انھوں نے اپنے بعض سخت محاکموں کو الگ بھی کر دیا ہے، کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ قومی مفاد کی خاطر ان کی اشاعت ملتوی کر دینی چاہیے۔

ج: مولانا آزاد نہ صرف یہ کہ مسٹر کرشنا مینن کو ناپسند کرتے تھے، بلکہ ان کے لیے مولانا صریحاً حقارت کا رویہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کرشنا مینن قابلِ اعتبار نہیں تھے، اور ان کا ارادہ تھا کہ اپنی خود نوشت کی تیسری جلد میں، وہ ہندستان کے ہائی کمشنر کی حیثیت سے مسٹر مینن کے بعض کاموں پر اور زیادہ بھرپور طریقے سے بحث کریں گے۔ مولانا آزاد اس امر میں یقین رکھتے تھے کہ مسٹر مینن کے خلاف

الزامات کی چھان بین ہونی چاہیے تھی تاکہ یا تو وہ بری کر دیے جاتے یا موردِ الزام قرار دیے جاتے۔ اس مسئلے کے بارے میں وہ اتنی شدت سے محسوس کرتے تھے کہ ۱۹۵۴ء میں جب مسٹر جواہر لال نہرو نے مینن کو کابینہ میں شامل کرنا چاہا تو مولانا نے اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ بڑی مشکلوں سے یہ ہو پایا کہ بعد میں وہ مسٹر مینن کی کابینہ میں شمولیت پر رضامند کیے گئے۔ انھوں نے کھل کر کہا کہ ایسا انھوں نے صرف مسٹر نہرو کی خواہشوں کے احترام میں کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ اس وقت اپنے خیالات کو عام نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مسٹر نہرو اس سے کمزور پڑ جائیں گے۔

د : مولانا آزاد کے دل میں مسٹر جواہر لال نہرو کے لیے ملی جلی شفقت اور تحسین کے بہت حرارت آمیز احساسات تھے۔ بے شک، ان کی بعض کارروائیوں کو انھوں نے بہت جذباتی اور عجلت پسندانہ سمجھ کر ناپسند کیا، اور مطبوعہ متن میں مسٹر نہرو کی کارروائیوں سے اپنے اختلاف یا ان کے تئیں اپنی ناپسندیدگی کی جانب چند اشارے کیے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مسٹر نہرو میں خوبیاں اتنی زیادہ ہیں اور وہ ہندوستان کے اتنے سچے خدمت گزار ہیں کہ ان کی بعض کمزوریوں پر زور نہیں دینا چاہیے، خاص طور پر ان کی زندگی میں کوئی بھی ایسی بات، جو مسٹر نہرو کی حیثیت کو کمزور کر دے، مولانا کے نزدیک قومی مفادات کے لیے ضرر رساں تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ، وہ سمجھتے تھے کہ مستقبل کے مؤرخ کو ان کمزوریوں کی بابت کچھ اطلاع ہونی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے ان باتوں کو اپنی خودنوشت کے لیے تخریج مسودے میں چھوڑ دیا۔

مولانا کی یہ خواہش تھی کہ جب ناشر کو (روکے گئے) کاغذات دیے جائیں تو ان کی خود نوشت میں ان عبارتوں کو شامل کر دیا جائے۔

نئی دہلی (دستخط)
۲ر اپریل ۱۹۵۸ء ہمایوں کبیر

ضمیمہ-۲

برطانوی حکومت کی ۲۹ رمارچ ۱۹۴۲ء کی تجاویز

سر اسٹیفرڈ کرپس نے حسب ذیل اعلانیے کا مسودہ برطانوی حکومت کی طرف سے جاری کیا۔

ہندوستان کے مستقبل کی بابت وعدوں کی تکمیل کے سلسلے میں، جس تردد کا اس ملک میں اور ہندوستان میں اظہار کیا گیا، ان پر غور کرنے کے بعد ہز میجسٹی کی حکومت نے صاف اور صریح لفظوں میں ان اقدامات کو بیان کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جنھیں وہ ہندوستان میں جلد از جلد ایک خود مختار حکومت کے قیام کے لیے کرنا چاہتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ایک نئی انڈین یونین بنائی جائے جو ایک ڈومینین کی حیثیت رکھے گی اور جس کا تعلق برطانیہ اور دوسری ڈومینینوں سے اس طرح ہوگا کہ ان سب میں تاج برطانیہ سے وفاداری مشترک ہے، مگر ہر اعتبار سے اس کا

درجہ ان کے برابر ہو گا اور یہ اپنے داخلی یا خارجی امور کے کسی بھی پہلو میں ان کی ماتحت نہیں ہوگی۔

اسی لیے، ہز میجسٹی کی حکومت حسب ذیل اعلان کرتی ہے:

الف: مخاصمتوں کے ختم ہونے پر، فوراً ہی ہندستان میں ایک منتخبہ تنظیم کے قیام کا ڈول ڈالا جائے گا، اس طریقے سے جس کی آگے وضاحت کی گئی ہے، اور ہندستان کے لیے ایک نیا آئین وضع کرنے کی ذمے داری اسے سونپ دی جائے گی۔

ب: مندرجہ ذیل طریقے کے مطابق، آئین بنانے والی جماعت میں ہندستانی ریاستوں کی شرکت کے انتظامات کیے جائیں گے۔

ج: ہز میجسٹی کی حکومت یہ وعدہ کرتی ہے کہ اس طریقے سے جو آئین مرتب ہو گا اسے منظور کر کے وہ فی الفور عمل میں لائے گی، صرف ان شرطوں کے ساتھ کہ ۱- برٹش انڈیا کے ہر اس صوبے کو جو نئے آئین کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو، یہ حق ہو گا کہ اپنی موجودہ آئینی حیثیت کو برقرار رکھے، مگر آئین میں یہ گنجائش بھی ہوگی کہ اگر وہ اس بات کا فیصلہ کر لے تو بعد کو بھی یونین میں شامل ہو سکتا ہے۔

یونین میں شامل نہ ہونے والے اس قسم کے صوبے، اگر یہ چاہیں گے تو ہز میجسٹی کی حکومت ایک نئے آئین پر رضا مند ہونے کے لیے تیار ہوگی جو انھیں ویسی ہی مکمل حیثیت دے گا جو کہ انڈین یونین کی ہے، اور یہ آئین اس طریقے پر مرتب ہو گا جو کہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۲- ایک معاہدے پر دستخط ہوں گے جس کا فیصلہ ہز میجسٹی کی حکومت اور آئین بنانے والی جماعت کے مابین مذاکرت کے بعد

ہو گا۔ یہ معاہدہ ان تمام ضروری معاملات پر محیط ہو گا جو انگریزوں سے ہندستانیوں کے ہاتھوں میں (حکومت کی) ذمے داریوں کی منتقلی کے باعث رونما ہوں گے؟ ہز میجیسٹی کی حکومت نے نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے جو وعدے کیے ہیں، اس معاہدے کی دفعات ان وعدوں کے مطابق ہوں گی، مگر اس معاہدے میں انڈین یونین کے اس اختیار پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہو گی کہ مستقبل میں اسے برطانوی دولت متحدہ کی دوسری ممبر ریاستوں کے ساتھ کیا تعلق قائم کرنا ہے۔

کسی بھی ہندستانی ریاست کے لیے، خواہ وہ آئین کے مطابق چلنا پسند کرے یا نہیں، مذاکرات کے ذریعے اس معاہدے کے انتظامات پر جو اس کے ساتھ کیا جا چکا ہے، نئی صورت حال جس حد تک بھی اس کی متقاضی ہو، نظر ثانی کرنا ضروری ہو گا۔

د : تاوقتیکہ ہندستان کے خاص فرقوں کے لیڈر مخاصمتوں کے اختتام سے پہلے کسی اور تشکیل پر متفق نہ ہو جائیں، آئین بنانے والی جماعت مندرجہ ذیل طریقے سے مرتب کی جائے گی۔

جیسے ہی ان صوبائی انتخابات کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا، جنھیں مخاصمتوں کے اختتام پر کرانا ضروری ہے، تو صوبوں کی مجالس قانون ساز کے ایوانِ زیریں کے جملہ ارکان ایک واحد انتخابی انجمن کے طور پر، متناسب نمائندگی کے اصول کے مطابق آئین بنانے والی جماعت کا انتخاب کریں گے۔ اس جماعت کے رکن اپنی تعداد کے لحاظ سے، انتخابی انجمن کے دسویں حصے کے برابر ہوں گے۔

ہندستانی ریاستوں کو اسی تناسب کے لحاظ سے اپنے نمائندے مقرر کرنے کی دعوت دی جائے گی جو کہ مجموعی طور پر برٹش انڈیا کے نمائندوں کا ہے اور ان کے اختیارات بھی وہی ہوں گے جو کہ برٹش انڈیا کے نمائندوں کے ہیں۔

: اس تشویشناک دور میں جس سے ہندستان اس وقت دوچار ہے، اور اس وقت تک جب تک کہ یہ نیا آئین وضع کر لیا جائے، ہز میجسٹی کی حکومت کو ناگزیر طور پر یہ ذمے داری سنبھالنی پڑے گی کہ وہ عالمی جنگ میں اپنے حصّے کی جدّ وجہد کے طور پر، ہندستان کے دفاع کی سمت اور اختیار کو اپنے ہاتھ میں رکھے، لیکن ہندستان کے تمام تر فوجی، اخلاقی اور مادّی وسائل کو منظم کرنے کا مرحلہ، ہندستانی عوام کی اعانت کے ساتھ، ہندستان کی حکومت کے ہی ذمّے ہوگا۔ ہز میجسٹی کی حکومت کی خواہش یہ ہے اور وہ اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ ہندستانی قوم کے خاص طبقوں کے لیڈر فوراً اور موثر طور پر اپنے ملک اور برطانوی دولت متحدہ اور اقوام متحدہ کے مشوروں میں شریک ہوں۔ اس طرح وہ ایک ایسے مرحلے کو طے کرنے میں اپنا سرگرم اور تعمیری تعاون دے سکیں گے، جو ہندستان کی آئندہ آزادی کے لیے اہم اور لازمی ہے۔

ضمیمہ۔۳

سر سٹیفرڈ کرپس سے خط و کتابت

برلا پارک
نئی دہلی، ۱۰ اپریل ۱۹۴۲ء

ڈیر سر سٹیفرڈ،

۲ اپریل کو میں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد آپ کو بھجوائی تھی جو ان تجاویز کے بارے میں، جنھیں آپ نے برطانوی حکومت کی طرف سے پیش کیا تھا، کمیٹی کے ممبروں کی آرا پر مشتمل ہے۔ اس قرارداد میں ہم نے مستقبل کے لیے کئی اہم اور دور رس تجاویز سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ ان تجاویز پر مزید غور و فکر نے ان کے بارے میں ہمارے یقین کو صرف مستحکم ہی کیا ہے، اور ہم اس بات کو دوہرانا چاہیں گے کہ ہم انھیں مجوزہ صورت میں قبول نہیں کر سکتے۔ ورکنگ کمیٹی کی قرارداد ان (تجاویز) سے متعلق ہمارے اُن نتائج کو سامنے لاتی ہے جن تک ہم انتہائی سنجیدگی کے ساتھ سوچ بچار کے بعد پہنچے تھے۔

اس قرارداد نے، بہرحال، موجودہ صورت حال کی سنگینی پر زور دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ہم جو بھی آخری فیصلہ کریں گے، وہ اُن تبدیلیوں کا تابع ہو گا جو اس وقت کی جائیں گی۔ سر دست جو بھاری بھرکم مسئلہ ہم سب کے سامنے، علی الخصوص تمام ہندستانیوں کے سامنے ہے، وہ جارحیت اور حملے سے ملک کو بچانے کا ہے۔

مستقبل، جس کی اہمیت میں کلام نہیں، اس کا انحصار اس پر ہوگا کہ اگلے چند مہینوں اور برسوں میں کیا کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم اس غیر یقینی مستقبل کے لیے کسی قسم کی یقین دہانیوں کے بغیر، اپنا کام چلانے پر آمادہ تھے، اس اُمید کے ساتھ کہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے اپنی قربانیوں کے ذریعے ہم ایک آزاد و خود مختار ہندوستان کی مضبوط اور پائدار بنیادیں قائم کریں گے۔ اسی لیے، ہم نے اپنی تمام تر توجہ حال پر مرکوز رکھی۔

حال کے بارے میں آپ کی ابتدائی تجاویز، جس طرح سے وہ مجوزہ اعلانیے کی دفعہ ہ میں شامل کی گئی ہیں، مبہم اور نامکمل تھیں، سوائے اس کے کہ ان میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ ہز میجسٹی کی حکومت کو ناگزیر طور پر ہندوستان کے دفاع کی پوری ذمے داری اٹھانی ہوگی۔ ان تجاویز میں دراصل یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کی آئندہ آزادی کو یقینی بنانے کے خیال سے آج کے مقرر کردہ کاموں میں شریک ہوا جائے۔ آزادی ایک غیر یقینی مستقبل کے لیے تھی، آج کے لیے نہیں؛ اور دفعہ ہ میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا کہ حال میں کیا انتظامات یا کارپی اور دیگر تبدیلیاں بروئے کار لائی جائیں گی۔ جب اس ابہام کی نشاندہی کی گئی تو آپ نے کہا کہ یہ ارادی ہے تاکہ دوسروں کے مشورے سے آپ کو ان تبدیلیوں کے تعین کی آزادی دی جائے۔ ہماری گفتگوؤں میں آپ نے ہمیں کچھ اس طرح کی بات سمجھائی کہ آپ کے ذہن میں کسی ایسی قومی حکومت کا تصور ہے جو دفاع کو چھوڑ کر دوسرے تمام معاملات سے سروکار رکھے گی۔

دفاع کا معاملہ کسی بھی وقت، اور خاص طور پر جنگ کے وقت میں، خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی قومی حکومت بہت ہی محدود میدان میں کام کرتی ہے۔ اس خیال سے قطع نظر، یہ ظاہر بات تھی کہ آپ کی تجاویز اور ہماری بات چیت کا تمام تر مقصد، ہندوستان پر حملے کے خطرے سے پیدا ہونے والے مسئلوں کے فوری حل کی ضرورت پر مرکوز تھا۔ کسی قومی حکومت کے اہم ترین

فرائض لازمی طور پر یہ ہونے چاہئیں کہ دفاع کو گہرائی کے ساتھ، اور وسیع ترین مقبول عام سطح، غرضیکہ دونوں کے لحاظ سے منظم کرے، اور کسی حملہ آور کے خلاف مزاحمت کی ایک عام نفسیات پیدا کرے۔ صرف ایک قومی حکومت ہی، جس پر یہ ذمے داری ڈال دی گئی رہی ہو، یہ کام انجام دے سکتی تھی۔ عام مزاحمت کا ایک قومی پس منظر لازماً ہونا چاہیے اور سپاہی اور عام شہری، دونوں کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ وہ قومی قیادت کے تحت اپنے ملک کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔

یہ سوال ہماری قومی آرزو کی تکمیل کا ہی نہیں رہ گیا، بلکہ یہ جنگ کو مؤثر طریقے سے چلانے اور ہر اس حملہ آور سے تادم آخر نبرد آزما رہنے کا سوال بھی بن گیا جس نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا ہو۔ عام اصولوں کے مطابق، قومی حکومت وزیر دفاع کے واسطے سے دفاع کو اپنے اختیار میں رکھے گی اور کمانڈر انچیف مسلح افواج کو اور جنگی کارروائیوں اور ان سے متعلق دوسرے معاملات کو اپنے کنٹرول میں رکھے گا۔ ایک سمجھوتے تک پہنچنے کے خیال سے، ہم وزیر دفاع کے عام اختیارات پر بعض پابندیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ ہمیں جنگ کے عین بیچ میں موجودہ فوجی تنظیم اور انتظامات کو بگاڑنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ ہم نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ جنگ کی اعلا تر حکمت عملی کو لندن میں جنگی کابینہ کے ذریعہ کنٹرول کیا جانا چاہیے جس میں ایک ہندوستانی رکن بھی ہوگا۔ ہمارے سامنے فوری مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے دفاع کو اور مؤثر بنائیں، اسے مستحکم بنائیں، اسے عوامی ارادے پر ایک وسیع سطح سے ہم کنار کریں اور اس سے ہر طرح کی سرخ فیتہ شاہی کو، تاخیر کو اور نااہلی کو کم کریں۔ تکنیکی اور عملی معاملات میں ہماری مداخلت کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ایک بات، بے شک ہمارے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی؛ اور وہ تھی ہندوستان کی حفاظت اور اس کا دفاع۔ ہندوستانی عوام کی متفقہ خواہش کے مطابق موجودہ تعطل سے نجات کا راستہ ڈھونڈ نکالنے میں کسی دشواری کا کوئی سبب نہیں تھا بشرطیکہ اس بنیادی توجہ کا لحاظ رکھا جاتا،

کیونکہ اس معاملے میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا۔

دماغ پر زور دینے کی وجہ سے آپ معاملے پر نئے رخ سے غور کرنے کی طرف مائل ہوئے اور آپ نے ۷ اپریل کو مجھے خط لکھا جس میں دفاع کا ایک فارمولا تجویز کیا گیا تھا۔

اس خط میں آپ نے فرمایا: "جیسا کہ ورکنگ کمیٹی نے سمجھا ہے، مخاصمتوں کے دور میں، موجودہ آئین میں کوئی تبدیلی کرنا ناممکن ہے"۔ اس معاملے میں ورکنگ کمیٹی کا رویہ یکسر غلط سمجھا گیا ہے اور مجھے اس کی صفائی کر دینی چاہیے ہر چند کہ فی الوقت ہم اس سے متعلق نہیں ہیں۔ کمیٹی ایسا نہیں سمجھتی کہ جنگ کے دوران آئینی تبدیلیوں کے راستے میں کوئی ناگزیر دشواری ہونی چاہیے۔ ہر وہ کام جو جنگ میں مددگار ہو سکے، نہ صرف یہ کہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اسے یہ کہا جانا چاہیے اور تیزی کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ یہی اکیلا راستہ ہے کسی جنگ کو جاری رکھنے اور اسے جیتنے کا، پیچیدہ ضابطے بنانا ضروری نہیں۔ ہندستان کی آزادی اور اس کے حق خود ارادیت کو، اور اسی کے ساتھ ساتھ بعض دوسری ذیلی مگر اہم تبدیلیوں کو، اگر اس کی خواہش ہوتی تو آسانی کے ساتھ تسلیم کیا جا سکتا تھا۔ باقی باتوں کو آئندہ انتظامات اور تناسبات پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ میں آپ کو یاد دلادوں کہ فرانس کے زوال کے وقت، برطانوی وزیراعظم نے واقعتاً فرانس اور انگلینڈ کی ایک یونین بنانا تجویز کیا تھا۔ اس سے بڑی اور بنیادی تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کی تجویز ایک زبردست بحران اور بربادی کے وقت میں پیش کی گئی تھی۔ جنگ تبدیلی کی رفتار کو تیز کرتی ہے؛ انجماد کے تصورات میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

آپ نے دفاع کا جو فارمولا ہمیں بھجوایا تھا، اس پر ہم نے اس کے ضمیمے کو ساتھ رکھ کر غور کیا، جس میں ان امور اور محکموں کی فہرست دی ہوئی تھی جو محکمۂ دفاع کو منتقل کیے جانے والے تھے۔ یہ فہرست خاصی انکشاف آمیز تھی کیونکہ

س نے ثابت کر دیا کہ وزیر دفاع نسبتاً کم اہم معاملات سے سروکار رکھے گا۔ ہم سے قبول نہیں کر سکتے تھے اور ہم نے آپ کو اس سے مطلع کر دیا تھا۔

اس کے بعد، دفاع کے لیے ایک نئے فارمولے کی تجویز ہمارے سامنے رکھی گئی، لیکن امور (شعبوں) کی فہرست کے بغیر۔ یہ فارمولا ہمیں ایک زیادہ صحت مند رویے پر مبنی محسوس ہوا، اور ہم نے اس نشاندہی کے ساتھ کہ ہمارے آخری فیصلے کا انحصار لازمی اعتبار سے شعبوں کی تفویض پر ہوگا، بعض تبدیلیاں بھی تجویز کی تھیں۔ پھر ہمیں ایک نظر ثانی شدہ فارمولا بھیجا گیا جس کے ساتھ اس امر کی طرف اشارہ بھی موجود تھا کہ محکمۂ جنگ کے ذمے کیا کیا کام ہوں گے۔

یہ فارمولا اتنے شرح و بسط کے ساتھ ترتیب دیا گیا تھا کہ ہمارے لیے یہ جاننا مشکل ہو گیا کہ محکمہ دفاع اور محکمۂ جنگ کے درمیان کاموں اور شعبوں کو واقعتاً کس طرح (الگ الگ) تفویض کیا جا سکے گا۔ ہماری طرف سے یہ گزارش کی گئی کہ ان امور سے متعلق ایک وضاحتی فہرست ہمیں مہیا کی جائے تاکہ ہم معاملے پر غور کر سکیں۔ ایسی کوئی فہرست ہمیں نہیں بھجوائی گئی۔

کل آپ سے ہماری جو گفتگو ہوئی تھی، اس میں ہم نے نئے فارمولے پر بحث کی تھی اور اس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ظاہر کیا تھا۔ اس وقت میں نے جو کچھ کہا تھا اُسے یہاں دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ فارمولے کی زبان، بہر نوع، ایک ضمنی معاملہ ہے اور ہمیں اس کو اپنے راستے میں حائل نہیں ہونے دینا چاہیے تاوقتیکہ کوئی اہم اصول خطرے میں نہ آن پڑا ہو۔ مگر اس زبان کے پیچھے بعض خیالات بھی ہوتے ہیں اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گزشتہ چند دنوں میں ہم غلط مفروضوں پر آگے بڑھ رہے تھے۔

جب ہم نے آپ سے دونوں محکموں کے لیے تفویض شدہ کاموں کی وضاحتی فہرستیں طلب کیں تو آپ نے محکمۂ دفاع کی اس پرانی فہرست کا حوالہ دے دیا جو آپ نے ہمیں پہلے بھیجی تھی اور جسے ہم قبول نہیں کر سکے تھے۔ ساتھ ہی آپ نے

فرمایا کہ اس فہرست میں باقیات سے متعلق چند امور کا اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن درحقیقت ایسے کسی (باقی ماندہ) امر کا امکان نہیں رہ گیا تھا کیونکہ کاموں کی تفویض کا عمل مکمل ہوچکا تھا۔ اس طرح بقول آپ کے، اپنے مواد کے لحاظ سے پرانی فہرست اور کوئی بھی نئی فہرست جو تیار کی جاسکتی ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اگر ایسا تھا، اور ہمیں بالآخر وہیں واپس جانا تھا جہاں سے ہم چلے تھے، تو کسی نئے فارمولے کی ہماری تلاش کا مقصد کیا تھا؟ لفظوں کے کسی نئے مجموعے سے، جن کا مفہوم وہی پرانا رہا ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہماری گفتگو کے دوران بہت سے دوسرے معاملات بھی صاف کرلیے گئے جو بدقسمتی سے ہمارے لیے ناموافق ہیں۔ آپ نے نجی طور پر بھی اور اپنے پبلک بیانات کے دوران بھی ایک قومی حکومت اور وزراء پر مشتمل ایک 'کابینہ' کا ذکر کیا تھا۔ یہ الفاظ ایک خاص معنویت رکھتے ہیں اور ہمارے تصور میں یہ بات تھی کہ نئی حکومت ایک کابینہ کے طور پر مکمل اختیارات کے ساتھ کام کرے گی جس کا آئینی سربراہ وائسرائے ہوگا۔ لیکن وہ نئی تصویر جو آپ نے ہمارے سامنے رکھی، دراصل پرانی تصویر سے بہت مختلف نہیں تھی، دونوں میں فرق نوعیت کا نہیں بلکہ درجات کا تھا۔ اس نئی حکومت کو، سوائے اس کے کہ مبہم اور غلط طور پر، نہ تو قومی حکومت کہا جاسکتا ہے نہ یہ اس حیثیت سے کام کرسکے گی۔ صرف وہی وائسرائے ہوگا اور اس کی مجلس منتظمہ (کونسل) جس میں وہی تمام پرانے اختیارات وائسرائے کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ ہم نے کسی قانونی تبدیلی کے لیے نہیں کہا تھا، مگر ہم نے اس طرح کی قطعی یقین دہانیاں اور روایات (کا قیام) ضرور چاہا تھا جو یہ ظاہر کرسکیں کہ نئی حکومت ایک آزاد حکومت ہوگی جس کے ارکین کسی آئینی حکومت کے اراکین کابینہ کے طور پر کام کریں گے، جنگ کو چلانے یا اس سے متعلق کارروائیوں کے بارے میں کمانڈر انچیف کو آزادی حاصل ہوگی اور وہ وزیر جنگ کے فرائض انجام

دے گا۔

ہمیں اطلاع دی گئی کہ اس منزل پر، مبہم یا سرسری طریقے سے بھی، اُن روایات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا جن کا تاریخ حکومت کو ادروائرے کو ہونا چاہیے۔ بالآخر یہ امکان ہمیشہ سے تھا کہ مجلس منتظمہ (کونسل) کے ممبران اگر فالسرائے سے متفق نہ ہوں تو استعفیٰ یا استعفیٰ کی دھمکی دے سکتے تھے۔ اس طرح کی سہولت یا علاج کا دروازہ بے شک ہمیشہ کھلا رہتا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شروع ہی سے، ہم ایک نئی حکومت کی طرف اپنے رویے کی بنیاد تصادم اور استعفیٰ کے امکان پر رکھیں۔

اسی لیے، وہ تصویر جو ہمارے سامنے رکھی گئی ہے، ماہیت کے لحاظ سے پرانی تصویر کی بہ نسبت مختلف نہیں ہے۔ سارا مقصد جو ہمارے، اور ہمیں یقین ہے کہ آپ کے بھی پیشِ نظر ہے ——— یعنی یہ کہ عوام کی طرف ایک نیا نفسیاتی رویّہ پیدا کیا جائے، انھیں یہ احساس دلایا جائے کہ ان کی اپنی قومی حکومت آ چکی ہے، اور یہ کہ وہ اپنی نئی منتوحہ آزادی کا دفاع کر رہے ہیں ——— یہ مقصد برباد ہو جائے گا جب لوگ دیکھیں گے کہ وہی پرانی تصویر، حتیٰ کہ انھیں پرانے ناموں کے ساتھ اب پھر سامنے ہے۔ انڈیا آفس کا باقی رہنا جو ہمارے لیے بدی کی ایک علامت رہا ہے، اس تصویر پر مہرِ تصدیق ثبت کر دے گا۔ پچھلے کچھ عرصے سے یہ بات تقریباً طے شدہ سمجھی جاتی رہی کہ انڈیا آفس جلد ہی ختم کر دیا جائے گا کیونکہ یہ ایک سہوِ زمانی تھا۔ مگر اب ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایک گزرے ہوئے زمانے کی ناپسندیدہ یادگار تک باقی رکھی جائے گی۔

حکومت کی یہ تصویر، جو اپنے تمام اہم اوصاف کے اعتبار سے پرانی تصویر سے حد درجہ مماثل ہے، ایسی ہے کہ ہم اس میں موزوں نہیں بیٹھتے۔ عام حالات میں، اس معاملے کو رد کرنے میں ہمیں بس ذرا سی مشکل پیش

آتی کیونکہ یہ اس نصب العین سے، جس کی خاطر ہم نے جدّو جہد کی تھی، بہت زیادہ دور ہے، لیکن آج کے حالات میں، ہم ایسی ہر تجویز کا پورا لحاظ رکھنے کے لیے تیار ہیں، جو ہندستان کے دفاع کی ایک موثر تنظیم کی طرف رہنمائی کر سکے۔ ہندوستان جس بربادی سے دوچار ہے، اس کا جتنا اثر امکاناً کسی غیر ملکی پر پڑ سکتا ہے، اُس سے زیادہ ہم پر پڑتا ہے، اور ہم اپنے بس بھر اس کا سامنا کرنے اور اس پر قابو پانے کے لیے بے چین اور طلب گار ہیں۔ مگر، جب ہمیں یہ آزادی اور اختیار نہیں دیا گیا کہ ہم موثر طریقے سے ان کا بار سنبھال سکیں، اور جب ایک فرسودہ ماحول جو قومی جدّو جہد میں رکاوٹیں ڈالتا ہے تا حال برقرار ہے، تو ہم ذمّے داریاں قبول نہیں کر سکتے۔

گرچہ ہم آپ کی پیش کردہ تجاویز کو تسلیم نہیں کر سکتے، ہم آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پھر بھی ہمیں ذمّے داری اختیار کرنا قبول ہے بشرطیکہ حقیقی معنوں میں ایک قومی حکومت بنائی جائے۔ فی الوقت ہم مستقبل سے متعلق تمام سوالات کو الگ کر دینے کے لیے تیار ہیں، گو کہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا تھا، اس کے بارے میں ہم متعین خیالات رکھتے ہیں لیکن اس وقت بھی قومی حکومت کو ایک کابینہ حکومت تو ہونا ہی چاہیے جس کے پاس مکمل اختیارات ہوں، اور اسے وائسرائے کی مجلس منتظمہ (کونسل) کا محض ایک تسلسل بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ دفاع کے بارے میں، ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہمارے خیال میں اس وقت اس کی کیا صورت ہونی چاہیے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ایک قومی حکومت کو چلانے اور اس عام اپیل کو سامنے لانے کے لیے جس کی فی الفور ضرورت ہے۔ یہ انتظام تو کم سے کم ناگزیر ہوگا۔

ہم آپ سے یہ بھی عرض کریں گے کہ جو تجاویز ہم نے پیش کی ہیں،

صرف ہماری نہیں ہیں، بلکہ انھیں ہندستانی عوام کا متفقہ مطالبہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ان معاملات پر مختلف گروہوں اور جماعتوں میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے، اور جو بھی اختلاف ہے وہ مجموعی طور پر ہندستانی عوام اور برطانوی حکومت کے مابین ہے۔ اس طرح کے اختلاف جو ہندستان میں موجود ہیں مستقبل کی آئینی تبدیلیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم اس مسئلے کے التوا پر رضامند ہیں تاکہ ہندستان کے دفاع کی خاطر، موجودہ بحران میں حتی الوسع زیادہ سے زیادہ اتحاد قائم کیا جا سکے۔ یہ ایک المیہ ہوگا کہ ایسے وقت میں بھی جب ہندستان میں اتحاد رائے پایا جاتا ہے، برطانوی حکومت ایک قومی حکومت کو کام کرنے سے اور اسے ہندستان کے نصب العین بلکہ ان وسیع تر مقاصد کی خدمت کرنے سے روکے جن کے لیے آج لاکھوں انسان صعوبتیں اٹھا رہے ہیں اور مر رہے ہیں۔

آپ کا مخلص
دستخط
ابوالکلام آزاد

رائٹ آنریبل سر سٹیفرڈ کرپس،
۳، کوئن وکٹوریا روڈ،
نئی دہلی

۱۱ر اپریل کو کرپس نے مجھے حسب ذیل جواب دیا۔

۳، کوئن وکٹوریا روڈ
نئی دہلی، ۱۱ر اپریل ۱۹۴۲ء

مائی ڈیر مولانا صاحب،

مجھے آپ کا ۱۰ اپریل کا خط پاکر، جس میں آپ نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی طرف سے ہز میجسٹی کی حکومت کے اعلانیے کے مسودے کی نامنظوری کا اظہار کیا ہے، انتہائی افسوس ہوا۔

میں ان نکات سے بحث نہیں کروں گا جن کا احاطہ آپ کی کمیٹی کے اصل ریزولیوشن میں، جو آپ نے مجھے بھیجا تھا، کیا جاچکا ہے، کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ (نکات) آپ کے فیصلے کا سبب نہیں تھے۔

نہ ہی مجھے وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف بطور ممبر جنگ کے مابین، فرائض کی تقسیم کے اس سوال میں جانے کی ضرورت ہے جس کا آپ نے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس تقسیم نے تمام امور وزیر دفاع کے سپرد کر دیے تھے سوائے ان امور کے جو حقیقی معنوں میں جنرل ہیڈکوارٹرز، نیوی ہیڈکوارٹرز اور ایئر ہیڈکوارٹرز سے متعلق ہیں اور جو ہندستان میں جنگ کا فریضہ انجام دینے والی افواج کے سربراہ کی حیثیت سے کمانڈر انچیف کے ماتحت ہیں۔

"دفاع" کے محدود دائرے میں ان کاموں کے علاوہ یہ تجویز کیا گیا کہ دوسرے تمام پورٹ فولیوز جن کا تعلق حسب ذیل امور سے ہے یعنی کہ:

محکمۂ داخلہ ——— اندرونی نظم و نسق، پولیس، شرنارتھی وغیرہ

محکمۂ مالیات ——— جنگ سے متعلق ہندستان میں تمام مالی مسائل

محکمۂ رسل و رسائل ——— ریلوے، سڑکیں، ٹرانسپورٹ وغیرہ

محکمۂ سپلائی ——— تمام افواج کے لیے عام ضروریات اور گولہ بارود کی فراہمی

محکمۂ اطلاعات و نشریات ——— پروپیگنڈا اور پبلسٹی وغیرہ

محکمۂ شہری دفاع ——— اے، آر، پی اور شہری دفاع کی تمام صورتیں

محکمۂ قانون ساز ——— ضابطے اور احکامات

محکمۂ محنت ——— مَین پاور MAN POWER

محکمۂ دفاع ——— انتظامیہ اور ہندستانی ملازمین وغیرہ ———

انھیں مجلسِ منتظمہ (کونسل) کے ممبروں کی حیثیت سے نمائندہ ہندستانیوں کے ہاتھوں میں دے دینا چاہیے۔

کمانڈر انچیف کی ماتحتی میں ہندستان کے فوری دفاع کو جوکھم میں ڈالے بغیر، نمایندہ ہندستانی ممبروں کے لیے دفاعی محکموں میں ذمے داریاں تفویض کرنے کے نام پر، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دفاع، جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہز میجسٹی کی حکومت کا اہم ترین فرض اور ذمے داری ہے، جب کہ اتحادیوں سے ہندستان کو جو مدد مل رہی ہے، اس کے مفاد میں کمانڈ کی وحدت لازمی ہے۔

قومی حکومت میں شریک ہونے سے آپ کے انکار کا اصل سبب یہ ہے کہ حکومت کی جو شکل تجویز کی گئی ہے، وہ ایسی نہیں ہے کہ اگر آپ چاہیں تو اس کی بنیاد پر ہندستانی عوام کو یکجا کرسکیں۔

آپ نے دو مشورے دیے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس وقت آئین کو بدلا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں، میں یہ نشاندہی کروں گا کہ آپ نے، تجاویز کی وصولیابی کے تقریباً تین ہفتوں کے بعد، یہ مشورہ پہلی بار کل رات کو پیش کیا، اور میں یہ بھی کہوں گا کہ دوسرے نمایندوں میں سے ہر ایک نے، جس کے ساتھ میں نے اس خیال پر بحث کی، یہ مان لیا ہے کہ جنگ کے عین وسط میں یا ایک ایسے وقت میں جیسا کہ آج ہے، ایسی کوئی قانونی تبدیلی عملاً ناممکن ہوگی۔

آپ کا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ 'حقیقی معنوں میں قومی حکومت' کی تشکیل ہو جس کو لازماً تمام اختیارات کی حامل کابینۂ حکومت' ہونا چاہیے۔

جیسا کہ آپ سمجھتے ہیں، انتہائی پیچیدہ نوعیت کی، اور ایک بہت بڑی سطح پر، آئینی تبدیلیوں کے بغیر یہ ممکن نہیں ہوگا۔

موجودہ حالات میں اس طرح کا نظام اگر (آئینی) روایت کے واسطے سے لایا گیا تو نامزد شدہ کابینہ (جسے قیاساً بڑی سیاسی تنظیمیں نامزد کریں گی) اپنے سوا کسی اور کے تئیں ذمّے دار نہیں ہوگی، برطرف نہیں کی جاسکے گی اور دراصل، وہ اکثریت کے لیے مطلق آمریت بن جائے گی۔

اس مشورے کو ہندستان کی تمام اقلیتیں مسترد کردیں گی کیونکہ اس طرح وہ سب کابینہ کی مستقل اور استبدادی اکثریت کی تابع ہوجائیں گی۔ نہ ہی یہ مشورہ ان حلفیہ وعدوں سے ہم آہنگ ہوگا جو ہز میجسٹی کی حکومت ان اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے کیے تھے۔

ہندستان جیسے ایک ملک میں جہاں فرقہ وارانہ تقسیمیں ابھی تک بہت گہری ہیں، اس قسم کی غیر ذمّے دار اکثریتی حکومت ممکن نہیں ہے۔

اس سے قطع نظر، اس وقت تک جب تک کہ ہندستانی عوام اپنا اپنا آئین وضع کرلیں، ہز میجسٹی کی حکومت کو لازماً یہ کرنا چاہیے کہ ہندستانی عوام کے ان وسیع حلقوں کے تئیں اپنی ذمّے داریاں پوری کرتی رہے جن سے اس نے حلفیہ وعدے کیے تھے۔

ہز میجسٹی کی حکومت کی تجاویز اس حد تک گئیں جہاں تک جانا ممکن تھا، سوائے اس کے کہ آئین میں مکمل تبدیلی کی بات نہیں کی جسے آج کے حالات میں عام طور پر ناقابلِ عمل تسلیم کیا جاتا ہے۔

اسی لیے، اگرچہ میں اور ہز میجسٹی کی حکومت، دونوں آپ کی ورکنگ کمیٹی کی اس شدید آرزو مندی کو سمجھتے ہیں کہ اپنے اختیار میں جو بھی وسائل ہیں ان کی مدد سے دشمن کے خلاف جنگ کو جاری رکھا جائے، دونوں کو یہ افسوس بھی ہے کہ آپ کی ورکنگ کمیٹی، ان شرطوں پر جنھیں ہم نے ایسی واحد شرطیں سمجھ کر پیش کیا

تھا، جو ہندستانی عوام کے تمام مختلف فرقوں اور حصوں کو ایک دوسرے سے قریب لا سکتی تھیں، جن کی کوششوں میں شرکت پر آمادہ نہیں ہو سکی۔

آپ کا مخلص،

دستخط

سٹیفرڈ کرپس

میرا ارادہ ہے کہ اس جواب کو شائع کردوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد،

برلا ہاؤس،

نئی دہلی

میں نے اسی روز انھیں جواب لکھ بھیجا۔

برلا ہاؤس

البوقرق روڈ،

نئی دہلی۔

۱۱ر اپریل ۱۹۴۲ء

ڈیر سر سٹیفرڈ،

آپ کا ۱۰ر اپریل کا خط مجھے ابھی ابھی ملا ہے اور مجھے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ میرے ساتھی اور میں، اس خط کو پڑھ کر خاصے حیران ہوئے۔ میں آپ کو فوراً ہی یہ جواب بھیج رہا ہوں اور آپ نے جو نکتے اٹھائے ہیں ان میں سے کچھ کے

بارے میں یہاں مختصراً ہی لکھ سکتا ہوں۔

ہماری اصل قرارداد میں جن نکات کا احاطہ کیا گیا ہے، اہم ہیں اور یہ حیثیت مجموعی برطانوی تجاویز پر، میری کمیٹی کے اچھی طرح سوچے سمجھے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے آپ کو متوجہ کیا تھا کہ چونکہ اس خطرے کی گھڑی میں، ہم ہندستان کی حکومت اور دفاع کی ذمّے داری سنبھالنے کے لیے بہت بے چین تھے، اس لیے جہاں تک ان تجاویز کا تعلق مستقبل سے ہے، انھیں الگ رکھا جاسکتا ہے۔ مگر، بہرحال، یہ ذمّے داری صرف اُسی صورت میں سنبھالی جاسکتی تھی، جب یہ سچّی ذمّے داری اور اختیار ہوتی۔

جہاں تک وزیر دفاع اور وزیر جنگ کے درمیان کاموں کی تقسیم کا تعلق ہے، آپ نے وہ وضاحتی فہرستیں مہیا نہیں کیں، جن کی ہم نے درخواست کی تھی، اور وزیر دفاع کے کاموں کی پرانی فہرست کا حوالہ دے دیا جس کی بابت آپ کو پتہ ہے کہ ہم اسے قبول کرنے سے مکمل طور پر قاصر تھے۔ آپ نے اپنے زیر جواب خط میں بعض ایسے اُمور کا ذکر کیا ہے جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر جنگ سے متعلق ہیں اور جو دوسرے محکموں کے زیرِ انتظام رہیں گے۔ جہاں تک وزیر دفاع کا تعلق ہے، یہ بات صاف ہے کہ اس کے کاموں کا دائرہ آپ کی بھیجی ہوئی پہلی فہرست کے مطابق ہوگا۔

کسی نے بھی کمانڈر انچیف کے عام اختیارات پر کوئی پابندی عاید کرنے کا مشورہ نہیں دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے تھے اور یہ ماننے کے لیے تیار تھے کہ بہ حیثیت وزیر دفاع اسے مزید اختیارات دے دیے جائیں۔ لیکن یہ بات صاف ہے کہ دفاع کے سلسلے میں برطانوی حکومت کے اور ہمارے خیال میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہمارے لیے اس کا مطلب اسے ایک قومی کردار عطا کرنا اور ہندستان کے ہر مرد اور عورت کو اس میں شرکت کے لیے مدعو کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود اپنے لوگوں پر بھروسہ کریں

اور اس عظیم جدوجہد میں ان کے مکمل تعاون کی تلاش کریں (اس کے برعکس) برطانوی حکومت کا خیال ہندستانی عوام پر مکمل اعتماد عدم اور اصل اقتدار سے انھیں محروم رکھنے پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ آپ دفاع کے بارے میں ہز میجسٹی کی حکومت کے اعلا ترین فرض اور ذمے داری کی بات کرتے ہیں۔ اس فرض اور ذمے داری کو موثر طریقے سے انجام ہی نہیں دیا جا سکتا تاوقتیکہ ہندستانی اپنی ذمے داری کو محسوس کرنے اور یہ سمجھنے نہ لگیں کہ ان کے سپرد یہ ذمے داریاں کردی گئی ہیں، اور ماضی قریب اسی امر کی شہادت دیتا ہے۔ ہندستان کی حکومت ایسا لگتا ہے کہ یہ سمجھ ہی نہیں سکی ہے کہ جنگ صرف ایک عوامی بنیاد پر لڑی جا سکتی ہے۔ آپ کا یہ بیان کہ ہم تین ہفتوں کے بعد پہلی بار آئین میں تبدیلی کا مشورہ دے رہے ہیں مشکل سے ہی درست ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران اس کا ذکر آیا تھا، لیکن یہ صحیح ہے کہ ہم نے اس پر دباؤ نہیں ڈالا کیونکہ ہم نئے مسئلے نہیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ مگر، جب آپ نے اپنے خط میں صراحت کے ساتھ یہ کہا کہ ہم اس پر رضامند تھے کہ جنگ کے دوران کوئی آئینی تبدیلی نہیں کی جائے گی تو ہم کو اس کی تردید اور آپ کے تاثر کی اصلاح کرنی پڑی۔

ہمیں خاص طور پر جس بات نے حیران کیا ہے اور تکلیف پہنچائی ہے، وہ آپ کے خط کا آخری حصہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے جیسے ہمارے مذاکرات آگے بڑھتے گئے، برطانوی حکومت کے رویے میں مسلسل خرابی پیدا ہوتی گئی۔ آپ سے پہلی گفت و شنید میں ہم سے جو کچھ کہا گیا تھا اب یا تو اس سے انکار کیا جا رہا ہے یا اس کی تاویل پیش کی جا رہی ہے۔ اس وقت آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک قومی حکومت قائم کی جائے گی جو ایک کابینہ کے طور پر کام کرے گی اور یہ کہ وائسرائے کی حیثیت کو اپنی کابینہ کے تعلق سے شہنشاہ انگلستان کی حیثیت کے جیسا ہونا چاہیے۔ انڈیا آفس کی بابت آپ نے مجھے بتایا کہ آپ کو اس پر حیرت تھی کہ ابھی تک کسی نے اس اہم مسئلے کا ذکر نہیں کیا تھا، اور یہ کہ قابل

عمل طریقہ یہ تھا کہ اسے ڈومینین کے دفتر سے جوڑ دیا جائے یا اس میں ضم کر دیا جائے۔

یہ پوری تصویر جو آپ نے ہمارے سامنے کھینچی، اُسے آپ کی ان باتوں نے جو آپ نے ہماری پچھلی ملاقات کے دوران کہی تھیں، اب بالکل بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

آپ نے اپنے خط میں ایک ایسی دلیل پیش کی ہے جس کا ذکر آپ نے ہماری گفتگوؤں کے دوران کبھی بھی نہیں کیا تھا۔ آپ 'اکثریت کی مطلق آمریت' کی بات کرتے ہیں۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ اس سلسلے میں، اب اس منزل پر اس طرح کا بیان دیا جائے۔ یہ مشکل، ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے بنائی جانے والی ایک مخلوط کابینہ کی کسی بھی اسکیم میں خلقی ہوتی ہے، مگر ایسے بہت سے طریقے ہیں جن سے اس کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ نے یہ سوال اٹھا دیا ہوتا تو ہم اس پر گفتگو کر لیتے اور اس کا اطمینان بخش حل ڈھونڈ نکالتے۔ اس سوال کی طرف پورا رویّہ یہ رہا ہے کہ ایک مخلوط کابینہ کی تشکیل ہونی چاہیے اور اسے ایک ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ ہم نے اسے تسلیم کر لیا۔ ہمیں اس سے دلچسپی نہیں کہ کانگریس کو ہی اقتدار ملے۔ مگر ہمیں اس سے دلچسپی ہے کہ بہ حیثیت مجموعی ہندستانی عوام کو آزادی اور اختیار مل جائے۔ کابینہ کی تشکیل کیونکر ہونی چاہیے اور اسے کام کس طرح کرنا چاہیے، اس سوال پر غور تو اصل سوال کے فیصلے کے بعد بھی کیا جا سکتا تھا؛ یعنی یہ کہ برطانوی حکومت ہندستانی عوام کو کس حد تک اختیار سونپ دے گی۔ اسی کی وجہ سے ہم نے اس پر (کابینہ کی تشکیل کے سوال پر) آپ سے کبھی گفتگو نہیں کی، یہاں تک کہ اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔ تاہم، آپ نے یہ معاملہ پہلی بار اپنے اس خط میں اٹھایا ہے جو ہمارے نام آپ کا شاید آخری خط ہو گا، اور انتہائی ناروا طور پر ہمارے مابین جو اصل مسئلہ ہے اسے پس پشت ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ آپ کے ساتھ اپنی پہلی ہی گفتگو میں، میں نے یہ نشاندہی کی تھی کہ ابھی اس منزل پر فرقہ وارانہ یا اس طرح کے سوالات نہیں اٹھتے۔ جیسے ہی برطانوی حکومت یہ طے کرے گی کہ اُسے اصل اقتدار اور ذمّے داری منتقل کرنی ہے، تو پھر دوسرے سوالات متعلقین خود ہی کامیابی کے ساتھ نمٹالیں گے۔ آپ نے مجھے یہ تاثر دیا تھا کہ اس رویّے سے آپ متفق ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر برطانوی حکومت نے نفاق کو بڑھاوا دینے کی پالیسی اختیار نہیں کی، تو ہم سب، چاہے ہمارا تعلق کسی بھی گروہ یا جماعت سے ہو، ایک دوسرے کے قریب آنے میں کامیاب ہوں گے اور ایک مشترکہ لائحۂ عمل ڈھونڈ نکالیں گے لیکن افسوس کہ بربادی کے اس سنگین وقت میں بھی برطانوی حکومت اپنی تباہ کن پالیسی سے دست بردار ہونے سے قاصر ہے۔ ہمیں اس نتیجے تک جانا پڑتا ہے کہ اس کے نزدیک، جتنی مدّت تک کے لیے ممکن ہو سکے، ہندستان میں اپنے اقتدار سے چپٹے رہنے اور اس مقصد کے پیشِ نظر، نفاق اور انتشار کو بڑھاوا دینے کی اہمیت زیادہ ہے، بہ نسبت اس کے کہ ہمارے سر پر جو جارحیت اور حملہ منڈلا رہا تھا، اس کے خلاف ہندستان کا مُوثر دفاع کیا جائے ——— ہمارے لیے اور تمام ہندستانیوں کے لیے' ہندستان کے دفاع اور تحفظ کا خیال مقدم ہے اور یہی وہ پیمانہ ہے جس سے ہم تمام باتوں کو جانچتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ میرے نام اپنے خط کو شائع کرانا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کو اعتراض نہیں ہو گا اگر ہم بھی اپنی اصل قرارداد، اپنے نام آپ کے خطوط اور آپ کے نام اپنے خطوط کو شائع کروا دیں۔

رائٹ آنریبل سر سٹیفرڈ کرپس
۳، کوئن وکٹوریا روڈ،
نئی دہلی۔

آپ کا مخلص
دستخط
ابوالکلام آزاد

ضمیمہ - ۴

ہندستان چھوڑدو قرارداد

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کی قرارداد مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۴۲ء میں اپنی جانب اس کے حوالے نیز بعد کے واقعات جن میں جنگ کی صورت حال کا نشوونما، برطانوی حکومت کے ذمے دار ترجمانوں کے بیانات، اور ہندستان اور بیرونی ملکوں میں ان پر ہونے والی تنقید اور تبصرے شامل ہیں، ان سب پر انتہائی توجہ کے ساتھ غور کیا ہے۔ کمیٹی اس قرارداد کو منظور کرتی ہے اور اس کی توثیق کرتی ہے، اور اس کا خیال ہے کہ بعد کو رونما ہونے والے واقعات نے اسے مزید جواز فراہم کر دیا ہے، اور یہ بات صاف کر دی ہے کہ خود ہندستان کے لیے اور اقوام متحدہ کے نصب العین، یعنی کہ دونوں کے لیے، ہندستان سے برطانوی اقتدار کا فوری خاتمہ اشد ضروری ہے، اس اقتدار کا تسلسل توہین آمیز ہے اور ہندستان کو کمزور کر رہا ہے اور اس میں اپنی حفاظت کر سکنے اور دنیا کی آزادی کے مقصد میں معاون ہو سکنے کی اہلیت روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔

کمیٹی نے، روسی اور چینی محاذوں پر صورت حال کی ابتری کا مایوسی کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور روسی اور چینی عوام اپنی آزادی کی مدافعت میں جو بہادری دکھا رہے ہیں اس کے لیے کمیٹی انھیں خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ یہ بڑھتا ہوا خطرہ اُن تمام لوگوں کے لیے، جو آزادی کی خاطر جدوجہد کر رہے ہیں اور جو جارحیت کا شکار ہونے والوں سے ہمدردی رکھتے ہیں، اس بات کو لازمی بناتا ہے کہ وہ اتحادی قوموں نے ابھی تک جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی، اس کی بنیادوں کا جائزہ لیں کہ یہی (بنیادیں) ان کی متواتر اور تباہ کن ناکامیوں کا باعث بنی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس نوع کے مقاصد، اور پالیسیوں اور طریقوں پر قائم رہ کر ناکامی کو کامیابی میں بدل لیا جائے کیونکہ

پچھلے تجربے نے یہ دکھا دیا ہے کہ ناکامی ان میں ناگزیر ہے۔ یہ پالیسیاں آزادی پر اتنی زیادہ مبنی نہیں ہیں جتنی کہ محکوم اور نوآبادیاتی ملکوں کے تسلط پر اور شہنشاہیت کی روایت اور طریق کے تسلسل پر ——— سلطنت پر قبضہ، بجائے اس کے کہ حکمراں طاقت کے استحکام میں اضافے کا سبب بنتا، ایک بوجھ اور عذاب ہو کر رہ گیا ہے۔ جدید سامراجیت کا مثالی نمونہ ہندستان، اس سوال کی گتھی بن گیا ہے، کیونکہ ہندستان کی آزادی کے واسطے سے ہی برطانیہ اور اقوام متحدہ کو پرکھا جائے گا، اور ایشیا اور افریقہ کے عوام امید اور ولولے سے بھر جائیں گے۔ چنانچہ اس ملک میں برطانوی اقتدار کا خاتمہ ایک بنیادی اور فوری مسئلہ ہے جس پر جنگ کے مستقبل کا اور آزادی و جمہوریت کی کامیابی کا انحصار ہے۔ اپنے تمام عظیم وسائل کو آزادی کی جدوجہد میں اور نازی ازم، فاشزم اور امپیریلزم کی جارحیت کی مخالفت میں جھونک کر ایک آزاد ہندستان اس کامیابی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ مادی اعتبار سے جنگ کے مقدرات متاثر ہوں گے، بلکہ یہ تمام محکوم اور مظلوم آبادیوں کو اقوام متحدہ کا طرفدار بنا دے گا اور ان قوموں کو، جن کا حلیف ہندستان ہوگا، دنیا کی اخلاقی اور روحانی قیادت بھی عطا کر دے گا۔ (غلامی کی) زنجیروں میں جکڑا ہوا ہندستان برطانوی سامراجیت کی علامت بنا رہے گا اور اس سامراجیت کا داغ تمام اقوام متحدہ کے مقدرات پر اثر انداز ہوگا۔

اسی لیے آج کا خطرہ، ہندستان کی آزادی اور برطانوی تسلط کے خاتمے کو ضروری بنا دیتا ہے۔ مستقبل کے بارے میں کوئی وعدہ یا کوئی ضمانت موجودہ صورت حال کو متاثر یا اس خطرے کو ختم نہیں کر سکتی۔ یہ عوام کے ذہن پر مطلوبہ نفسیاتی اثر پیدا ہی نہیں کر سکتے۔ اب تو صرف آزادی کی تابناکی ہی ان لکھوکھا انسانوں کی اس توانائی اور ولولے کا اخراج کر سکتی ہے، جو فوراً جنگ کے مزاج کو بدل کر رکھ دے گا۔

چنانچہ اے۔ آئی۔ سی۔ سی تمام تر اصرار کے ساتھ، ہندستان سے برطانوی اقتدار کو واپس لینے کے مطالبے کو دوہراتی ہے۔ ہندستان کی آزادی کے اعلان کے بعد، ایک عارضی حکومت بنائی جائے گی اور آزاد ہندستان، اقوام متحدہ کا حلیف بن کر آزادی کی مشترکہ جدوجہد سے وابستہ آزمائشوں اور مصیبتوں میں ان کے ساتھ ساتھ شریک رہے گا۔

یہ عارضی حکومت اس ملک میں خاص پارٹیوں اور گروپوں کے تعاون سے ہی تشکیل دی جا سکتی ہے۔ اس طرح یہ ایک مخلوط حکومت ہو گی، ہندستانی عوام کے تمام اہم حلقوں کی نمائندہ اس کے اولین کام یہ ہونے چاہئیں کہ اپنی تمام مسلح، اور اس کے ساتھ ساتھ عدم تشدد میں یقین رکھنے والی اُن افواج کی مدد سے جو اس کے احکامات کی تابع ہوں، نیز اپنی اتحادی طاقتوں کے تعاون سے ہندستان کا دفاع اور جارحیت کا مقابلہ کرے، کھیتوں اور کارخانوں اور دوسری جگہوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی فلاح وبہبود اور ترقی کو فروغ دے کیونکہ تمام اختیار اور اقتدار اصلاً انہی کا حق ہے۔ عارضی حکومت آئین ساز اسمبلی کے لیے ایک اسکیم بنائے گی پھر یہ اسمبلی ہندستان کی حکومت کے لیے ایک آئین تیار کرے گی جو تمام حلقوں کے لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔ اس آئین کو، کانگریس کے نظریے کے مطابق وفاق ہونا چاہیے جس میں وفاق کی اکائیوں کو خود مختاری کی سب سے زیادہ مقدار مہیا کی گئی ہو اور ان اکائیوں کو ہی باقی ماندہ (غیر مندرج) اختیارات تفویض کیے گئے ہوں۔ ہندستان اور اتحادی قوموں کے مابین آئندہ تعلقات ان تمام آزاد ممالک کے نمائندوں کے ذریعے مرتب کیے جائیں گے، اس طرح کہ اپنے باہمی فائدے، اور جارحیت کے خلاف مزاحمت کے مشترکہ مرحلے میں اپنے تعاون کے لیے، ان میں آپس میں گفت وشنید ہو گی۔ آزادی ہندستان کو مؤثر طور پر جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لائق بنائے گی اور ان کے پیچھے عوام کی متحدہ طلب اور طاقت ہو گی۔

ہندستان کی آزادی کو اُن تمام ایشیائی اقوام کے لیے جو بیرونی تسلط کی تابع ہیں آزادی کی ایک علامت اور اس کا پیش خیمہ ہونا چاہیے۔ برما، ملایا، انڈوچائنا، ڈچ انڈیز، ایران اور عراق کو بھی مکمل آزادی مل جانی چاہیے۔ اس بات کو صاف طور پر سمجھ لیا جانا چاہیے کہ ان ممالک میں سے ایسے (ملک)، جو اس وقت جاپان کے قبضے میں ہیں، انھیں بعد کو کسی دوسری نو آبادیاتی طاقت کے اقتدار یا کنٹرول میں ہرگز نہیں دیا جائے گا۔

جب کہ اے۔ آئی۔ سی۔ سی کو اولاً لازمی طور پر، خطرے کی اس گھڑی میں ہندستان کی آزادی اور دفاع کی فکر کرنی چاہیے، کمیٹی کا خیال ہے کہ آئندہ امن، تحفظ اور دنیا کی

منظم ترقی آزاد اقوام کے ایک عالمی وفاق کی متقاضی ہے، اور جدید ہندستان کے مسئلے کسی بھی دوسری سطح پر حل نہیں کیے جاسکتے۔ اس طرح کا عالمی وفاق اپنی ممبر قوموں کی آزادی ایک قوم کے ہاتھوں دوسرے کے استحصال اور اس کے خلاف جارحیت کی روک تھام، قومی اقلیتوں کی حفاظت، تمام پسماندہ علاقوں اور لوگوں کی ترقی، اور ساری دنیا کے وسائل کو سب کے مشترکہ مفاد کی خاطر یکجا کرنے کا ضامن ہوگا۔ اس طرح کے عالمی وفاق کے قیام پر، تمام ملکوں میں اسلحہ سازی قابلِ عمل ہوجائے گی، قومی افواج، بحری اور فضائی افواج کی ضرورت باقی نہیں رہے گی، اور ایک عالمی وفاقی دفاعی فوج امنِ عالم کو قائم رکھے گی اور جارحیت کا سدِباب کرے گی۔

ایک آزاد ہندستان بخوشی اس نوع کی کسی عالمی وفاق میں شامل ہوجائے گا اور برابری کی سطح پر، دوسرے ملکوں کے ساتھ، بین الاقوامی مسئلوں کو حل کرنے کے لیے معاونت کرے گا۔

اس نوع کے وفاق کو ایسی تمام قوموں کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھنے چاہئیں جو اس کے بنیادی اصولوں سے متفق ہوں۔ بہر نوع، جنگ کے پیشِ نظر اس وفاق کو ابتداءً ناگزیر طور پر اقوام متحدہ تک محدود رہنا چاہیے۔ اس طرح کا جو قدم ابھی اٹھایا جائے گا، وہ جنگ پر، محوری ممالک کے عوام پر، اور آئندہ امن پر انتہائی زبردست اثر مرتب کرے گا۔

بہرحال، کمیٹی افسوس کے ساتھ یہ سمجھتی ہے کہ جنگ کے المناک اور بے پناہ سبقوں اور دنیا پر منڈلاتے ہوئے خطروں کے باوجود، گنتی کے چند ملکوں کی حکومتیں، ابھی بھی عالمی وفاق کے تئیں یہ ناگزیر قدم اُٹھانے پر آمادہ ہیں۔ برطانوی حکومت کے ردِ ہائے عمل اور بیرونی (ممالک کے) اخبارات کی گمراہ تنقید ہیں۔ اس بات کو واضح کر دیتی ہیں کہ ہندستان کی آزادی جیسے صریحی مطالبے کے خلاف بھی مزاحمت کی جاتی ہے گرچہ یہ مطالبہ بنیادی طور پر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ موجودہ خطرے کا مقابلہ کیا جاسکے اور ہندستان کو اپنا دفاع کرنے کے لائق بنایا جاسکے اور ضرورت کی اس گھڑی میں چین اور روس کی مدد کی جاسکے۔ کمیٹی کو اس کی فکر ہے کہ کسی بھی طریقے سے چین یا روس کے دفاع میں کوئی مشکل نہ پیدا ہو جن کی آزادی قیمتی ہے اور اس کی حفاظت لازماً کی جانی چاہیے یا یہ کہ اقوام متحدہ کی دفاعی استعداد میں کسی طرح کی کمی واقع ہو ——— مگر خطرہ ہندستان اور ان اقوام، دونوں کے لیے بڑھ رہا ہے، اور

اس منزل پر ایک غیر ملکی انتظامیہ کے تئیں بے عملی اور اطاعت شعاری نہ صرف یہ کہ ہندستان کو پست کر رہی ہے، اور جارحیت کا مقابلہ کرنے اور اپنا دفاع کرنے کی اس کی استعداد کو کم کر رہا ہے، یہ اس بڑھتے ہوئے خطرے کا کوئی جواب بھی نہیں ہے اور اقوام متحدہ کے عوام کی کوئی خدمت بھی نہیں ہے۔ اب تک برطانیہ عظمیٰ اور اقوام متحدہ سے ورکنگ کمیٹی کی مخلصانہ اپیل کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا ہے، اور بہت سے غیر ملکی حلقوں میں، جو تنقیدیں کی گئی ہیں ان سے ہندستان اور دنیا کی ضرورتوں کے تئیں ایک بے خبری، اور بعض اوقات تو ہندستان کی آزادی تک کے تئیں مخاصمت کا اظہار ہوتا ہے جو کہ تسلط قائم رکھنے اور نسلی برتری کے احساس میں مبتلا ذہنیت کا خاصّہ ہوتا ہے، اور جسے اپنی طاقت اور اپنے معاملے کے حق بجانب ہونے پر اعتماد رکھنے والی ایک مغرور قوم برداشت نہیں کر سکتی۔

اس آخری لمحے میں، آل انڈیا کانگریس کمیٹی ایک بار پھر، دنیا کی آزادی کے مفاد میں برطانیہ اور اقوام متحدہ سے اپنی اپیل کی تجدید کرتی ہے۔ لیکن کمیٹی یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ اب اس کا کوئی جواز نہیں رہ گیا ہے کہ قوم کو ایک سامراجی اور تحکم پسند حکومت کے خلاف اپنے عزم پر قائم رہنے سے روکا جائے جو اس پر مسلط ہے اور اسے اپنے مفاد اور انسانیت کے مفاد میں کام کرنے سے باز رکھتی ہے۔ چنانچہ یہ کمیٹی ہندستان کے آزادی اور خود مختاری کے لاینفک حق کو ثابت کرنے کے لیے وسیع ترین ممکنہ پیمانے پر عدم تشدد کی راہ اپناتے ہوئے ایک عوامی جدوجہد شروع کرنے کی منظوری دینے کا عزم رکھتی ہے، تاکہ اپنی گزشتہ بائیس برسوں کی پُرامن جدوجہد میں جمع کردہ، اہنسا کی طاقت تمام تر طاقت کو بروئے کار لا سکے۔ اس قسم کی جدوجہد کو ناگزیر طور پر گاندھی جی کی قیادت کے تابع ہونا چاہیے، اور کمیٹی اُن سے درخواست کرتی ہے کہ ہمیں جو قدم اٹھانے ہیں ان کے سلسلے میں، وہ قوم کی پیشوائی اور رہبری قبول فرمائیں۔

کمیٹی ہندستان کے عوام سے اپیل کرتی ہے کہ آنے والے خطرات اور صعوبتوں کا سامنا وہ حوصلے اور صبر کے ساتھ کریں، اور ہندستانی آزادی کے تربیت یافتہ سپاہیوں کی طرح اس کی ہدایات پر عمل کریں۔ انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عدم تشدد اس تحریک کی اساس ہے۔ ایک ایسا وقت آسکتا ہے جب ہدایات جاری کرنا ہدایات کو اپنے لوگوں تک پہنچانا

ممکن نہ رہ جائے، اور جب بھی کوئی کانگریس کمیٹی کام نہ کر سکے۔ جس وقت ایسا ہو، ہر مرد اور عورت کو جو اس تحریک میں شامل ہے، جاری کردہ عام ہدایات کے چہار گوشوں کے اندر رہتے ہوئے خود اپنے لیے کام کرتے رہنا چاہیے۔ ہر ہندستانی کو جو آزادی کی طلب رکھتا ہے اور اس کے لیے کوشاں ہے، آپ اپنا رہبر ہونا چاہیے، اور خود کو اس دشوار گزار راستے پر لگانا چاہیے جس میں سستانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، اور جو بالآخر ہندستان کی آزادی اور نجات (کی منزل) تک پہنچائے گا۔

اخیر میں، یہ کہ گرچہ اے۔ آئی۔ سی۔ سی نے آزاد ہندستان کے تحت آئندہ حکومت کے بارے میں اپنا نظریہ بیان کر دیا ہے، اے۔ آئی۔ سی۔ سی تمام متعلقین پر اس امر کو اچھی طرح واضح کر دینا چاہتی ہے کہ عوامی جدوجہد شروع کرنے سے، وہ کانگریس کے لیے اقتدار حاصل کرنے کی کوئی نیت نہیں رکھتی۔ اقتدار، جب بھی ملے گا، (صرف کانگریس کے لیے نہیں، بلکہ) ہندستان کے تمام باسیوں کی ملکیت ہوگا۔

ضمیمہ۔ ۵

برطانوی حکومت کا ۳ جون کا بیان

۱۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو ہز میجسٹی کی حکومت نے جون ۱۹۴۸ء تک برٹش انڈیا میں ہندستانی ہاتھوں کو اقتدار منتقل کرنے کے اپنے ارادے کا اعلان کیا۔ ہز میجسٹی کی حکومت کو یہ امید

تھی کہ بڑی پارٹیوں کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ ۱۶ر مئی ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن پلان کی تفصیلات کو طے کرنے کے عمل میں اپنا تعاون دیں۔ اور ہندستان کے لیے ایک ایسا آئین مرتب کریں جو جملہ متعلقین کے لیے قابلِ قبول ہو —— یہ امید پوری نہیں ہوئی ہے۔

۲۔ مدراس، بمبئی، یو۔پی۔ بہار، سی۔پی ان صوبوں کے نمائندوں کی اکثریت اور برار، آسام، اڑیسہ اور شمالی مغربی سرحدی صوبوں اور دہلی، اجمیر —— مرواڑہ اور کُرگ کے نمائندوں نے پہلے ہی ایک نیا آئین مرتب کرنے کے کام میں ترقی کر لی ہے۔ دوسری طرف، مسلم لیگ پارٹی جس میں بنگال، پنجاب اور سندھ کے نمائندوں کی اکثریت شامل ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ برطانوی بلوچستان کے نمائندے تھے، آئین ساز اسمبلی میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۳۔ ہز میجسٹی کی حکومت کی ہمیشہ سے یہ آرزو رہی ہے کہ اقتدار کی منتقلی خود ہندستانی عوام کی اپنی خواہشوں کے مطابق ہونی چاہیے۔ یہ مرحلہ بے حد آسان ہوگیا ہوتا اگر ہندستان کی سیاسی پارٹیوں کے درمیان مفاہمت ہوتی۔ اس طرح کی مفاہمت کی عدم موجودگی میں، ایک ایسا طریقہ وضع کرنے کا مقررہ کام، جس کے ذریعے ہندستانی عوام کی خواہشات کا تعین ہو سکے، ہز میجسٹی کی حکومت کے ذمے ہوگیا ہے۔ ہندستان میں سیاسی لیڈروں سے پورے صلاح مشورے کے بعد، ہز میجسٹی کی حکومت نے اس مقصد کے لیے حسب ذیل پلان اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہز میجسٹی کی حکومت یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ ہندستان

کے لیے قطعی نوعیت کا آئین وضع کرنے کی کوشش کا کوئی ارادہ وہ نہیں رکھتی؛ یہ معاملہ خود ہندستانیوں کا اپنا ہے، نہ ہی اس پلان میں ایسی کوئی بات ہے جو ایک متحدہ ہندستان کے (قیام کے) لیے فرقوں کے مابین مذاکرات میں مانع ہو۔

۴۔ ہز میجسٹی کی حکومت کا یہ منشا نہیں ہے کہ موجودہ آئین ساز اسمبلی کے کام میں وہ مداخلت کرے۔ اب جب کہ بعض مخصوص صوبوں کے لیے، جن کے نام نیچے دے دیے گئے ہیں، انتظام کیا جا چکا ہے، ہز میجسٹی کی حکومت کو یہ بھروسا ہے کہ اس اعلان کے نتیجے میں اُن صوبوں کے مسلم لیگی نمائندے، جن کے نمائندوں کی اکثریت اس کام میں پہلے ہی سے شریک ہے، اب اس مشقت میں اپنا پورا حصّہ بٹائے گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ اس اسمبلی کے بنائے ہوئے کسی بھی آئین کا اطلاق ملک کے ان حصّوں پر نہیں ہو سکتا جو اسے قبول کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔ ہز میجسٹی کی حکومت کو اطمینان ہے کہ جس طریق کار کا خاکہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے، وہ ایسے علاقوں کے لوگوں کی خواہشات کی تعیین کے بہترین طریقے پر مشتمل ہے، اس مسئلے پر کہ کیا ان کے آئین کو:

(الف) موجودہ آئین ساز اسمبلی میں؛

یا

(ب) وہ علاقے جو موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کریں، ان کے نمائندوں پر مشتمل ایک نئی اور علاحدہ آئین ساز اسمبلی میں ——— وضع کیا جاتا ہے۔

جب یہ کام مکمل کر لیا جائے گا تب یہ ممکن ہو سکے گا کہ جیسے یا جنھیں

اقتدار منتقل کیا جاتا ہے، اس عہدے دار یا ان عہدے داروں کا فیصلہ کیا جائے۔

۵۔ اسی لیے، بنگال اور پنجاب کے صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں (یورپین ممبروں کو الگ کر کے)، ہر ایک سے یہ کہا جائے گا وہ اپنے دو حصے کر لیں، ایک مسلم اکثریتی اضلاع کا نمائندہ ہوا اور دوسرا بقیہ صوبے کا۔ اضلاع کی آبادی کا تعین کرنے کے لیے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے اعداد کو مستند مانا جائے گا۔ ان دو صوبوں کے مسلم اکثریتی اضلاع کی وضاحت اس اعلانیے کے ضمیمے میں کر دی گئی ہے۔

۶۔ ہر قانون ساز اسمبلی کے دونوں حصوں کے ممبران کو، جن کا اجلاس الگ الگ ہوگا، اس رائے کے اظہار کا اختیار سونپا جائے گا کہ صوبے کا بٹوارہ ہونا چاہیے یا نہیں۔ اگر ان میں سے کسی بھی حصے کی قطعی اکثریت بٹوارے کے حق میں فیصلہ کرے گی تو بٹوارہ کر دیا جائے گا اور اس کے مطابق انتظام کیا جائے گا۔

۷۔ بٹوارے کے سوال کو طے کرنے سے قبل، مناسب یہ ہوگا کہ ہر حصے کے نمائندے پہلے سے ہی یہ جان لیں کہ اگر دونوں حصوں نے بعد میں متحد رہنے کا فیصلہ کیا تو مجموعی طور پر صوبہ کس آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوگا۔ اسی لیے، اگر کسی بھی قانون ساز اسمبلی کے ممبر یہ مطالبہ کریں گے تو (یورپین ممبروں کے علاوہ) قانون ساز اسمبلی کے تمام ممبروں کا ایک اجلاس ہوگا جس میں اس معاملے کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا کہ اگر دونوں حصے متحد رہنے کا فیصلہ کریں تو صوبہ مجموعی اعتبار سے کس آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوگا۔

۸ - اس صورت میں کہ بٹوارے کا فیصلہ ہو جائے تو قانون ساز اسمبلی کا ہر حصہ ان علاقوں کی طرف سے جس کا وہ نمائندہ ہے، یہ طے کرے گا کہ پیرا ۳ میں جو دو متبادل صورتیں تجویز کی گئی ہیں ان میں سے کس کو اختیار کرے۔

۹ - بٹوارے کے مسئلے پر فیصلے کے فوری مقصد کے تحت، بنگال اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلیوں کے ممبر، مسلم اکثریتی اضلاع (جیسا کہ ضمیمے میں دے دیا گیا ہے) اور غیر مسلم اکثریتی اضلاع کے مطابق دو حصوں میں بیٹھیں گے۔ یہ خالصتاً عارضی نوعیت کا ایک ابتدائی قدم ہے کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ ان صوبوں کے آخری بٹوارے کے مقصد سے حد بندیوں کے سوالات کی تفصیلی چھان بین ضروری ہوگی؛ اور جیسے ہی بٹوارے سے متعلق کوئی فیصلہ کر دیا جائے گا، گورنر جنرل کی جانب سے ان میں سے ہر ایک صوبے کے لیے ایک حد بندی کمیشن مقرر کیا جائے گا جس کی رکنیت اور (دوسرے) دریافت طلب مسائل متعلقہ لوگوں سے صلاح مشورے کے ذریعے طے کیے جائیں گے۔ اسے ہدایت دی جائے گی کہ پنجاب کے دونوں حصوں کی حد بندی کا تعین، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے متصل اکثریتی علاقوں کی تحقیق کی بنیاد پر کیا جائے۔ یہ ہدایت بھی دی جائے گی کہ دوسرے پہلوؤں کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ اسی طرح کی ہدایتیں بنگال حد بندی کمیشن کو دی جائیں گی۔ جب تک کہ حد بندی کمیشن کی رپورٹ پر عمل درآمد نہ ہو جائے، اس وقت تک ان عارضی حد بندیوں کو قبول کیا جاتا رہے گا جن کی جانب ضمیمے میں اشارہ موجود ہے۔

۱۰ - سندھ کی قانون ساز اسمبلی (یورپین ممبروں کو الگ کر کے)، ایک

خاص اجلاس میں (طریق کار کی) اُن متبادل صورتوں کے متعلق خود اپنا فیصلہ بھی کرے گی، جو اوپر پیرا ۸ میں بیان کی گئی ہیں۔

۱۱۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کی صورت حال استثنائی ہے۔ اس صوبے کے تین نمائندوں میں سے دو، پہلے سے ہی موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شامل ہیں۔ لیکن یہ واضح ہے کہ اپنے جغرافیائی وقوع اور دوسری مصلحتوں کے پیش نظر، اگر پورے پنجاب یا اس کے کسی حصے نے موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تو شمال مغربی سرحدی صوبے کو اپنی صورت حال پر نئے سرے سے غور کرنے کا ایک موقع فراہم کرنا ضروری ہو جائے گا۔ چنانچہ، اگر ایسی بات ہوئی تو شمال مغربی سرحدی صوبے کی موجودہ قانون ساز اسمبلی کا انتخاب کرنے والوں سے استصواب رائے کیا جائے گا کہ پیرا ۸ کی متبادل صورتوں میں سے وہ کس صورت کو اختیار کرنا چاہیں گے۔ یہ استصواب رائے گورنر جنرل کی سرپرستی میں اور صوبائی حکومت کے مشورے سے عمل میں آئے گا۔

۱۲۔ برٹش بلوچستان نے ایک رکن کا انتخاب کیا ہے، مگر اس نے موجودہ آئین ساز اسمبلی میں ابھی اپنی جگہ نہیں سنبھالی ہے۔ اس کی جغرافیائی صورت حال کے پیش نظر، اس صوبے کو بھی اپنی پوزیشن پر از سر نو غور کرنے، اور مندرجہ بالا پیراگراف ۸ میں بیان کردہ متبادل صورتوں میں سے کس صورت کو اختیار کیا جائے، اس کا انتخاب کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ ہز ایکسی لینسی گورنر جنرل اس امر کا جائزہ لے رہے ہیں کہ سب سے زیادہ مناسب طریقے سے یہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔

۱۳۔ اگرچہ آسام اپنی آبادی کے بیشتر حصے کے اعتبار سے ایک غیر مسلم

صوبہ ہے، مگر ضلع سلہٹ جو بنگال سے متصل ہے اس کی غالب بادی مسلمان ہے۔ ایک مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ اگر بنگال کا بٹوارہ ہو تو سلہٹ کو بنگال کے مسلم حصے میں شامل کر دیا جائے۔ چنانچہ اگر یہ فیصلہ کیا گیا کہ بنگال کو تقسیم کر دینا چاہیے تو گورنر جنرل کی سرپرستی میں اور آسام کی عارضی حکومت کے مشورے سے ضلع سلہٹ میں ایک استصواب رائے کیا جائے گا، یہ طے کرنے کے لیے ضلع سلہٹ کو صوبۂ آسام کے ایک حصے کے طور پر برقرار رہنا چاہیے یا مشرقی بنگال کے نئے صوبے میں ضم کر دیا جانا چاہیے، ایک حد بندی کمیشن جس کے دریافت طلب مسائل پنجاب اور بنگال کے مسائل سے مماثل ہوں گے، اس غرض سے قائم کیا جائے گا کہ ضلع سلہٹ کے مسلم اکثریتی علاقوں اور متصل اضلاع کے مسلم اکثریتی علاقوں کی حدیں مقرر کر دے، جسے پھر مشرقی بنگال کو منتقل کر دیا جائے گا۔ صوبۂ آسام کا باقی حصہ، بہر حال موجودہ آئین ساز اسمبلی کی کارروائیوں میں اپنی شمولیت کو برقرار رکھے گا۔

۱۴۔ اگر یہ طے کیا گیا کہ بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر دیا جائے، تو ضروری ہو گا کہ نئے انتخابات کرائے جائیں تاکہ یہ صوبے اپنے نمائندوں کو، ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کے کیبنٹ مشن پلان میں بیان کردہ اصول کے مطابق ہر دس لاکھ کی آبادی پر ایک کے حساب سے، منتخب کر سکیں۔ ایسا ہی انتخاب سلہٹ میں بھی کرانا ہو گا، اگر یہ فیصلہ ہوا کہ اس ضلع کو مشرقی بنگال کا حصہ ہونا چاہیے۔ ہر علاقے کو نمائندوں کی جو تعداد منتخب کرنے کا حق ہو گا اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

صوبہ	عام	مسلمان	سکھ	میزان
ضلع سلہٹ	۱	۲	صفر	۳

صوبہ	عام	مسلمان	سِکھ	میزان
مغربی بنگال	۱۵	۴	صفر	۱۹
مشرقی بنگال	۱۲	۲۹	صفر	۴۱
مغربی پنجاب	۳	۱۲	۲	۱۷
مشرقی پنجاب	۶	۴	۲	۱۲

۱۵۔ انھیں جو ہدایات دی جائیں گی اُس کے مطابق، مختلف علاقوں کے نمائندے یا تو موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شامل ہو جائیں گے یا نئی آئین ساز اسمبلی کی تشکیل کریں گے۔

۱۶۔ کوئی بھی بٹوارہ جس کا فیصلہ کیا جائے، اُس کے انتظامی نتائج پر جتنی جلدی ممکن ہو سکے مذاکرات شروع کرانے ہوں گے:

(الف) نمائندوں اور حسب ترتیب جانشیں عہدیداروں کے مابین، ان تمام امور کی بابت جو ابھی مرکزی حکومت کے زیرِ انتظام ہیں۔ بشمول دفاع، مالیات اور رسل و رسائل۔

(ب) مختلف جانشیں عہدیداروں اور ہز میجسٹی کی حکومت کے مابین، اقتدار کی منتقلی کے سبب پیدا ہونے والے معاملات کے بارے میں معاہدوں کی غرض سے۔

(ج) ان صوبوں کے سلسلے میں جن کا بٹوارہ ہو سکتا ہے، تمام صوبائی امور کے انتظام پر جیسے کہ اثاثے اور ذمے داریوں کی تقسیم، پولیس اور دیگر ملازمتیں، ہائی کورٹ، صوبائی ادارے وغیرہ۔

۱۷۔ ہندستان کی شمال مغربی سرحد کے قبیلوں سے سمجھوتوں کی بات چیت مناسب جانشین حکومت کرے گی۔

۱۸- ہز میجسٹی کی حکومت اس بات کو صاف کر دینا چاہتی ہے کہ وہ فیصلے جن کا اعلان اوپر کیا گیا صرف برٹش انڈیا سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ کہ ہندستانی ریاستوں کی طرف ان کی پالیسی جو کیبنٹ مشن کے ۱۲ رمئی ۱۹۴۶ء کے میمورنڈم میں دی ہوئی، بدلی نہیں ہے۔

۱۹- اس خیال سے کہ (موجودہ حکومت کے) جانشیں عہدیداروں کے پاس اتنا وقت ہو کہ وہ خود کو اقتدار قبول کرنے کے لیے تیار کر سکیں، یہ اہم ہوگا کہ متذکرہ بالا تمام کارروائیاں جتنی جلدی ہو سکے مکمل کر لینی چاہئیں۔

۲۰- بڑی سیاسی جماعتوں نے بار بار اپنی اس آرزومندی پر زور دیا ہے کہ ہندستان میں جس قدر جلد ممکن ہو سکے اقتدار کی منتقلی ہو جانی چاہیے۔ ہز میجسٹی کی حکومت اس آرزو کے تئیں پوری ہمدردی رکھتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ قیاساً جون ۱۹۴۸ء کی کسی تاریخ تک، یا اس سے بھی پہلے کی کسی تاریخ کو ایک آزاد ہندستانی حکومت یا حکومتیں قائم کر کے اقتدار منتقل کر دے۔ چنانچہ اس خواہش کو پورا کرنے کے سب سے زیادہ تیز رو، بلکہ واقعتاً واحد قابلِ عمل طریقے کے طور پر ہز میجسٹی کی حکومت موجودہ سیشن میں (ملکہ) اسی سال ڈومینین اسٹیٹس کی بنیاد پر، اس اعلانیے کے نتیجے کے طور پر کیے جانے والے فیصلوں کے مطابق۔ ایک یا دو جانشیں عہدیداروں کو اقتدار کی منتقلی کے لیے قوانین پیش کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔ یہ ہندستانی مجالس آئین ساز کے اس حق کے تئیں کہ وہ مناسب مدت میں اس کا فیصلہ کریں کہ ہندستان کا وہ حصہ جس کے بارے میں انھیں اختیار حاصل ہے، برطانوی دولت متحدہ میں شامل رہے یا نہیں، کوئی تعصب نہیں رکھتی۔

ہز ایکس لینسی گورنر جنرل، وقتاً فوقتاً ایسے مزید اعلانات بھی کرتے رہیں گے جو متذکرہ بالا انتظامات کو بروئے کار لانے کے طریق کار یا دستور

مسئلوں کے سلسلے میں ضروری ہوں۔

پنجاب اور بنگال کے مسلم اکثریتی اضلاع ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق حسب ذیل ہیں:

۱۔ پنجاب

لاہور ڈویژن ——— گوجرانوالہ، گورداس پور۔ لاہور، شیخوپورہ، سیالکوٹ۔
راولپنڈی ڈویژن ——— اٹک، گجرات، جہلم، میانوالی، راولپنڈی، شاہ پور۔
ملتان ڈویژن ——— ڈیرہ غازی خان، جھنگ، لائل پور، منٹگمری، ملتان۔ مظفر گڑھ۔

۲۔ بنگال

چٹاگانگ ڈویژن ——— چٹاگانگ۔ نواکھالی، ٹپیرہ۔
ڈھاکا ڈویژن ——— باقرگنج، ڈھاکا، فریدپور، میمن سنگھ۔
پریسی ڈنسی ڈویژن ——— جیسور، مرشد آباد، ندیا۔
راجشاہی ڈویژن ——— بوگرا، دیناج پور، مالدہ، پابنہ، راجشاہی، رنگ پور۔

اشاریہ

آزادئ ہند (انڈیا وِنس فریڈم) نے آخر کار خود اپنی آزادی جیت لی۔ اِس خود نوشت بیانیے کا مکمل متن، مُہر بند کر کے، نیشنل لائبریری، کلکتہ اور نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی میں تیس برس تک محصور رکھا گیا۔

۱۹۵۸ء میں "راوی" مولانا آزاد اور "راقم" ہمایوں کبیر نے اشاعت کے لیے ایک قدرے مختصر اور نظرِ ثانی شدہ مسودہ پیش کیا تھا، جس میں سے ایسے واقعات اور تاثرات جو بالخصوص ذاتی نوعیت کے تھے، الگ کر دیئے گئے تھے۔ اشاعت کے پہلے ہی سال میں اِس مسودے کے تین بڑے ایڈیشن نکلے اور اُس وقت سے یہ بارہا شائع کیا جا چکا ہے۔

اب ہمارے سامنے مکمل متن ہے جسے ایک عدالتی ہدایت کے ذریعے ستمبر ۱۹۸۸ء میں رہائی ملی۔ نہ صرف یہ کہ اصل عبارت کے تمام الفاظ اور فقرے جوں کے توں پیش کر دیئے گئے ہیں، بلکہ عبارت کا اصل لہجہ اور مزاج بھی پوری طرح بحال کر دیا گیا ہے۔ یہ متن اب اس امر کا انکشاف کرتا ہے کہ اب تک کے غیر شائع شدہ صفحات کے بارے میں بہت مدت سے جو قیل و قال جاری تھی، وہ پوری طرح حق بجانب تھی، جنہوں نے پرانا ایڈیشن پڑھ رکھا ہے، انہیں ایسے نکات کا اندازہ فوراً ہو جائے گا۔ جن کے باعث یہ بیانیہ سابقہ بیانیے سے مختلف ٹھہرتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ (۱۹۳۵ء-۱۹۴۸ء) اُس دور سے متعلق افراد اور واقعات کی بابت مولانا آزاد کی بے باکانہ اور کھری رایوں سے اتفاق نہ کریں مگر ہم ہندوستان کے ایک عظیم فرزند کی دیانتداری اور ہمت کو نئے سرے سے سراہنے پر مجبور ہوں گے۔

مکتبۂ جمال
تیسری منزل
حسن مارکیٹ، اُردو بازار
لاہور